رشید حسن خاں کے انٹرویوز

مرتب

ابراہیم افسر

RASHEED HASAN KHAN KE INTERVIEWS

Edited by

Ibraheem Afsar

Ward No-1, Mehpa Chauraha Nagar
Panchayt Siwal khas, Distt Meerut (U.P)250501
Mobile- 9897012528/8077319637
Email:ibraheem.siwal@gmail.com

Year of Edition: 2019
ISBN: 978-93-84271-28-2
(Deluxe Edition)
Price: 300/-

نام کتاب	:	رشید حسن خاں کے انٹرویوز
مرتب وناشر	:	ابراہیم افسر
سن اشاعت	:	۲۰۱۹ء
قیمت	:	۳۰۰/- روپے
صفحات	:	۲۲۵
تعداد	:	۵۰۰
مطبع	:	ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

New Bismah Kitab Ghar

Distributor:

Kitabi Duniya

1955, Gali Nawab Mirza, Mohalla Qabristan,
Opp. Anglo Arabic School, Turkman Gate, Delhi-110006 (INDIA)
M: 9313972589, 8826741174, 8929421423 Ph: 011-23288452
E-mail:kitabiduniya@rediffmail.com
kitabiduniya@gmail.com

انتساب

اُردو صحافت کے نام

فہرست

پیش لفظ

اُردو ادب میں رشید حسن خاں کی شناخت عموماً محقق کی ہے۔لیکن رشید حسن خاں نے تحقیق کے ساتھ ساتھ تدوین، تنقید، کو بھی اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنایا۔اُردو املا کی رمز شناسی کے علاوہ موصوف نے ہم عصر اُردو مصنفین اور اُردو اداروں سے شائع ہونے والی کتابوں پر اپنی بے باک اور دو ٹوک راے پیش کر ان کی اہمیت، افادیت و معنویت پر سوالیہ نشان قائم کیے۔ان کے تحقیقی و تنقیدی تبصروں کی بدولت اہم پروجیکٹوں کو بند کرنا پڑا یا ان میں اصلاح کی گنجایش پیدا کی گئیں۔رشید حسن خاں کے تبصروں نے ادبی دنیا میں جو بھونچال پیدا کیا اُس کی دھمک، گونج اور بازگشت آج تک سنائی دیتی ہے۔ان تبصروں میں رشید حسن خاں نے جو ادبی پہلو اور نکات نمایاں کیے ان کی معنویت سے کسی کو بھی انکار نہیں۔نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی ان تبصروں کو پڑھ کر نئی نسل ششدر رہ جاتی ہے۔دراصل رشید حسن خاں نے اُردو تبصرہ نگاری کی نئی تعریف اپنے تبصروں کے ذریعے قارئین تک بہم پہنچائی۔ان تبصروں میں رشید حسن خاں کی سخت جاہی اور وسعت مطالعہ کے دیدار ہوتے ہیں۔خاں صاحب کے ان تبصروں کو ہم ادبی تحقیق کے اعلا نمونے قرار دے سکتے ہیں۔موصوف کی نظر میں ادبی تحقیق مکر شاعرانہ کا دوسرا روپ تھی۔رشید حسن خاں نے اپنے تحقیقی مشاغل کے بارے میں وضاحت پیش کرتے ہوئے رسالہ اظہار، ممبئی میں لکھا:

> ''ادبی تحقیق اب میرا پسندیدہ ترین موضوع ہے۔میں اُس تنقید کا قطعاً قائل نہیں۔جس میں انشائیہ نگاری کا اندازہ ہوا اور وہ اسلوب ہو جو منافق کی سخن آرائی کا ہوتا ہے۔اس طرح میں اس تحقیق کو مکر شاعرانہ کا بدل سمجھتا ہوں جس میں صاف گوئی کے بجائے لیپنے پوتنے کا انداز ہو۔چوں کہ حالات نے اب بیش تر افراد کو دنیا داری کے پھیر میں مبتلا کر رکھا ہے۔اس لیے تحقیق کا یہ سادہ

اور صاف انداز اُن کو پسند نہیں آتا اور اس کے لیے ان حضرات نے منفی انداز نظر کی ایک اصطلاح وضع کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جھوٹ کو جھوٹ کہیں اور دوٹوک انداز میں رائے ظاہر کریں وہ تو منفی انداز والے ہوئے۔اور جو لوگ ادب کے نام پر تجارت کو اور جہالت کو فروغ دیں،وہ مثبت انداز نظر والے ہوئے۔آپ چور کو چور کہیں تو وہ بہت واویلا مچائے گا۔یہی حال ان تاجرانِ ادب کا ہے۔''

(رسالہ اظہار،شمارہ 5،بمبئی،پانچویں کتاب،ترتیب باقر مہدی،جنوری 1984،ص 22)

1939 میں آرڈیننس کلودنگ فیکٹری شاہ جہاں پور(عرف عام میں درزی خانہ) میں بہ حیثیت مزدور بھرتی ہونے کے بعد رشید حسن خاں کی بالواسطہ طور پر پڑھائی چھوٹ گئی تھی۔گھریلو مالی حالات کے بہتر نہ ہونے کے سبب انھیں کسی اسکول میں داخل نہ کرایا جا سکا۔درسِ نظامی کی تعلیم بھی نا مکمل ہی رہی۔علم کی اہمیت سے واقفیت کے سبب آرڈیننس کلودنگ فیکٹری میں لنچ کے دوران انھوں نے اپنے ذوقِ مطالعہ کو تقویت بخشی۔طلسم ہوشربا اور آب حیات جیسی کتابوں کو اپنے مطالعے میں شامل کیا۔ساتھ ہی نیاز فتح پوری کے رسالے 'نگار'' کی تحریریں پڑھ کر اپنے ادبی ذوق اور مطالعے میں گہرائی اور گیرائی پیدا کی۔دراصل رشید حسن خاں کے اندر نیاز فتح پوری کی تنقیدی تحریروں کے سبب ہی تنقیدی صلاحیت اور شعور پیدا ہوا۔اس بات کا اعتراف رشید حسن خاں نے اپنے کئی مضامین اور انٹرویوز میں بہ بانگ دُہل کیا۔رشید حسن خاں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز نقاد کے طور پر کیا۔شعرا کے کلام پر تنقید کرنا ان کا پسندیدہ شغل رہا ہے۔

آرڈیننس کلودنگ فیکٹری شاہ جہاں پور کی ملازمت سے نکالے جانے کے بعد رشید حسن خاں نے بریلی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ''ندرت'' میں بھی ملازمت کی۔دہلی یونی ورسٹی میں ملازمت ملنے سے قبل انھوں نے کئی معمولی معمولی ملازمتیں کیں۔شاہ جہاں پور کے مدرسہ فیض عام میں بھی انھوں نے فارسی،اُردو استاد کی حیثیت سے کام کیا۔اسی مدرسے میں کام کرتے ہوئے رشید حسن خاں نے کئی معرکے سر کیے۔ملک اور بیرون ملک کے ادبی رسائل اور جرائد میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے۔ادب کے سنجیدہ قارئین نے ان کی تحریروں کی جانب متوجہ ہونا شروع کیا۔رسالہ تحریک،نئی

دہلی میں فیض کی شاعری کے حوالے سے جب ان کا مضمون شائع ہوا تو ملک گیر پیمانے پر ان کے نام اور کام کی شہرت راتوں رات ہو گئی۔رسالہ تحریک کے بند ہونے تک اس میں خاں صاحب کے مضامین مسلسل شائع ہوتے رہے۔

رشید حسن خاں نے 1950 کے بعد لکھنے والوں میں اپنا نام جلی حرفوں میں لکھوایا۔ ہندوستان اور پاکستان کے ادبی رسائل میں ان کے مضامین کے شائع ہونے کا انتظار رہتا۔ان کی کھری، مدلل اور بے لاگ تحریروں کے سبب بہت سے اہل قلم ان سے خفا رہنے لگے۔ یہاں تک کہ انھیں کئی مرتبہ نظر انداز بھی کیا گیا۔لیکن رشید حسن خاں کی علمیت اور اہلیت کا اعتراف ان کے تمام مخالفین نے بھی کیا۔رسالہ نگار اگست 1952 کے شمارے میں حفیظ الرحمٰن واصف کے مضمون ''اُردو زبان کے مترادف الفاظ'' کے خلاف ان کا مضمون 'بہ عنوان 'اُردو کے مترادف الفاظ'' کے نام سے شائع ہوا۔اس مضمون میں رشید حسن خاں نے واصف صاحب کے مضمون پر اعتراض کیا تھا۔اس مضمون کے شائع ہونے کے 22 سال بعد جب رشید حسن خاں کی کتابیں ''اُردو املا'' اور ''زبان و قواعد'' منظر عام پر آئیں تو مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے ایک پوری کتاب ''ادبی بھول بھلیاں'' (1979) متذکرہ دونوں کتابوں کے رد عمل کے طور پر رقم کی۔ڈاکٹر ابو محمد سحر نے بھی رشید حسن خاں کی مذکورہ دونوں کتابوں کے ردِ عمل کے طور پر ''اُردو املا اور اس کی اصلاح'' اور ''زبان و لغت'' جیسی کئی کتابیں بھوپال سے شائع کیں۔

1950 اور 1959 کے درمیان رشید حسن خاں نے اُردو شاعری اور شاعروں کے مجموعوں پر خوب لکھا۔جن شاعروں پر خاں صاحب نے قلم اُٹھایا ان میں، فیض احمد فیضؔ، احمد ندیم قاسمی، جوشؔ ملیح آبادی، مجروحؔ سلطان پوری، اختر انصاری وغیرہ کے اسما قابلِ ذکر ہیں۔میں یہاں صرف رشید حسن خاں کے اُس زمانے کی بات کر رہا ہوں جو دہلی یونی ورسٹی میں ملازمت ملنے سے قبل کا ہے۔دہلی یونی ورسٹی میں ملازمت ملنے کے بعد رشید حسن خاں صحیح معنوں میں تعمیری کام میں مصروف ہوئے۔جس کا اعتراف اور احترام تمام اُردو دنیا آج تک کرتی ہے۔۔خاں صاحب کو شاہ جہاں پور کی شعری فضاؤں سے والہانہ شغف تھا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُس زمانے میں شاہ جہاں پور میں شعر و شاعری کا زیادہ غلغلہ تھا۔اس شاعرانہ رنگ کو رشید حسن خاں نے اپنی زندگی میں قبول کیا۔اسی وجہ سے ان کا پہلا مضمون بھی شاعری کی تنقید کے تعلق سے تھا۔شاعری ان کے خون میں رچی بسی تھی۔اس بات کا اندازہ اس سے

لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے شاہ جہاں پور کے مشہور شاعر عابدؔ شاہ جہاں پوری کے منتخب کلام کو جولائی 1953 میں، رسالہ الحمراء (لاہور) کے مدیر حامد علی خاں کو ایک نوٹ کے ساتھ ارسال کیا تھا۔ اس انتخابِ کلام سے میں صرف ایک غزل کے چند اشعار قارئین کی نذر کر رہا ہوں تا کہ آپ رشید حسن خاں کے ادبی ذوق کا اندازہ لگا سکیں:

مرسلہ رشید حسن خاں

شاہ جہاں پور

''ذیل میں دلؔ صاحب کے ایک مخلص شاگرد جناب عابد شاہ جہاں پوری کی تین غزلوں کا انتخاب درج ہے۔ اگر آپ ''الحمراء'' میں شامل کر سکیں تو بسم اللہ۔

رشید

1

چُپ ہوں اُٹھا کے پردہ در کُچھ نہ پوچھیے
ٹکرا گئی نظر سے نظر کچھ نہ پوچھیے

تنہائیوں کا لُطف کہاں راہِ عشق میں
ناصح بھی ہے شریکِ سفر کچھ نہ پوچھیے

دیر و حرم سے کوئی تسلی نہ ہو سکی
مجھ سے مرا مذاقِ نظر کچھ نہ پوچھیے

(رسالہ الحمراء، جولائی 1953، ص 25)

رشید حسن خاں نے شاعری کو تنہائی میں سننے اور گنگنانے کی چیز تسلیم کیا ہے۔ شید حسن خاں نے اخبارات و رسائل کے لیے کچھ انٹرویو بھی دیے تھے۔ ان انٹرویو میں رشید حسن خاں نے اپنی علمی، ادبی اور ابتدائی زندگی کے بارے میں صاف صاف بتایا کہ انھوں نے اپنی زندگی میں کئی ادبی کارنامے انجام دیے ہیں۔ موصوف نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز اور پہلے مضمون کی اشاعت کے متعلق ایک انٹرویو میں پوچھے گئے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

''بھئی یہ تو مجھے اچھی طرح یاد نہیں، لیکن یہ بات خوب یاد ہے کہ میرے لکھنے کا

آغاز شاعری کی تنقید سے ہوا تھا۔شاعری آج بھی مجھے پسند ہے اور تنہائی کے لمحوں میں میں شعری مجموعہ ضرور پڑھتا ہوں۔وہ میرا بہترین رفیق ہوتا ہے۔ مجھے اپنا ایک پرانا مضمون یاد آتا ہے۔جو غالباً 1950 میں نگار میں شائع ہوا تھا۔ مضمون کا عنوان تھا 'شبلی کی فارسی شاعری'۔اسی زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے یا بعد میں ایک مضمون احمد ندیم قاسمی کی قطعات نگاری پر میں نے لکھا تھا۔تو میرے لکھنے کا آغاز شاعری کی تنقید سے ہوا اور اس سے مجھے اپنے ذوق کی تربیت میں بہت مدد ملی۔''

(ہماری زبان انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، رشید حسن خاں نمبر،ص20، یکم تا28 ستمبر،2006)

رشید حسن خاں کا رجحان ابتدا ہی سے شاعری کی زبان و بیان کی جانب تھا۔''شبلی کا فارسی تغزل''،مضمون کے شائع ہونے سے پہلے اور بعد میں بھی رشید حسن خاں رسائل و جرائد میں شاعری کی زبان و بیان پر اپنا اظہار خیال پیش کر چکے تھے۔رسالہ الحمراء کا جولائی 1952 کے شمارے میں رشید حسن خاں نے غزلوں اور نظموں اسلوب و زبان پر اظہارِ خیال خط کی شکل میں پیش کیا۔مدیرِ رسالہ حامد علی خاں کے نام لکھے گئے اس خط میں اس بات کو واضح کیا گیا کہ موجودہ دور میں شاعر حضرات شاعری کی زبان اس کے بیان اور اسلوب کی جانب توجہ مبذول نہیں کر رہے ہیں۔رشید حسن خاں کے اس طویل خط کا شاعری سے متعلق ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں اور اندازہ کیجیے کہ خط لکھتے وقت رشید حسن خاں کی عمر محض 27 برس ہے۔لیکن خط کی سطور پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی 60 سال کا عمر رسیدہ اور تجربہ کار شخص پُر مغز اور عالمانہ باتیں تحریر کر رہا ہے:

''دوسری بات یہ ہے کہ آج کل نئے غزل گو شعرا، میں ایک عجیب رجحان بڑھ رہا ہے۔یہ حضرات غزل اور نظم میں اسلوب و زبان کے اعتبار سے کوئی فرق محسوس نہیں کرتے نتیجہ یہ ہے کہ ان کی غزلیں حسن تغزل اور شیرینی و گداز سے معرا ہوتی ہیں۔غزل کی زبان، نظم کی زبان سے بالکل علاحدہ ہوتی ہے لیکن یہاں ہر چیز ایک ہی میزان پر تولی جاتی ہے۔غزل بڑی کافر صنفِ سخن ہے اس میں اُس وقت تک نکھار پیدا نہیں ہوسکتا جب تک کہ دل خون نہ ہو جائے۔اس

شمارہ میں دوسری غزلوں کے علاوہ تاجور صامری کی غزل خاص طور پر محل نظر ہے۔انھوں نے اس کی ردیف ہی غیر متغزلانہ کہی ہے، پھر اور کس چیز کو کہا جائے۔''

(رسالہ الحمراء، لاہور، مدیر حامد علی خاں، جلد 5، جولائی 1953، ص 43)

جیسا کہ میں ماقبل عرض کر چکا ہوں کہ رشید حسن خاں نے ادبی رسائل و جرائد میں بھی کام کیا۔ دہلی یونی ورسٹی کے جریدے ''اُردوے معلیٰ'' میں ان کا نام مشاورتی کونسل میں شامل تھا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے ششماہی مجلّہ ''غالب نامہ'' میں موصوف قیام دہلی تک مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ غالب نامہ میں رشید حسن خاں نے نہ صرف لاتعداد کتابوں پر تبصرے کیے بل کہ غالب شناسی کے حوالے سے مضامین بھی سپردِ قلم کیے۔اس ادارے نے رشید حسن خاں کی خدمات کے عوض 1979 میں غالب ایوارڈ سے نوازا۔ ساتھ ہی ان کے نامکمل پروجیکٹ ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' کی تین جلدیں، (جلد اول 2017، جلد دوم 2018 اور جلد سوم 2019، بہ اشتراک انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی) شائع کی ہیں۔

رشید حسن خاں نے ادبی صحافت کے معیار و افتخار کو بلند کرنے کے کچھ تجاویز بھی قارئین کے سامنے رکھیں۔ یہ تجاویز اصل میں ان کے مضمون ''ادب اور صحافت'' میں موجود ہیں۔اس مضمون میں رشید حسن خاں نے ادب اور صحافت کے دبیز رشتے پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ان کی نظر میں ادب اور صحافت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ادبی تحریروں اور اخباری خبروں میں زمین اور آسمان جیسا فرق نمایاں ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں نے اخبار کے اداریے کو اخبار کی جان قرار دیا۔ صحافتی خبروں کے ضمن میں ان کا ماننا ہے کہ صحافی فساد سے متعلق ہر ایک واقعے کو تجارت کے زاویے سے جب کہ ادیب اسے معاشرے میں رونما ہونے اثرات اور تبدیلیوں کے طور پر دیکھتا ہے۔ حادثہ کن لوگوں کی زندگی کو متاثر کرتا ہے اور معاشرے پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ کون افسانہ نگار بہترین طریقے سے ادبی تحریروں کے ذریعے افسانے کے قالب میں ڈھال کر پیش کرتا ہے؟ ان تمام باتوں کا احاطہ رشید حسن خاں نے اس طرح کیا ہے:

''یہ مشہور بات ہے کہ صحافت اور ادب میں تضاد کی نسبت ہے۔ روزنامہ اخبار کا

پہلا صفحہ اگر ہمارے سامنے ہو تو اپنے آپ معلوم ہو جائے گا کہ اخباری خبروں میں اور ادبی تحریروں میں کیا فرق ہوتا ہے۔اخبار کا اڈیٹوریل بڑی اہم چیز ہوتا ہے، مگر یہ بھی مبنی ہوتا ہے کسی خاص خبر پر، اگر چہ اصل خبر کے مقابلے میں وہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ایک اخبار میں اگر اڈیٹوریل کے دو یا تین حصے ہیں یعنی دو یا تین عنوانوں کے تحت دو یا تین مختلف تحریریں ہیں، تو وہ سب بھی کسی نہ کسی خاص خبر ہی سے متعلق ہوں گی۔خبروں میں اور اُس نوٹ میں جو فرق ہوتا ہے اُس کو انداز پیش کش سے متعلق سمجھا جا سکتا ہے۔اس صورت میں مطلب یہ نکلے گا کہ سارا معاملہ 'کیسے لکھا گیا ہے' سے تعلق رکھتا ہے۔اس کے باوجود روزانہ اخبار کے شاید ہی کسی اڈیٹوریل کو ادبی تحریر کہتے ہوں، اور اس سے ظاہری طور پر یہی مطلب نکلتا ہے کہ ادبیت کے لیے صرف انداز پیش کش کا مختلف ہونا کافی نہیں، اصل بات کو بھی ادب کے دائرے سے متعلق ہونا چاہیے۔مگر یہاں ایک اور مشکل صورت حال سے ہم کو دو چار ہونا پڑتا ہے۔مثلاً اخبار میں کسی فساد سے متعلق ایک خبر چھپی، ایڈیٹر نے اُس پر ایک پُر زور اداریہ لکھا۔اس کے کچھ دنوں کے بعد اسی فساد پر مبنی ایک افسانہ چھپا اور اب معلوم ہوا کہ اس خبر اور اس اڈیٹوریل نوٹ کو اس افسانے سے کوئی نسبت ہی نہیں، جب کہ بنیاد ان تینوں کی ایک ہی ہے۔افسانہ تو ادب پارہ قرار پایا اور وہ دونوں تحریریں اخباری چیزیں بن کر رہ گئیں۔''

(اُردو صحافت اور امکانات، مرتب ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2006،ص 55)

رشید حسن خاں نے ادیب اور صحافی کے مابین فرق کو مثالوں سے واضح کیا۔انھوں نے اس ضمن میں 1912 میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے مسئلے پر ہونے والی گرما گرم بحثوں کو بہ طور مثال پیش کیا۔ان کا ماننا تھا کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے متعلق جو رپورٹیں مولانا ابوالکلام آزاد نے 25 اگست 1912 سے 12 اپریل 1913 تک ''الہلال'' میں ''تشنۂ شام کی نصف شب'' اور ''حدیث الغاشیہ'' کے عنوان سے شائع کیں، ان کی اہمیت سو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد

بھی مسلّم ہے۔لیکن اگر ہم اسی زمانے کے کسی اخبار کو دیکھیں جن میں علی گڑھ سے متعلق رپورٹیں شائع ہوئی ہیں تو معلوم ہوگا کہ آج ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔اس کے لیے رشید حسن خاں نے اسلوب اور رنگِ سخن،اندازِ فکر کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

رشید حسن خاں نے اُن ادیبوں پر بھی تنقید کی جنھوں نے ادیب ہوتے ہوئے صحافتی رنگ میں ڈوب کر افسانے اور غزلیں لکھیں۔دوسرے لفظوں میں ادیبوں نے ادب کو کاروبار بنایا۔ایسے تاجر ادیبوں نے جہاں ایک جانب ادب کو نقصان پہنچایا وہیں دوسری جانب انھوں نے صحافت کا بھی حق ادا نہیں کیا۔رشید حسن خاں نے کرشن چندر کی افسانہ نگاری اور ان کی صحافتی خدمات کی مثال قارئین کے سامنے پیش کی۔رشید حسن خاں کے نزدیک کرشن چندر نے شہرت کے بام عروج پر پہنچنے کے بعد اپنے افسانوں میں صحافیانہ رنگ پیش کیا۔اس کے برعکس خواجہ احمد نظامی کی صحافیانہ سوجھ بوجھ اور ان کی ادبی خدمات کے رشید حسن خاں معترف ہیں۔مولانا محمد علی جوہر کی ادبی اور صحافتی خدمات کے بھی وہ قائل تھے۔ادب اور صحافت کے اس امتزاج کو واضح کرتے ہوئے رشید حسن خاں یوں رقم طراز ہیں:

> ''اُردو میں صحافیانہ ادب کی کمی نہیں۔اس سرمایے کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب لوگ یا تو وہ تھے جو ادب کو صحافت کے انداز سے تجارت کا مال خیال کرتے تھے،یا وہ لوگ تھے جن کے یہاں یہ دونوں لہریں اٹھتی،پھیلتی تھیں،یوں کبھی ادبیت چمک جاتی تھی،کبھی صحافیانہ انداز غالب آجاتا تھا۔اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ بڑا ادیب اور سچّا ادیب وقتی اور ہنگامی مفاد کو مطمحِ نظر قرار نہیں دیتا۔اس سطحیت کو وہ اُن لوگوں کے لیے چھوڑ دیتا ہے جو خسارے کا سودا کرنے کے قائل نہیں ہوتے اور ہر قیمت پر اور ہر انداز سے دنیاوی کامیابی کو اصل چیز سمجھتے ہیں۔آخر میں یہ بات بھی کہنے کی ہے کہ''ادبی صحافت''اور''صحافیانہ ادب''میں جو فرق ہے،اسے ضرور رکھنا چاہیے۔اس لفظ یعنی''ادبی صحافت''کو اگر ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جائے تو پھر اس کا اطلاق ادبی یا نیم ادبی رسالوں پر بہتر طور پر ہوگا۔مگر یہ ایک الگ اور ایک مستقل موضوع ہے جو ایک مفصل مقالے کا طلب گار ہے،اسی لیے میں اس تحریر میں جس کا مقصد ادب اور

صحافت کے ربطِ باہم پر کچھ گفتگو کرنا ہے، ادبی رسائل یا یوں کہیے کہ ادبی صحافت کے متعلق کچھ کہنا چاہتا۔

(اُردو صحافت مسائل اور امکانات، مرتب، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2006، ص 61)

رشید حسن خاں نے اُردو اخبارات و رسائل کو جتنے بھی انٹرویو دیے اُن سب میں موصوف نے ان باتوں کا تذکرہ ضرور کیا جن کا واسطہ ان کی ادبی زندگی اور کارناموں سے تھا۔ انھوں نے اپنے پاکستانی دوروں کے دوران وہاں کے رسائل و اخبارات کے لیے خصوصی انٹرویو عالمی ادب کے بدلتے منظر نامے اور اُردو املا کی موجودہ صورت حال کے حوالے سے دیے۔ ان انٹرویوز میں رشید حسن خاں نے ادبی صحافیوں کے سوالات کے جواب تفصیل کے ساتھ دیے۔ رسالہ نقوش کے لیے رشید حسن خاں کا انٹرویو جب ریکارڈ کیا گیا تو اُس میں سب سے زیادہ سوال اُردو املا اور رسم الخط پر پوچھے گئے۔ اس انٹرویو میں جن لوگوں نے حصہ لیا اس میں اکرام چغتائی، عطاء الحق قاسمی، تحسین فراقی بیدار سرمدی، معین الرحمٰن، رفیع الدین ہاشمی، اور محمد طفیل جیسے مایہ ناز قلم کار اور ادیب شامل تھے۔ اس انٹرویو میں کُل 16 بار رشید حسن خاں مذکورہ بالا ادبی شخصیات سے مخاطب ہوئے۔ اکرام چغتائی نے اس انٹرویو میں سوالات کی ابتدا کرتے ہوئے رشید حسن خاں سے اُردو املا کے موضوع پر سوال پوچھا۔ اس سوال میں یہ بھی معلوم کیا گیا کہ اُردو املا پر انجمن ترقی اُردو نے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی تھی۔ اس کے بعد اُردو بیورو (دہلی) نے بھی ایک ایسی ہی کمیٹی بنائی۔ ان کمیٹیوں کی سفارشات کے بعد آپ نے ایک ضخیم کتاب ''اُردو املا'' تحریر کی۔ آخر اُردو املا کے موضوع پر لکھنے کے لیے آپ کے سامنے کیا محرکات تھے؟ اس سوال کے جواب میں رشید حسن خاں نے بڑے بے باک انداز میں اُردو املا اور اس سے وابستہ افراد کی سرگرمیوں اور کارکردگیوں پر جواب دیے۔ رشید حسن خاں نے اپنے جواب میں بتایا کہ موجودہ دور میں ایک ایک لفظ کی کئی کئی شکلیں کاتب حضرات کی مہربانی سے رائج ہیں۔ یہاں تک کہ اساتذہ کو بھی معلوم نہیں کہ کس لفظ کو کس طرح لکھا جائے۔ ان تمام باتوں کے مد نظر میں نے اُردو املا کی جانب توجہ مبذول کی۔ رشید حسن خاں نے مزید یہ بھی بتایا کہ انھوں نے اپنی جانب سے کوئی نیا کام نہیں کیا ہے بل کہ 1944 میں جو کمیٹی اُردو املا کے متعلق بنائی گئی تھیں، اُسی کی سفارشات پر میں نے عمل کیا ہے۔ رشید حسن خاں نے یہ بھی کہا کہ اُردو املا اور اُردو رسم الخط دونوں الگ

الگ ہیں۔ اکثر لوگ ان دونوں کو ایک ہی شے تسلیم کر لیتے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ ان کی کتاب اُردو املا کی روشنی میں افسانہ نگاروں اور شاعروں کے علاوہ اخبارات و رسائل میں اب وہی املا رائج ہے جس کی سفارش انھوں نے کی تھی۔ اُردو املا سے متعلق مزید تفصیلات کے لیے رشید حسن خاں کا جواب ملاحظہ کیجیے:

''اُردو کی صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک کوئی لغت جدید اصولوں کے مطابق مرتب نہیں ہوئی۔ اس بنا پر اُردو الفاظ کے معانی کا تعین تو ہوتا ہے۔ لیکن املا کا تعین نہیں ہوتا بالعموم ہماری کتابیں کاتب لکھتے ہیں۔ اگر ایک کتاب چار جلدوں میں ہے اور اسے چار کاتبوں نے لکھا ہے ممکن ہے کہ ایک لفظ کی ایک سے زیادہ املا کی شکلیں ان جلدوں میں پائی جائیں۔ انگریزی کی کوئی لغت اُٹھا لیں اس میں آپ کو ہجے کا تعین ملے گا۔ معانی کا تعین ملے گا اور استعمال کا تعین ملے گا۔ اس کے برعکس اُردو کی لغت دیکھیں تو اس میں استعمال کا تعین ہوگا، معانی کا تعین ملے گا۔ لیکن املا کا تعین نہیں ہوگا۔ کیوں کہ یہ کاتب پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے انجمن نے اس پر توجہ کی۔ کیوں کہ زبان کے لیے یہ بات باعث خوبی نہیں ہے کہ اس میں املا کے ضابطے تعین نہ ہوں۔ میرے خیال میں تھا کہ اُردو لغت مرتب کرتے وقت تو الفاظ کو کیسے لکھا جائے گا۔ اب دیکھئے کہ لغت میں لفظ درج ہوتے ہیں۔ حروف تہجی کی نسبت سے مثال کے طور پر میں ایک لفظ لیتا ہوں 'مہندی'۔ مہندی کو کچھ لوگ لکھتے ہیں (م ن ہ د ی)۔ کچھ لوگ لکھتے ہیں (م ہ ن د ی)... لغت میں یہ لفظ دوسری فصل میں آئے گا۔ جب تک آپ یہ طے نہیں کریں گے کہ اس لفظ کا معیاری املا کیا ہے؟ اس وقت تک لغت میں اس لفظ کے اندراج کی صحیح شکل متعین نہیں کی جا سکتی ہے۔

اس صورتِ حال نے مجھے متوجہ کیا کہ میں اس موضوع پر کچھ کام کروں۔ چناں چہ میں نے 1960 کے اواخر میں اس موضوع پر باقاعدہ طور پر

کام شروع کیا۔مرحوم ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اس زمانے میں زندہ تھے اور وہ واحد شخص تھے جو املا کے معاملے میں اپنی ساری عمر صرف کر چکے تھے۔ میں نے ان سے ہدایت اور رہنمائی کی درخواست کی تو انھوں نے بڑی خوشی سے ہاں کر دی۔ 1972 میں مسلسل 12 سال کی کوشش کے بعد میں اپنی کتاب ''اُردو اِملا'' کو مرتب کر سکا۔جس میں ان ساری چیزوں کو یکجا کر دیا گیا ہے جو اب تک لکھی گئیں تھیں۔ان میں بنیاد بنایا گیا ہے انجمن ترقی اُردو کی املا کمیٹی کے اس فیصلے کو جو 1944 میں کیا گیا تھا۔اس کتاب میں، میں نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اس موضوع پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اور وہ مستند قابل قبول اور معیاری ہے۔اسے یکجا کر دیا جائے اس میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ املا اور رسم خط دو الگ چیزیں ہیں۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم چیزوں کو گڈ مڈ کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ہم رسم خط میں اصلاح چاہتے ہیں۔ حالاں کہ رسم خط میں اصلاح نہیں ہوتی...اصلاح ہوتی ہے املا میں۔رسم خط نام ہے روش کا...املا نام ہے لفظوں میں حرف کے تعین کا۔اور اس کے لکھنے کے طریقے کا۔غرض اس سات سو صفحات کی کتاب میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اس میں سارے مسائل یکجا ہو جائیں۔ مجھے مسرت ہے کہ اس زمانے میں جب کہ زبان اور قواعد کی طرف توجہ کم ہے اس کتاب کی۔ بڑے اثرات ظاہر ہوں گے علاوہ اور اثرات کے... مجھے بہت تعجب ہوا کہ بمبئی سے دو افسانہ نگاروں کے مجموعے آئے۔ان دونوں مجموعوں کے سرورق پر لکھا ہے کہ اس کتاب کا املا رشید حسن خاں کی کتاب اُردو املا پر لکھا گیا ہے۔ہمارے یہاں جب کوئی شخص لکھنے بیٹھتا ہے تو اس وقت وہ سوچتا ہے کہ میں کیسے لکھوں۔یہ خیال اس سے پہلے نہیں آتا یعنی املا نے ہمارے یہاں موضوع کی اہمیت حاصل نہیں کی تھی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کو یہ اہمیت حاصل ہو جائے اور آدمی جب لکھنے بیٹھے تو اس کے ذہن میں ہو کہ اس لفظ کو کیسے لکھنا ہے۔''

اُردو املا، تنقید اور تحقیق کے متعلق ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے رشید حسن خاں سے ایک طویل انٹرویو 25 جنوری 1989 کو خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں لیا۔اس انٹرویو میں خاں صاحب نے تحقیق، تدوین اور اُردو املا کے اُن محرکات اور اسباب کی جانب زیادہ توجہ مبذول کی جن کی طرف ہمارا ذہن نہیں جاتا۔ باور رہے کہ ایک زمانے میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، رشید حسن خاں سے اُردو املا کے مسائل اور ان کا حل سے متعلق سوالات بہ ذریعہ خطوط معلوم کرتے تھے۔ جب تک رشید حسن خاں زندہ رہے تب تک ممتاز احمد خاں ان سے مستفیض ہوتے رہے۔ ممتاز احمد خاں نے رشید حسن خاں کو 40 سے زائد خطوط ارسال کیے جو''رشید حسن خاں کے خطوط'' جلد اول مرتب ڈاکٹر ٹی. آر. رینا میں شامل ہیں۔اس انٹرویو میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے قاضی عبدالودود اور امتیاز علی خاں عرشی جیسے بزرگ محققین کے بعد اُردو تحقیق کی سمت و رفتار کی حالتِ زار پر سوال دریافت کیے۔ جب ممتاز احمد خاں نے رشید حسن خاں سے یہ سوال معلوم کیا کہ آپ نے تحقیق کا کام کس کس میدان میں کیا ہے؟ یعنی شاعری کی تحقیق، تلفظ و املا اور محاورات کی تحقیق اور تحقیقی غلطیوں کی تحقیق وغیرہ۔اس سوال کے جواب میں رشید حسن خاں نے فرمایا کہ میری زیادہ تر توجہ کا مرکز ادبی تحقیق ہے۔ دراصل رشید حسن خاں تحقیق کو گم شدہ حقائق کی بازیافت کو ہی اصل تحقیق گردانتے ہیں۔اپنے جواب میں رشید حسن خاں نے سوال قائم کرتے ہوئے بتایا کہ ہماری دانش گاہوں میں جو تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں ان میں سے کتنے مقالے تحقیق کے زمرے میں آتے ہیں؟ کتنے طالب علم صحیح معنوں میں تحقیق کا حق ادا کر رہے ہیں۔ رشید حسن خاں زندہ لوگوں پر تحقیقی مقالے لکھنے کے سخت مخالف تھے۔ اس انٹرویو میں خاں صاحب نے ادبی تحقیق، املا اور تلفظ پر بہت ہی کارآمد باتیں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کو بتائیں۔ان تمام باتوں کی مزید وضاحت کے لیے موصوف کا جواب ملاحظہ کیجیے:

> ''میری توجہ زیادہ تر ادبی تحقیق پر رہی ہے۔ ادبی تحقیق ایک جامع لفظ ہے، اس میں سب کچھ شامل ہے، ادب کی ساری اصناف اور ان سے متعلق حقائق۔ جیسا کہ آپ معلوم ہے تحقیق دراصل گم شدہ حقیقتوں کی بازیافت کا دوسرا نام ہے، یعنی وہ حقیقتیں جو موجود تھیں لیکن اب ہم کو صحیح طور پر معلوم نہیں۔ان کو دوبارہ دریافت کرنا تاکہ علم میں صحیح طور پر اضافہ ہو سکے اور واقعات کو صحیح طور پر

ترتیب دیا جا سکے۔ تحقیق کا یہی مقصد ہوتا ہے۔ یہاں پر ضمنی طور پر میں ایک بات کہہ دوں، میں نے یہ بات پہلے بھی کئی بار کہی ہے اور لکھی ہے کہ زندہ لوگوں کو جو تحقیق کا موضوع بنایا جاتا ہے میں اس کو تحقیق کے لیے زہرِ قاتل سمجھتا ہوں اور اسے نہایت درجہ غیر تحقیقی کام قرار دیتا ہوں یا یہ کہ ایسے عنوانات جو تحقیق کے ذیل میں دراصل نہیں آتے ان کو اختیار کیا جاتا ہے مثلاً ''پریم چند کے ناولوں میں عورت کا کردار''، ''کرشن چندر کے ناولوں میں سماجی حقیقت نگاری'' ایسے کام کو ہم تحقیق کے ذیل میں نہیں لا سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اور ایسے سب موضوعات تعبیرات پر مبنی ہوتے ہیں۔ تحقیق حقائق کی بازیافت ہے۔ محقق حقائق کی تشکیل نہیں کرتا حقائق کا سراغ لگاتا ہے اس لیے کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ہمیں پوری طرح یا صحیح طور پر معلوم نہیں۔ چوں کہ میں عربی اور فارسی کا ذوق ساتھ لے کر اس میدان میں آیا تھا، ان زبانوں میں ان چیزوں پر بہت کم زور دیا جاتا ہے اس لیے مجھے اس کا خاص خیال رہتا تھا کہ جب کوئی لفظ میری زبان سے ادا ہو یا میرے قلم سے نکلے تو مجھ کو یہ بات معلوم ہو کہ اس لفظ کا تلفظ کیا ہے؟ اس کا املا کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ اور اس کا محلِ استعمال کیا ہے۔ تو مجھے یہ ذوق پیدا ہوا کہ یہ سب باتیں معلوم کروں اور اس میں چیزیں بڑھتی گئیں۔''

رشید حسن خاں زندہ لوگوں پر تحقیق کرنے کے قائل نہیں بل کہ اس امر کے سخت مخالف ہیں۔ اپنے مخالف رویے کی ایک وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ زندہ لوگوں پر تحقیق کرنے سے تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا اُلٹا تحقیق کا وقار اس کی عزت و آبرو مجروح ہوتی ہے۔ خاں صاحب کے نزدیک ایسی تحقیق، تحقیق نہیں بل کہ تحقیقی کاروبار ہے یعنی ''منجملہ سامانِ تجارت''۔ اس کاروبار میں ایسے اساتذہ مہارت رکھتے ہیں جن کے پاس تحقیق کے لیے وقت ہی نہیں۔ وہ اپنی آسانی کے لیے طلبہ کو زندہ لوگوں پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی صلاح دیتے ہیں۔ اس وجہ سے طلبہ زندہ لوگوں پر اپنی تن آسانی اور اُستاد کی خوشی کے لیے تحقیقی مقالہ تحریر کرتے ہیں۔ جب کہ تحقیق ایک صبر آزما کام ہے۔ رشید حسن خاں کا یہ بھی ماننا تھا کہ زندہ

لوگوں پر تحقیق کرنے سے سچ سامنے نہیں آتا۔بل کہ زندہ شخص اپنے بارے میں بڑھا چڑھا کر باتیں بتاتا ہے۔رشید حسن خاں نے اس پورے عمل کو''چور دروازہ'' قرار دیا۔ان تمام باتوں کا احاطہ رشید حسن خاں نے شبنم رومانی، مدیر رسالہ اقدار (کراچی) کو دیے گئے انٹرویو میں کیا۔اس انٹرویو میں شبنم رومانی نے تحقیق کے علاوہ شاعری اور تدوین پر بھی سوالات معلوم کیے۔رشید حسن خاں نے بڑے ہی خندہ پیشانی سے شبنم رومانی کے سوالات کا جواب دیا۔اس اہم گفتگو کے چند پیراگراف ملاحظہ کیجیے جن کا تعلق زندہ شخصیات پر تحقیق کرانے سے ہے:

''یہ سوال اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ یہ اصول تحقیق ہی کا نہیں، بل کہ تحقیق کی عزّت و آبرو کا بھی مسئلہ ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ پاکستان کی دانش گاہوں کے اس سلسلے میں ضابطے کیا ہیں اور وہاں احوال کیا ہے، لیکن یہ میں خوب جانتا ہوں کہ ہندوستان کی دانش گاہوں میں اس غیر تحقیقی کاروبار کی بڑی گرم بازاری ہے۔اس وقت جو ایک لہر چلی ہے آسان پسندی کی اور اُس کے تحت یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ وہ لوگ جو ابھی زندہ ہیں اُن کو موضوعِ تحقیق بنایا جائے۔آپ نے ایک ٹیپ ریکارڈر لیا، ایک سوال نامہ مرتب کیا، کچھ گفتگوئیں ٹیپ کر لیں، کچھ سوالوں کے جواب لکھوا لیے اور مقالہ تیار ہو گیا۔کئی لحاظ سے یہ نہایت درجہ غلط طریقۂ کار ہے۔اُس کی زندگی مکمل نہیں ہوئی، آدمی کے خیالات میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔سو آپ ایک ناتمام اور نامکمل زندگی کے متعلق جو کچھ کر رہے ہیں، چند روز کے بعد اس کی کیا حیثیت ہوگی؟''

رشید حسن خاں نے تحقیق کے اصول اور طریقۂ کار سے متعلق بھی اس گفتگو میں سوالات کے جواب دیے۔موصوف صاحب حیثیت اور صاحب اقتدار لوگوں پر تحقیق کرنے کے بھی مخالف تھے۔ان کی نظر میں ایسے لوگ تحقیق کا حق ادا نہیں کر پاتے۔اس ضمن میں ان کا ماننا تھا:

''اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں۔اُس میں سچ بولنا بہت مشکل ہے۔جو شخص زندہ ہے، وہ صاحبِ حیثیت اور صاحبِ اقتدار بھی ہے، یا کسی بھی حیثیت سے وہ شہرت رکھتا ہے، اُس کے متعلق آپ صحیح بات

معلوم کر سکیں۔ یا معلوم ہو جائے تو اس کو کہہ بھی سکیں یہ مشکل ہے۔ اگر تحقیق حقیقت کی بازیافت کا کام ہے جیسا کہ ہے، تو بازیافت کا عمل مکمل اُسی وقت ہوتا ہے جب آپ اُس کو پیش کریں، لیکن اگر آپ اظہار پر قادر نہیں، تو ساری بازیافت بے کار ہو جائے گی۔ ایک بات اور: ہم جب اصولِ تحقیق پڑھاتے ہیں تو اپنے طالب علم کو ایک یہ بات بھی بتاتے ہیں کہ عام طور پر آدمی سب سے زیادہ جھوٹ بولتا ہے اپنے متعلق یا اپنے خاندان کے متعلق۔ جن لوگوں نے ایسے بیانات دیے ہیں، اِسی لیے ہم اُنھیں بلقطبہ اور بجنسہٖ قبول نہیں کرتے۔ ہم تحقیق کرتے ہیں کہ جو کچھ کہا گیا ہے، صحیح بھی ہے کہ نہیں۔

اس سے زیادہ اندوہ ناک بات یہ ہے کہ جس طالبِ علم نے کسی زندہ شخص کو موضوعِ تحقیق بنایا ہے تو وہ ہمیشہ کے لیے آسان پسندی کا خوگر ہو جاتا ہے۔ وہ اس کا بھی اعلان کرتا ہے کہ وہ اصولِ تحقیق سے باخبر نہیں اور دوسرا اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی فخر کے ساتھ اپنی اس کاوش کو پیش نہیں کر سکتا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہوتا ہے کہ اکثر صورتوں میں اُس غریب کی محنت اور کاوش کا فائدہ پہنچتا ہے اُس کے نگراں کو، یا اُس صدر شعبہ کو جس نے وہ موضوع تجویز کیا ہے۔ اِس وقت اِس طرح کی تحقیق یعنی زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانا، یہ ایک طرح سے ''منجملہ سامانِ تجارت'' بن گیا ہے۔ طالب علم غریب کے حصے میں کچھ نہیں آتا، لیکن جس شخص کو موضوعِ تحقیق بنایا گیا ہے اس سے وہ نگراں یا استادِ اعلا مختلف سطحوں پر یا مختلف نسبتوں اور واسطوں سے دنیاوی فائدے اُٹھاتا ہے اور اُس کی اُس طالبِ علم کو تو خبر بھی نہیں ہوتی۔

پھر ایک بات اور: آپ ایک فہرست بنائیے ایسے لوگوں کی جن کو اب تک موضوعِ تحقیق بنایا گیا ہے اور ابھی تک زندہ ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اُن میں اکثریت ایسے ایسے بے تہہ اور کم رُتبہ لوگوں کی ہے جن کی کسی موضوع میں کوئی حیثیت نہیں۔ ہاں اِس دُنیا کے اقتدار کے لحاظ سے، یا شہرت کے لحاظ سے، یا

کسی اور نسبت سے، ان کی ایک حیثیت ہے۔تو یہ بات بجائے خود اس الزام کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔دیکھیے ہم تحقیق کی تعریف پڑھاتے ہیں کہ تحقیق حقائق کی بازیافت کا نام ہے۔اس کا مطلب کیا ہے؟اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک واقعہ جو کبھی ظہور پذیر ہوا تھا لیکن جس کے متعلق ہماری معلومات یا تو نہیں ہیں یا نا تمام اور ناقص ہیں، اُس کو صحیح صورت میں دریافت کیا جائے۔یہ بڑا صبر آزما کام ہے۔یہ کیسی عجیب صورتِ حال ہے کہ آپ چند آدمیوں سے یا کسی ایک ایک شخص سے چند بیانات لے کر سمجھیں کہ آپ نے حقائق کی باز یافت کا حق ادا کر دیا! یہ ہو نہیں سکتا۔ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں آپ اُن لوگوں کی ایک فہرست بنائیے جو بہت مشہور ہیں۔اقبالؔ سے لے کر ابوالکلام آزاد تک۔یہ بہت مشکل ہے کہ دونوں معاشروں میں آپ ایسے لوگوں کے متعلق صحیح حقائق کو بلا تکلف اور بلا تامّل پیش کر سکیں۔زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانا یہ ایک ایسا عمل ہے، جو ایک طرف تو طالب علم کو تحقیق کے حقیقی مقاصد سے بے خبر کر کے اُسے آسان پسندی کا خوگر بناتا ہے اور ہمیشہ کے لیے اُس کو اعلا نقطۂ نظر سے محروم کر دیتا ہے۔اس غیر تحقیقی عمل سے خود تحقیق بے آبرو ہو کر رہ جاتی ہے۔ایک بات اور:اب میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ بعض موجودہ اور سابق صدور شعبہ کی ذاتِ والا صفات پر اُن کے طالب علم بے طرح توجہ مبذول فرما رہے ہیں اور موصوف بہ خوشی اس کی اجازت دے دیتے ہیں کہ اُن کو موضوعِ تحقیق بنایا جائے۔ستم بالائے ستم یہ کہ بعض حضرات پر تو بیک وقت دو دو طالب علم جو معاشی طور پر پریشان حال ہے اور مستقبل میں کسی سہارے کا خواہاں ہے، وہ سمجھتا ہے کہ شاید اسی طرح پتھر پگھل جائے اور اُسے آیندہ اس توسط سے ملازمت مل سکے۔''

ڈاکٹر اطہر فاروقی نے رشید حسن خاں سے دو انٹرویو لیے۔پہلا انٹرویو 1988 میں اور دوسرا 1990 میں۔ڈاکٹر اطہر فاروقی کی شناسائی رشید حسن خاں سے زمانۂ طالب علمی سے رہی ہے۔پہلے انٹرویو میں خالص ادبی گفتگو ہے اور دوسرے انٹرویو میں سیاسی گفتگو۔دراصل رشید حسن خاں

ہندوستان میں ہونے والی ہرادبی اور سیاسی تبدیلی سے باخبر رہتے تھے۔اطہر فاروقی نے اپنے پہلے انٹرویو میں رشید حسن خاں سے اُردو کی بقا،اُردو تحقیق اور اُردواداروں میں رونما ہونے والی ادبی سرگرمیوں سے متعلق سوالات دریافت کیے۔اُردواداروں کی ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے رشید حسن خاں کا موقف یہ تھا کہ اُردواداروں میں 31 مارچ تک رقم خرچ کرنا ہوتی ہے۔اور یہ ادارے جہاں رقم خرچ ہونی چاہیے وہاں رقم خرچ نہیں کرتے۔اُردوادارے اب منصوبے اس اعتبار سے بناتے ہیں کہ حکومت کی جانب سے ملنے والی رقم کو کس طرح سے اِدھر اُدھر کیا جائے۔رشید حسن خاں کا یہ بھی کہنا تھا کہ جب کوئی اہم پروجیکٹ اُردواداروں کوملتا ہےتو وہ اس کام کی جانب تب توجہ دیتے ہیں جب اس کے مکمل ہونے کی تاریخ نزدیک آنے لگتی ہے۔ایسی صورت میں پروجیکٹ کس طرح مکمل ہوگا یعنی جلد بازی میں کیے گئے کاموں میں غلطیاں ہی غلطیاں ہوں گی۔

رشید حسن خاں اُن طلبہ سے بھی خفا ہیں جو پی ایچ ڈی کی ڈگری صرف ملازمت پانے کے لیے حاصل کرتے ہیں۔اس بارے میں ان کا کہنا ہے کہ تحقیق تاعمر چلنے والا عمل ہے۔جو طلبہ صرف نوکری کے لیے تحقیق کے میدان میں آتے ہیں وہ اپنے اصل مقصد سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ایسے تمام افراد جن کے نزدیک تحقیق سہل پسندی کا نمونہ ہوتی ہے وہ تحقیق کے حقیقی معنوں سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ایسے لوگوں کے لیے رشید حسن خاں کا مشورہ ہے کہ وہ تحقیق کے وقار کو مجروح نہ کریں۔اسی ضمن میں رشید حسن خاں کا یہ بھی کہنا ہے کہ جو شخص محقق نہیں وہ مدون بھی نہیں۔کیوں کہ تدوین، تحقیق سے آگے کی چیز ہے۔رشید حسن خاں کے مطابق جو لوگ مشرقی علوم بالخصوص فارسی زبان سے نابلد ہیں وہ تدوین کا حق ادا نہیں کر سکتے۔اُردو ادب کا قیمتی سرمایہ فارسی زبان میں ہی ہے۔ڈاکٹر اطہر فاروقی نے جب رشید حسن خاں سے یہ معلوم کیا کہ ہماری دانش گاہوں میں پی ایچ ڈی کے موجودہ نظام نے تنقید اور تخلیق کو خلط ملط کر دیا ہے۔خود آپ سے یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ تنقید اور تحقیق کے دائرے کہاں کہاں ملتے ہیں؟ تو موصوف نے تحقیق اور تنقید کے باہمی رشتے پر بڑے ہی طمطراق سے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

''تنقید اور تحقیق کے رشتوں کے خلطِ مبحث کی وجہ سے اُردو کے طالب علموں کے ذہنوں میں بڑا خلفسار ہے۔تحقیق کے تمام موضوع الگ الگ ہیں یعنی تحقیق،تنقید اور تدوین۔تحقیق نام ہے سچائیوں کی تلاش کا،حقائق کی بازیافت کا

اور تنقید ادبی شہ پارے کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے۔یہ بالکل دوسری چیز ہے اور تدوین جسے اڈیٹنگ کہتے ہیں کسی پُرانے متن کو اصول اور آداب کے ساتھ مرتب کرنا۔یہ تو سب الگ الگ چیزیں ہیں۔ہمارے یہاں جو زندگی کے دیگر شعبوں میں غلط مبحث ہے وہی یہاں بھی ہے۔تحقیق لفظ استعمال کر کے ہم کبھی تدوین مراد لیتے ہیں اور کبھی اس سے تنقید مراد لیتے ہیں۔یہ بات بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ اب ہمارے یہاں جتنے بھی موضوعات دانش گاہوں میں ایم فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے مقالوں کے لیے اختیار کیا گیا کہ ''کرشن چندر کے افسانوں میں سماجی حالات'' تو اس موضوع کا تحقیق سے کچھ تعلق نہیں۔ایک اور بات یاد رکھئے کہ تنقید میں اختلاف رائے ہمیشہ رہے گا کیوں کہ تنقید تعبیرات کا نتیجہ ہوتی ہے جس میں نقاد کی ذاتی پسند نا پسند اور اس کی مزاجی کیفیات بڑا اہم رول ادا کرتی ہیں۔ایک مصنف کی ایک کتاب سے ایک نقاد جو نتیجہ اُخذ کرتا ہے ضروری نہیں کہ دوسرا بھی وہی نتیجہ اُخذ کرے۔ایک افسانہ ایک نقاد کی نظر میں بہت اچھا ہے مگر وہی دوسرے کی نظر میں بہت معمولی ہے۔لیکن تحقیق میں یہ اختلاف ممکن ہی نہیں ہے کیوں کہ اس میں صرف حقائق ہوتے ہیں۔مرزا غالب کس تاریخ کس سن میں پیدا ہوئے وہ یا تو غلط ہوگا یا صحیح،اس میں تعبیر کی گنجایش ہیں۔یوں تحقیق تو حقائق سے بحث کرتی ہے،تنقید صرف تعبیرات پر مبنی ہوتی ہے۔یہ بات ضرور یاد رکھیے کہ تنقید کو تحقیق کی ضرورت ہے کیوں کہ اگر تحقیق سارے حقائق کا پہلے سے تعین نہیں کردے گی تو تنقید اپنے کام کو انجام دے نہیں سکتی اور اگر اس کے بغیر انجام دے گی تو بڑے مغالطے پھیلیں گے۔مرحوم مجنوں گورکھپوری نے اس شعر کی روشنی میں میرؔ پر ایک مضمون لکھا تھا:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اور اس شعر کے حوالے سے میرؔ کے ذہن کا تجزیہ کیا گیا تھا،جب بتایا گیا کہ یہ

میرؔ کا شعر ہی نہیں ہے بل کہ ایک دوسرے شاعر کا ہے تو تجزیے کی ساری عبارت زمیں بوس ہوگئی۔ تو ہمارے یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ حقائق کا تعین کیے بغیر ہماری تنقید ہوا میں گرہ لگاتی ہے۔ تحقیق پہلے حقائق کا تعین کرے گی اور تنقید حقائق کی ان بنیاد پر نتیجہ نکالے گی۔تنقید، تحقیق کی ہر حال میں محتاج ہے، جب کہ تحقیق تنقید کی نہیں ہے۔ مثلاً آپ یہ کہیں کہ قلی قطب شاہ کے کلام کا جائزہ لیں، اس کے شعری محاسن کا تعین کریں، اس کے یہاں جو اجزا پائے جاتے ہیں: مثلاً رسموں کا بیان اور روایتوں کا بیان اور موسموں کا بیان اور جتنی چیزیں ہیں یہ سب تنقیدی حصہ ہیں، تحقیق سے اسے کوئی واسطہ نہیں تو یہ غلط ہے۔ یہ تعین تو تحقیق ہی کرے گی کہ وہ تمام چیزیں قلی قطب شاہ کی ہیں بھی کہ نہیں۔ ہمارے یہاں اُستاد اور طالب علم دونوں کو نہیں معلوم ہوتا کہ تنقید اور تحقیق کے دائرے کہاں ملتے ہیں اور کہاں سے الگ ہو جاتے ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ادب کے طالب علموں کے ذہن میں یہ واضح ہو کہ تحقیق ایک الگ چیز ہے، تنقید بالکل دوسری اور تدوین یعنی Editing یہ بالکل مختلف فن ہے۔''

ڈاکٹر اطہر فاروقی کو دیے گئے دوسرے انٹرویو (1990) میں رشید حسن خاں نے ملک کے سیاسی اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر اظہارِ خیال پیش کیا ہے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی کا ایک سبب ان کے نزدیک تعلیم کے میدان سے مسلمانوں کا غائب ہو جانا ہے۔ اس کا ذمہ دار انھوں نے حکوت کو بھی مانا ہے۔

ڈاکٹر صاحب علی (اُستاد، شعبۂ اُردو ممبئ یونی ورسٹی) نے رشید حسن خاں کا ایک انٹرویو ممبئ میں 1998 کو لیا۔ یہ انٹرویو روز نامہ انقلاب، ممبئ کے شمارے میں شائع ہوا۔ دراصل رشید حسن خاں اپنی بیماری کا علاج کرانے کے واسطے ممبئ جاتے تھے۔ ممبئ میں ان کی رہایش اپنے ادب نواز دوستوں کے گھر ہوتی تھی بالخصوص پروفیسر عبدالستار دلوی کے یہاں وہ زیادہ دنوں تک ٹھہرتے تھے۔ دہلی یونی ورسٹی سے ریٹائر منٹ کے بعد اور اس سے قبل خاں صاحب اکثر ممبئ آتے جاتے رہے۔ ممبئ یونی ورسٹی ہی میں انھوں نے فروری مارچ 1992 میں بہ حیثیت وزیٹنگ فیلو کام کیا۔ اس کے علاوہ خاں صاحب نے اصول تحقیق پر شعبہ اُردو ممبئ یونی ورسٹی میں 24 تا 28 فروری 1986 میں پانچ لیکچر دیے۔ 1995 میں

مشرقی شعریات پر 3 لیکچر، 1995 میں ہی کلاسکی ادب کی تفہیم پر 3 لیکچر دیے۔اس کے علاوہ موصوف دکنی ادب کے سمینار پر بھی مقالہ پیش کیا اور انٹرنیشنل املا سمینار میں بھی ان کی شرکت رہی۔یعنی رشید حسن خاں کا ممبئی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے رشتہ بہت خاص رہا۔

ڈاکٹر صاحب علی نے اس انٹرویو میں رشید حسن خاں سے اُردو زبان کے فروغ اور اس کے سمٹتے ہوئے دائرے کے بارے میں کافی سوال کیے۔جب ڈاکٹر صاحب علی نے رشید حسن خاں سے اُردو ادب کے معیار کے پست ہونے کے بارے میں سوال کیا تو خاں صاحب نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ مجموعی طور پر ایسا کہنا مشکل ہے۔کچھ اچھی چیزیں بھی سامنے آرہی ہیں۔ایک دوسرے سوال میں ڈاکٹر صاحب علی نے معلوم کیا کہ اُردو اخبارات ادب کے فروغ میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟ تو اس بارے میں رشید حسن خاں کا کہنا تھا کہ اُردو زبان و ادب کے فروغ میں اُردو اخبارات اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔کیوں کہ اخبارات بالخصوص اُردو اخبار، اُردو زبان کے محافظ ہیں۔خاں صاحب نے اس انٹرویو میں اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ اُردو کے پُرانے مراکز میں اُردو کا دائرہ سمٹ رہا ہے اور اس زبان کے نئے مراکز اُبھر کر سامنے آرہے ہیں۔خاں صاحب کا یہ بھی ماننا تھا کہ موجودہ زمانے میں ہماری یونی ورسٹیوں کو ایسے ٹیکنکل کورسیز اور ڈپلومہ شروع کرنا چاہئیں جو اُردو زبان و ادب کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کریں۔اس گفتگو میں خاں صاحب نے والدین کو اُردو زبان کے تئیں سنجیدہ رویہ اپنانے پر زور دیا تا کہ نئی نسل اُردو رسم الخط بہ خوبی واقف ہو جائے۔ان کے نزدیک رسم الخط کسی بھی زبان کی شناخت ہوتی ہے۔اگر شناخت یا پہچان ختم ہوگئی تو زبان کا وجود خود بہ خود ختم ہو جائے گا۔اس انٹرویو کے آخری سوال میں ڈاکٹر صاحب علی نے خاں صاحب سے انھیں ملنے والے یو پی اُردو اکادمی کے سب سے بڑے اعزاز ''مولانا ابوالکلام آزاد انعام'' کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے برجستہ یہ کہا کہ میں نے یہ انعام صرف انعام سمجھ کر قبول نہیں کیا بل کہ اس کے ساتھ ملنے والی خطیر رقم کو لینے کے لیے قبول کیا ہے۔انعام کے بارے میں خاں صاحب نے مزید کہا کہ میرا کسی بھی گروپ سے کوئی رشتہ نہیں ہے پھر مجھے اکادمی نے اس لائق سمجھا میں اکادمی کا شکر گزار ہوں۔اس انٹرویو کا آخری جواب ملاحظہ کیجیے جس میں رشید حسن خاں نے مولانا ابوالکلام آزاد انعام 1998 (یو پی اُردو اکادمی، لکھنؤ) کی روداد بڑے ہی دل چسپ انداز میں بیان کی ہے:

''دیکھیے صاحب! میں نے اس ایوارڈ کو کوئی اعزاز سمجھ کر قبول نہیں کیا۔ یہ سمجھ کر قبول کیا کہ اچھی رقم ملے گی جو میرے کام آئے گی۔ پیسوں کی ضرورت سب کو ہوتی ہے مجھے بھی ہے۔ میرے ایک دوست نے کہا کہ اچھا تمھیں انعام ملا ہے جو تم سے پہلے فلاں صاحب کو مل چکا ہے۔ میں نے کہا، ہاں بھئی! وہی انعام ملا ہے لیکن میں نے اسے اعزاز سمجھ کر نہیں قبول کیا ہے بل کہ یہ سمجھ کر قبول کیا ہے کہ اس کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کا نام وابستہ ہے جو دانش ور تھے اور ادیب تھے اور یہ بھی کہ اس کے ساتھ ایک بڑی رقم ہے۔ صرف اعزاز کا معاملہ ہوتا تب مجھ پر آپ کے طنز کا کوئی اثر ہوتا۔ البتہ مجھے اس پر تعجب ہوا تھا کہ میرا نام کیسے آ گیا۔ میں تو کسی گروپ میں شامل نہیں public relation کا آدمی بھی نہیں ہوں۔ تعلقات بیش تر لوگوں سے خراب ہیں۔ جن سے تعلقات خراب نہیں ہیں خوش وہ بھی نہیں رہتے۔ اس کے باوجود میرے نام پر غور کیا گیا اس کے لیے میں ایوارڈ کمیٹی کے سبھی ممبروں کا شکر گزار ہوں۔''

(روزنامہ 'انقلاب'، بمبئی اڈیشن، 13 اکتوبر 1998)

عارف ہندی اور جاوید انور نے رشید حسن خاں سے ایک انٹرویو ان کے دولت کدے (شاہ جہاں پور) پر 27 نومبر 2004 بروز اتوار لیا۔ اس انٹرویو میں تقریباً ستائیس سوال معلوم کیے گئے۔ گفتگو کا آغاز خاں صاحب کے تبصرے علی گڑھ تاریخ ادب اُردو سے کیا گیا جسے انھوں نے 1963 میں رسالہ تحریک کے لیے تحریر کیا تھا۔ اس تبصرے کے منظرِ عام پر آنے سے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کو بازار سے تاریخ ادب اُردو کی تمام کاپیاں واپس منگوالی گئی تھیں۔ رشید حسن خاں نے اس گفتگو میں یہ بھی بتایا کہ اُردو تحقیق کا باضابطہ آغاز حافظ محمود خاں شیرانی کے تحقیقی مضامین 1920 سے مانا جاتا ہے۔ شیرانی صاحب کے بعد امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود نے تحقیق کے معیار کو بلند کیا۔ ان ادبی بزرگوں کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد اُردو تحقیق کی رفتار اور وقار میں کمی آئی ہے۔ دورِ حاضر میں ان تحقیقی بزرگوں کے پائے کا کوئی دوسرا شخص دور دور تک نظر نہیں آتا۔ جب رشید حسن خاں سے یہ سوال پوچھا گیا کہ اچھے محقق کو کس قسم کی زبان استعمال کرنا چاہیے؟ قاضی صاحب بلاشبہ بڑے محقق ہیں لیکن

انھوں نے جو زبان استعمال کی ہے اُسے عام طور پر پسند نہیں کیا جاتا؟ اس سوال کے جواب میں رشید حسن خاں نے کہا کہ قاضی صاحب کے یہاں لفظی کفایت شعاری نہیں ہے۔ اس لیے قارئین ان کی تحریروں کو پڑھتے وقت اُلجھ جاتے ہیں۔ قاضی عبدالودود کی بہ نسبت رشید حسن خاں مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی زبان کو فصیح مانتے ہیں۔ یہاں تک کہ کلیم الدین احمد کی تنقیدی زبان کے بھی خاں صاحب مداح ہیں۔ ان تمام باتوں کو رشید حسن خاں نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا:

''دیکھیے قاضی صاحب کے یہاں لفظی کفایت شعاری بہت زیادہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سارے لوگ انھیں پڑھتے وقت اُلجھتے ہیں۔ وہ جس طرح کی علامتیں استعمال کرتے ہیں، وہ بھی اُلجھنوں میں ڈالتی ہیں کیوں کہ قاضی صاحب ایک صفحے میں جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ عام طور پر لوگ بیس صفحات میں کہتے ہیں۔ میں قاضی صاحب کا بہت احترام کرتا ہوں اور اُنھیں اپنا معنوی اُستاد بھی تصور کرتا ہوں۔ میں نے اخذ نتائج کا ہُنر تو قاضی صاحب سے ہی سیکھا۔ تحقیق کا طریقۂ کار کیا ہونا چاہیے یہ بات بھی میں نے قاضی صاحب سے ہی سیکھی۔ اُن کی گفتگو سے، اُن کی تحریروں سے، میں نے بڑے استفادے کیے۔ ماخذ کو کیسے دیکھا جائے، حقائق کو کیسے سمجھا جائے، ان سب سے بڑھ کر یہ کہ سچ بولنے پر کتنا اصرار کیا جائے۔ یہ سب میں نے اُنہی سے سیکھا، لیکن قاضی صاحب کا جو اسلوب ہے، جو اندازِ بیان ہے، اس کو میں نے اختیار نہیں کیا۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ میرے بس کی بات نہیں تھی، اتنا علم اگر میرے پاس بھی ہوتا تو شاید میں بھی استعمال کرتا۔ دوسری بات یہ کہ ایمان داری سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ قاضی صاحب کا جو اندازِ تحریر رہا ہے، وہ اُلجھن میں بہت مبتلا کرتا ہے۔ اُن کے اندازِ تحقیق نے بنیادی حیثیت سے بہت شہرت پائی۔ ان کی وجہ سے تحقیق بہت مشہور ہوئی۔ ہم سب اس کو مانتے ہیں۔ لیکن اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ان کے اندازِ نگارش سے تحقیقی انداز نگارش نے شہرت نہیں پائی۔ (تحقیق) جیسا کہ تنقید کا مسئلہ ہے کہ تنقید میں ایک تو مرصع زبان

ہے۔ جو عام طور پر لکھی جاتی ہے۔ ایک تنقید کی اپنی زبان ہے، صفات سے خالی صاف اور دوٹوک، براہ راست۔ جو کسی طرح کی اُلجھن پیدا نہیں کرتی۔ یہی مسئلہ تحقیق کا ہے۔ تحقیق میں حافظ محمود خاں شیرانی جن کو میں اُردو کا پہلا محقق تسلیم کرتا ہوں۔ جس کا ذکر میں نے کیا بھی تھا۔ اس کے بعد مولانا عرشی یا ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ان لوگوں کی زبان تحقیق کی معیاری زبان ہے۔ ہم لوگ اس زبان کی تقلید بھی کرتے ہیں۔ اس میں اختصار پسندی اتنی نہیں ہے کہ جو ذہن کو اُلجھا دے، اس لیے میں قاضی صاحب کی زبان کو بہت معیاری تو تصور تو کرتا ہوں لیکن بہت صاف سُتھری نہیں۔ ایک بات اور، تنقید میں کلیم الدین سے بہت اختلاف کیا گیا۔ میری تو کلیم الدین کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے، با وجود اس کے میں اُن کے نظریات سے اختلاف رکھتا ہوں لیکن کلیم الدین نے جو زبان لکھی ہے وہ تنقید کی سچی زبان ہے۔ اینچ پیچ سے الگ، صاف بالکل براہ راست اس طرح تحقیق میں ادا کئی لوگوں کی زبان ہے لیکن یہ سچ ہے کہ قاضی صاحب کی زبان نے فروغ نہیں پایا۔ مجھ جیسا نیاز مند بھی ان کی تقلید نہیں کر سکا۔ شیرانی صاحب، عرشی صاحب اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ان دونوں کی زبان اور اسلوب کی میں تقلید کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

عارف ہندی اور جاوید انور نے جب رشید حسن خاں سے یہ معلوم کیا کہ معتبر اور غیر معتبر کلام کا تعین کرتے وقت مدون کو کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے تو موصوف نے عالمانہ انداز میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ پہلے مدون کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ (جس پر وہ کام کر رہا ہے) فلاں شاعر کے کلام کے کتنے نسخے دستیاب ہیں اور کہاں کہاں کس لائبریری میں موجود ہیں۔ ان نسخوں کی زبان سے بھی مدون واقف ہو۔ عارف ہندی اور جاوید انور نے جب ان سے یہ سوال کیا کہ آپ کا زور اس بات پر ہے کہ تحقیق اور تدوین دو مختلف دائرے ہیں جب کہ گیان چند جین صاحب تدوین کو تحقیق کا اور تحقیق کو تدوین کا ایک ذیلی شعبہ قرار دیتے ہیں۔ آپ کی رائے کیا ہے؟ تو اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں تحقیق اور تدوین کے علاوہ تنقید کا بھی الگ دائرہ مانتا ہوں۔ خاں صاحب کے نزدیک تحقیق اور

تدوین دونوں الگ الگ شعبے ہیں۔ بل کہ تحقیق سے آگے کی چیز تدوین ہے۔ اس سوال کا مفصل جواب دیتے ہوئے رشید حسن خاں یوں گویا ہوئے:

''دیکھیے میں بنیادی طور پر یہ نہیں مانتا۔ کیوں کہ ان کے اپنے اپنے دائرے ہیں جو کسی دوسرے دائرے کو کاٹتے نہیں اس میں داخل نہیں ہو سکتے تو وہ ایک دوسرے کے ذیلی شعبے کیسے ہو سکتے ہیں؟ میں نے ابھی بتایا کہ تحقیق کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ کسی شخص یا تخلیق کے متعلق پورے پورے حادثات و واقعات کو من وعن درج کر دے اور تدوین کے فرائض بھی میں نے بتائے۔ تو میری ان باتوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ میں تدوین کو تحقیق کو بل کہ تنقید کو بھی الگ الگ دائرہ کار مانتا ہوں۔ ان سب کا آپس میں باہمی رشتہ ضرور ہے لیکن ذمے داریاں سب کی الگ الگ ہیں۔ یہ تینوں تین مختلف شعبے اور تین مستقل دائرے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی دائرہ کسی دوسرے دائرے کو کاٹتا نہیں۔ یہ ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ لیکن ان کے مماثل نہیں۔ ممکن ہے ایک ہی شخص کے اندر یہ تینوں صلاحیتیں تین الگ الگ لوگوں کا حصہ ہوں۔ یہ تو ذہنی مناسبت پر منحصر ہے کہ کس کی دل چسپی کس میں ہے۔ قاضی عبدالودود ہیں۔ جن کو ہم بہت بڑا محقق مانتے ہیں لیکن انھوں نے تدوین کا ایک بھی کام نہیں کیا۔ بنیادی طور پر جو شخص حقائق کا تعین صحیح کر دے وہ محقق اور جو متن کی صحت کو جانچنے پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ مدون۔ ضروری نہیں کہ جو شخص متن کے الفاظ اور اس کے سارے متعلقات پر گہری نظر رکھے وہ تحقیق کے کاموں کو بھی اچھی طرح انجام دے سکے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ تحقیق اور تدوین الگ الگ دائرۂ کار ہیں۔''

رشید حسن خاں کے دورۂ پاکستان 1987 کے دوران ایک مذاکرے کا انعقاد بہ عنوان ''اُردو زبان میں تحقیق کی اہمیت اور موجودہ صورتِ حال'' کیا گیا۔ اس مذاکرے میں جن لوگوں نے شرکت کی ان میں محمد اکرام چغتائی، سجاد باقر رضوی، کشور ناہید، پروفیسر جیلانی کامران، ذاالفقار احمد تابش، ڈاکٹر معین الرحمٰن کے نام شامل ہیں۔ اس مذاکرے کو ہندوستان میں ماہ نامہ کتاب نما، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے

گوشۂ رشید حسن خاں جلد30، شمارہ8 اگست 1990 میں شاہد علی خاں نے شائع کیا۔ اس مذاکرے میں رشید حسن خاں نے ہندوستان اور پاکستان کے ادب اور ادیبوں کے ساتھ تحقیق و تدوین کی صورت حال پر تبادلۂ خیال کیا۔ شرکائے مذاکرہ نے ان کی علمی و ادبی فتوحات کا بر ملا اعتراف کیا۔ جب شرکائے مذاکرہ نے اُردو املا کی اصلاحات کے بارے میں کی گئی ان کی سفارشات کے بارے میں سوال کیا تو رشید حسن خاں نے اعتراف کیا کہ ہمارے یہاں اُردو املا کی اصلاح کے باب میں مولانا احسن مارہروری نے 1905 میں کام کیا۔ انھوں نے اپنے اصولِ املا میں بیسویں صدی کی ابتدا میں ہی الفاظ کو ملا کر لکھنے کے بجائے اسے الگ الگ لکھنے پر زور دیا۔ مولانا احسن مارہروری نے ''دلکش'' میں ''دل'' کو الگ لکھنے اور ''کش'' کو الگ لکھنے پر زور دیا۔ رشید حسن خاں سے اکرام چغتائی نے جب ان کی کتاب ''اُردو املا'' کے دوسرے اڈیشن کی اشاعت اور اس میں کی گئی اصلاحات کے بارے میں معلوم کیا تو خاں صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اس میں مثالیں بڑھا دیں ہیں اور الفاظ کا گوشوارہ بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے 1955 کے بعد رسالہ ''آج کل کے تحقیق نمبر'' کے ایک اہم مضمون ''اُردو تحقیق کے چار اساطیر'' کے بارے میں خاں صاحب سے دریافت کیا کہ ہم ان چار محققین میں سے تین سے محروم ہو چکے ہیں اور آپ کے علاوہ کوئی اور دوسرا بزرگ بھی ہے جو ادبی تحقیق کے مسائل پر غور و فکر کر رہا ہو؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے رشید حسن خاں نے کہا کہ موجودہ عہد میں درویش صفت محققین کا ملنا دشوار ہے۔ 1950 اور 1960 کے بعد جو سماجی تبدیلیاں آئی ہیں اس کے نتیجے میں لوگ ہوس کا شکار ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے اکثر پڑھنا چھوڑ دیا ہے، لکھنا اختیار کر لیا ہے۔ اس روش نے اُردو تحقیق کو نقصان پہنچایا ہے۔ تحقیق کے اس زوال پر ذوالفقار تابش نے جب رشید حسن خاں سے یہ سوال معلوم کیا کہ پچاس اور ساٹھ کی دہائی کے بعد دونوں ملکوں میں تحقیق کی کیا صورتِ حال ہے اور تخلیقی جوڑ توڑ کا تحقیق پر کتنا اثر پڑا؟ تو اس سوال کے جواب میں رشید حسن خاں نے کہا کہ تخلیق کا عمل اندرون سے تعلق رکھتا ہے خارج سے نہیں جب کہ تخلیق خالصتاً اکتسابی عمل ہے۔ اس اہم سوال کا جواب رشید حسن خاں نے کچھ اس انداز میں دیا:

> ''یہ سوال بڑا اہم، معنی خیز اور دل چسپ ہے۔ وہ بات جو میں بھول گیا تھا آپ نے یاد دلا دی۔ تخلیق اور تحقیق دو مختلف راستے ہیں، جو کہیں آ کر نہیں ملتے۔ میں

اگر چاہوں تو لفظ جمع کر کے شعر بنا سکتا ہوں لیکن شعر کہہ نہیں سکتا، کیوں کہ تخلیق کا عمل بڑا مختلف عمل ہے جو اندرون سے تعلق رکھتا ہے، خارج سے نہیں۔ جب کہ تحقیق خالص اکتسابی اور خارجی عمل ہے جو شخص تخلیقی صلاحیت نہیں رکھتا، وہ کتنا ہی بڑا محقق ہو، تحقیق کرے یا نہ کرے، تخلیق تو کر ہی نہیں سکتا اور جو شخص تخلیق کار ہے، وہ کتنا ہی سر پیٹ لے، تحقیق کا کام نہیں کر سکتا۔ ہوا یہ کہ آہستہ آہستہ 1947 کا جو حادثہ ہوا ہے، اس نے حدِّ اصل کھینچ دی ہے وہاں سے یہ چیزیں شروع ہوئیں ہوں یا نا ہوئی ہوں، لیکن وہ ان کے شروع ہونے کی تمہید بن گیا ہے۔ اس طرح وہ پورے نظام کے بدلنے کی بھی تمہید بنا ہے۔ نظام کے بدلنے نے صورتِ حال کو بدل دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنیادی تعلیم ختم ہوگئی۔ اب یہ بات کہ مزاجی مناسبت، تو پہلے ہی کم تھی۔ 1920 سے لے کر 1938 تک ایک اکیلے شیرانی صاحب کھڑے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب چیزیں بدلی نہیں ہیں، 1947 والا عمل نہیں ہوا ہے۔ در اصل تحقیق کا کام پہلے بھی محدود دائرے میں تھا اور ہمیشہ محدود دائرے میں رہے گا اور اس میں وہی لوگ آئیں گے جن کے اندر قلندری ہوگی۔ اگر علم کے ساتھ قلندری کا جز شامل نہیں، تو کتنا ہی بڑا آدمی ہو، تحقیق نہیں کر سکتا۔ ہاں ترقی اُردو بورڈ اور مجلس ترقی ادب کی کتابیں مرتب کر سکتا ہے۔"

رشید حسن خاں نے اس اہم ادبی مذاکرے میں شاعری سے متعلق سوالات کے بھی اطمینان بخش جواب دیے۔ خاص طور سے کلامِ امیر خسرو کی دستیابی کے حوالے سے۔

رشید حسن خاں نے مختلف اداروں، رسائل و جرائد کے علاوہ ریڈیو پر بھی انٹرویو اور مذاکرے کیے۔ آل انڈیا ریڈیو کے لیے رفعت سروش نے رشید حسن خاں سے ایک ادبی مذاکرہ (1965) کے علاوہ ایک اور انٹرویو (89-1988) بھی ریکارڈ کیا۔ رفعت سروش کے رشید حسن خاں سے ادبی مراسم اُس وقت سے ہیں جب سے وہ دہلی میں مستقل طور پر آئے۔ رفعت سروش نے رشید حسن خاں کو جب ادبی مذاکرے کے لیے آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی میں مدعو کیا تو ان کی فیس 25 روپے مقرر کی گئی۔ رشید حسن خاں اس بات پر ناراض ہوئے کہ نقاد کا رتبہ شاعر سے بڑا ہوتا ہے۔ رفعت سروش نے اس مذاکرے کے

بعد اگلی مرتبہ خواجہ احمد فاروقی (صدر شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی) کے مقالے پر تنقید کرنے کے لیے آل انڈیا ریڈیو میں بلایا۔اس دونوں واقعے کو رفعت سروش نے قلم بند کرتے ہوئے تحریر کیا:

”ریڈیو میں میں اُردو مجلس کا پروڈیوسر تھا، وہاں میں ایک پروگرام شروع کیا تھا ”بزمِ ادب“ جس میں ایک شاعر یا افسانہ نگار کو اپنی تخلیق پیش کرنے کی دعوت دی جاتی تھی اور اس پر برجستہ بحث کی جاتی تھی۔اس مباحثہ میں حصہ لینے کے لیے ہم لوگ ایک نقاد کو بھی بُک کرتے تھے۔ایک بار شہاب جعفری کو نظم پڑھنے کے لیے بلایا اور رشید حسن خاں کو تنقید کے لیے۔یہ بات 65 کے آس پاس کی ہے۔شہاب جعفری پرانے براڈ کاسٹر تھے اور ان کی فیس تھی تیس روپے، جب کہ رشید حسن خاں نسبتاً نئے تھے اور ان کی فیس تھی پچیس روپے۔ خاں صاحب یہ دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے۔مجھ سے سنبھالے نہ سنبھلے۔فی الحال تو کنٹر کٹ کو نہیں بدلا جا سکتا۔پھر وہ پہنچے اس پورے معاملے کی شکایت کرنے علی جواد زیدی کے پاس جن کا دفتر ہماری ہی بلڈنگ میں تھا۔زیدی صاحب کا ریڈیو سے کوئی تعلق نہیں تھا۔مگر وہ ہم دونوں کے بزرگ تھے۔میں نے ان کو اپنی مجبوری بتلائی۔خاں صاحب کا کہنا تھا کہ نقاد کا رتبہ شاعر سے بڑا ہوتا ہے۔ بہر حال زیدی صاحب کے سمجھانے پر وہ مان گئے اور اور پروگرام میں حصہ لیا اور بعد میں میں نے ایک خصوصی نوٹ لکھ کر اگلے پروگرام کے لیے ان کی فیس بڑھوادی۔یہ میرے علم میں نہ تھا کہ خاں صاحب اور خواجہ احمد فاروقی کے باہمی تعلقات اچھے نہیں ہیں۔خواجہ صاحب تھے صدر شعبۂ اُردو اور خاں صاحب لائبریری کلرک،، مگر انھوں نے اپنی علمیت کا لوہا منوایا تھا۔اتفاق سے کچھ عرصہ بعد میں نے بزمِ ادب پروگرام میں خاں صاحب کو بہ حیثیت نقاد پھر بُک کیا اور اس بار انھیں خواجہ احمد فاروقی کے مقالے پر تنقید کرنا تھی۔ریکارڈنگ کے لیے آئے مگر ایک دل چسپ بات شکایت کے انداز میں کہی بولے ”رفعت صاحب! اگر چہ لوہے کے قلم سے لکھتا ہوں، مگر میری آنکھوں میں مروت ہے۔“میں سمجھ

گیا اور میں نے مسکراتے ہوئے کہا خان صاحب ! آپ سے اسی توازن کی اُمید ہے اور میں نے ریکارڈنگ میں دیکھا کہ خاں صاحب نے کئی موقعوں پر اپنی ''خان صاحبیت'' کی روش بدلی۔''

رفعت سروش نے بزم ادب کے تحت کئی ادبی پروگرام خاں صاحب کے ساتھ کیے۔ ڈاکٹر محمد حسن کے مضمون پر رفعت صاحب نے جب ان سے لکھنے کے لیے کہا تو خاں صاحب نے تاریخی جملہ ادا کیا، کہا ''رفعت صاحب میں رائفل سے چڑیوں کا شکار نہیں کرتا''۔ رشید حسن خاں کے دہلی یونی ورسٹی سے ریٹائر منٹ سے قبل 1988 یا 1989 میں رفعت سروش نے آل انڈیا ریڈیو کے لیے ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس انٹرویو میں بہ قول رفعت سروش خاں صاحب کی شخصیت کے نئے گوشے وا ہوئے۔ اس انٹرویو میں رفعت سروش نے خاں صاحب کی ادبی Boldness پر بھی تبادلۂ خیال کیا۔

رشید حسن خاں سے ایک انٹرویو پروفیسر یونس اگاسکر اور پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے سہ ماہی رسالہ ''ترسیل'' کے مشترکہ شمارہ جنوری تا جون 1999 میں شائع کیا۔ اس انٹرویو میں دونوں صاحبان نے رشید حسن خاں کی ادبی زندگی کے علاوہ ان کی نجی زندگی کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی۔ اس انٹرویو میں متن کی ملکیت اور لفظیات پر تفصیلی بحث شامل ہے۔ ساتھ ہی تنقید و تحقیق کی زبان میں اصلاحات اور موجودہ ادبی منظر نامے پر گفتگو ہے۔ اس مکالمے میں رشید حسن خاں نے اپنی شادی کے بعد کے واقعات میں ''طلسم ہوش ربا اور آبِ حیات'' کے مطالعے کو اہمیت دی ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اگر میں آرڈیننس کلودنگ فیکٹری شاہ جہاں پور میں کام نہ کرتا تو مارکسزم کے نظریے سے واقف ہی نہیں ہو پاتا۔ یہاں تک کہ ٹریڈ یونین کے لیڈروں کے دوہرے کرداروں سے میں خفا رہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی باتوں اور عمل میں تضاد تھا۔ وہ کہتے کچھ اور تھے اور کرتے کچھ اور تھے۔ جب رشید حسن خاں ٹریڈ یونین کے لیڈروں سے ان مسائل پر گفتگو کرتے تو فیکٹری کے لیڈر ان کی باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ لیکن رشید حسن خاں کے ذہن میں نظریۂ مارکسزم کے خلاف کچھ نہ کچھ سوالات جنم لیتے ہی رہتے تھے۔ دراصل مدرسے کی پڑھائی اور ان کا تحقیقی رویے نے انھیں مارکسٹ بننے سے روکے رکھا۔ انھیں ''دنیا کے مزدوروں ایک ہو جاؤ'' کا نعرہ بھی کھوکلا اور فرضی لگتا تھا۔ کیوں کہ رشید حسن خاں کی نظر میں دنیا کے مزدوروں کے مسائل ایک جیسے نہیں ہوتے۔ رشید حسن

خاں نے اس انٹرویو میں ایسی بہت سی باتوں کا انکشاف کیا ہے جن سے اُردو دنیا واقف نہیں تھی۔ میں یہاں پروفیسر معین الدین جینا بڑے کے سوال ''خاں صاحب آپ کا جو مدرسے سے ٹریڈ یونین تک کا سفر ہے وہ ایک طرح سے یقین اور تشکیک تک کا سفر ہے اور یہ تشکیک جو ہے علمی شخصیت کا جز تو رہی ہے لیکن شخصی اور نجی اور مذہبی سطح پر یہ سفر آپ کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوا'' اور خاں صاحب کا جواب قارئین کی خدمت میں حاضر کر رہا ہوں تا کہ اندازہ لگایا جا سکے کہ رشید حسن خاں نے اپنے ابتدائی دور سے ہی تشکیک کا دامن پکڑ لیا تھا۔ تشکیک نے ہی انھیں اُردو تحقیق و تدوین میں منفرد مقام عطا کرایا:

> ''دیکھیے بھائی (رُک کر) دیکھیے بھائی، مدرسے کی تعلیم کے زمانے میں ذہن میں بعض سوالات پیدا ہوتے تھے جن کا جواب نہیں ملتا تھا ایک تو ہم لوگ اپنے اساتذہ سے ڈرتے تھے تو زیادہ سوال پوچھ نہیں سکتے تھے اور ایسا ویسا سوال پوچھتے تو ڈانٹ پڑتی تھی مثلاً ہم شراح وقافیہ پڑھ رہے تھے اس میں ایک جگہ پہ غلاموں کو آزاد قرار کرنے کے احکام آئے۔ تو میں نے بہت ڈرتے ڈرتے دبی زبان سے اپنے اُستاد سے کہا کہ ''غلامی تو اب ہمارے یہاں ہوتی نہیں اور شاید ہوگی بھی نہیں تو ان کے احکام ہم کیوں پڑھیں؟'' بہت ناراض ہوئے۔ مطلب یہ کہ سوال تو ذہن میں پیدا ہوتے تھے۔ پتا نہیں ذہن شروع سے ایسا تھا، کیا تھا کہ سوال پیدا ہوتے تھے۔ کنویں کا مسئلہ پڑھ رہے تھے پاک ہونے کا بڑا کنواں ہے اور چھپکلی گر جائے اور ناپاک ہو جائے، تو اتنے ڈول نکال دو تو پاک ہو جائے گا۔ تو اب اُستاد سے تو کہنے کی ہمت تھی نہیں ایک طالب علم ساتھ کے تھے اس سے کہا کہ ''یار یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ پانی تو تھوڑا بہت باقی ہے تو نیا پانی آئے گا تو ملے گا نا اس میں؟''۔ کہنے لگے ''کیا کافروں جیسی باتیں سوچتے ہو؟'' تو ذہن میں استفہام تو ہلکے ہلکے پیدا ہوتے تھے لیکن ان کو روشنی نہیں ملتی تھی اور بڑھاوا نہیں ملتا تھا۔ ٹریڈ یونین میں گئے تو کھلی فضا ملی وہاں۔ اسی لیے میرا اختلاف ہوا مارکسزم سے۔ ورنہ میں مارکسسٹ ہوتا آج۔ میں نے شام کو جو میٹنگ ہوتی تھی اس میں ایک بار پوچھا کہ یہ جو نعرہ ہے، ہم سے لگوایا جاتا ہے

کہ ”دنیا کے مزدوروں ایک ہو جاؤ“ لیکن دنیا کے مزدوروں کے مسائل تو ایک جیسے نہیں۔امریکہ کے کارخانے کا جو مسئلہ ہے وہ ہمارے کارخانے کا نہیں ہے۔ کان پور کے کارخانے کا وہ مسئلہ نہیں ہے جو شاہ جہاں پور کے کارخانے کا ہے۔تو کوئی شافی جواب نہیں دیا بل کہ کہا ”ارے یہ تو سرمایہ داروں کے پھیلائے ہوئے خیالات ہیں، کس میں گرفتار ہو گئے تم؟“۔مولوی صاحب جیسے ڈانٹ دیتے تھے یہ دوسرے انداز کی ڈانٹ تھی۔ترقی پسندوں نے بھی اور مارکسسٹوں نے بھی وہی رول ادا کیا ہے جو کٹھ ملاّ ادا کرتا تھا کیوں کہ جواب ان کے پاس تھا نہیں کوئی۔جہاں میں نے نیاز کی تحریریں پڑھیں تو اچانک وہ سارے سوالیہ نشانات روشن ہو گئے۔ہاں! اس پر شکر ادا کرتا ہوں خدا کا کہ میرا مطالعہ نیاز کی تحریروں تک محدود نہیں رہا اگر وہیں تک محدود رہتا تو انکار محض ہوتا۔حسنِ اتفاق سے تحقیقی ادب اور تحقیقی ذخیرہ جتنا ہمارے یہاں ہے،مولانا عرشی،شیرانی صاحب،قاضی صاحب،ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ان سب کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ شک کا مقصود کیا ہے؟ وہ کب پیدا ہونا چاہیے،کب پیدا ہونا نہیں چاہیے؟ انکار کی طاقت کیا ہے؟اس کا صحیح محلِ استعمال کیا ہے؟یقین کیوں ضروری ہے؟اور کیوں غیر ضروری ہے؟ان سب لفظوں کی تعریف جب معلوم ہوئی جب ان کا محلِ استعمال معلوم ہوا تو ذہن کی تربیت ہوئی اگر تربیت کا یہ عمل نہ ہوتا تو شاید میں تحقیق اور تدوین کے کام کو صحیح طور پر انجام نہ دے سکتا۔یا تو انکار ہوتا یا تشکیک ہوتی یا پھر وہ یقینِ محض ہوتا جو تصوف کے واسطے سے ہندوستان میں پھیلا ہے اور جس نے ذہنوں کو مجہول بنا دیا ہے پوری قوم کے۔“

یہاں میں اُس انٹرویو کا بھی ذکر کرنا گزیر سمجھتا ہوں جسے پاکستان کے قلم کار حافظ صفوان محمد چوہان نے اپنے مضمون ”رشید حسن خاں صاحب اور عصری دانش کی مشارکت“ میں شامل کیا ہے۔یہ مضمون احقر کی مرتب کردہ کتاب ”رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں،جلد اول، اشاعت 2019 کے صفحہ 211 تا 244 پر شامل ہے۔اس مضمون کو ذکیہ مراد نے ”رسالہ مخزن“ کی فائل

سے نکلوا کر میرے استفسار پر یکم اپریل 2017 کو بہ ذریعہ ای میل ارسال کیا۔ میرا ماننا یہ ہے کہ حافظ صفوان محمد چوہان کا رشید حسن خاں سے یہ سب سے آخری انٹرویو ہے۔ اس انٹرویو کے ساڑھے پانچ مہینے بعد رشید حسن خاں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ یہ انٹرویو 17 ستمبر 2005 کی رات کو 10 بج کر 10 منٹ پر بہ ذریعہ ٹیلی فون لیا گیا۔ اس انٹرویو کی مدت بقول حافظ صفوان محمد چوہان تقریباً 40 منٹ رہی۔ دراصل اس انٹرویو کو لینے سے قبل حافظ صفوان محمد چوہان نے ایک طویل خط جولائی 2005 کے آخر میں رشید حسن خاں کے نام ارسال کیا تھا۔ اس سوال نامے میں 15 سوالات، رشید حسن خاں کی زندگی، تحقیق، تدوین، املا، زبان و قواعد اور دیگر ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے معلوم کیے گئے تھے۔ لیکن موصوف نے حافظ صفوان محمد چوہان کے سوال نما خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ حافظ صفوان محمد چوہان نے اوائلِ ستمبر 2005 کو رشید حسن خاں سے بہ ذریعہ ٹیلی فون اس تاخیر (سوال نامے کا جواب نہیں دینے) کی وجہ دریافت کی تو موصوف نے انھیں بتایا کہ ان کی طبیعت آج کل بہت ہی خراب ہے۔ اس وجہ سے میں لکھ کر کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ خاں صاحب نے ہی حافظ صفوان محمد چوہان کو ٹیلی فون پر سوالات کے جواب دینے کا وقت مقرر کیا۔ اس طرح ایک اہم انٹرویو ٹیلی فون پر لیا گیا۔ اس انٹرویو میں بہت ہی اہم مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ لیکن میں یہاں صرف اس سوال کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں جو شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب ''لغاتِ روزمرہ'' (اشاعت اول 2003) کے بارے میں ہے۔ دراصل اس کتاب میں پہلی بار صفحات کے نمبر بائیں سے دائیں جانب لکھے گئے (500 کو 005)۔ حافظ صفوان محمد چوہان نے اس عمل کو بدعت تسلیم کیا۔ اور خاں صاحب سے اس معاملے میں ردِعمل جاننا چاہا۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم کیا کہ تحقیق اور تدوین میں کیا یہ عمل صحیح ہے یا غلط۔ رشید حسن خاں نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس اہم ادبی گفتگو کا میں ایک حصہ قارئین کے سامنے پیش کر رہا ہوں تا کہ سوال اور جواب کے انداز سے بہ خوبی واقفیت حاصل کی جا سکے:

''اگلا سوال یہ تھا کہ میں نے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے لغاتِ روزمرہ (اِشاعتِ اوّل: 2003) میں پہلی مرتبہ ایک ''بدعت'' دیکھی ہے، کہ اِس میں متن میں حوالے کے طور پر صفحات کے جو نمبر دیے گئے ہیں وہ دائیں سے بائیں لکھے گئے ہیں، یعنی مثلاً صفحہ نمبر ۵۰۰ کو ۰۰۵ اور صفحہ نمبر ۱۵۸۰

کو ۱۸۵۰ لکھا گیا ہے، علیٰ ہٰذا۔ جب کہ اِس کتاب کے اپنے صفحات کے نمبر مروّجہ متداول ترتیب (بائیں سے دائیں) میں لکھے گئے ہیں۔ میں نے اب سے پہلے ایسا کیا ہوا کہیں نہیں دیکھا، اِسی لیے اِسے ''بدعت'' کہا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اِس کام کے لیے اُکساوا کس نے دیا۔ کیا آپ حوالے کے صفحات کے نمبر لگانے کی اِس ''غریب'' ترتیب کی، جو اِس کتاب کے ہر پڑھنے والے کو صریحاً کوفت میں مبتلا کر دیتی ہے اور تدوین و تحقیق کے پہلے سے ہی مشکل کام کو ایک اور الجھن اور بے برکتی کی بیخ لگا دیتی ہے، حمایت کرتے ہیں؟ خاں صاحب نے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اور ڈاکٹر خلیق انجم کے بارے میں بہت بلند الفاظ کہے لیکن سوال کا جواب بہر حال ٹال دیا۔ (یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ لغاتِ روزمرہ میرے مستقل استعمال میں رہتا ہے۔ میرے خیال میں جو شخص بھی ایک بار اِسے استعمال کرنا شروع کر دے گا، اِسے کبھی نہ چھوڑ سکے گا۔ شان الحق حقی صاحب کے فرہنگِ تلفظ کے بعد یہی لغت ہے جو مجھے سب سے زیادہ کھولنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ زبان کو نتھارنے والے اِس لغت کو مرتب کر کے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے بہت بڑا احسان کیا ہے؛ یہ اُن لغات میں سے ہے جن کی ضرورت دائمی ہے اور عام قاری سے لے کر اساتذۂ ادب تک کسی کو اِس سے اِستغنا نہیں۔''

اب آخر میں، میں اُن ادبی مددگار صاحبان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جن کی بدولت یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ سب سے پہلے میں انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی کے تمام اہل کاروں کا شکریہ دارمے، درمے اور سخنے کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اُردو گھر کے سب سے اہم ستون محمد عارف خاں (نائب مدیر ہفت روزہ ہماری زبان اور سہ ماہی اُردو ادب) اس جانب میری توجہ مبذول نہ کراتے تو یہ مقالہ تحریری شکل میں نہ آپاتا۔ ساتھ ہی اُردو گھر کے کاتب اعلا عبدالرشید صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنے نیک مشوروں سے مجھے مستفیض کیا۔ عبدالرشید صاحب سے میں نے کتابت کے آداب سیکھے۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں اُردو گھر کے لائبریرین جناب اختر الزماں کا شکریہ ادا نہ کروں۔ میں جب

بھی اُردو گھر کی لائبریری (شبلی لائبریری) جاتا تو بڑی ہی خندہ پیشانی سے وہ میری مطلوبہ کتابوں اور رسائل و جرائد کی فائلوں پر نظر ثانی کرنے کی اجازت دیتے۔ میں ڈاکٹر زمرد مغل، جاوید رحمانی (سکریٹری، انجمن ترقی اُردو، ہند، نئی دہلی) اور انجمن کے معتمد اعلا ڈاکٹر اطہر فاروقی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے اپنے دونوں انٹرویوز کو شامل کتاب کرنے کی اجازت دی۔

میں اس موقع پر ہریانہ اُردو اکادمی سے وابستہ ڈاکٹر محمد مستمر کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے قدم قدم پر میری رہ نمائی کی۔ ڈاکٹر شاہ نواز فیاض (دہلی) کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میرے لیے کئی اہم مقالے، تبصرے اور مضامین، جن کا تعلق رشید حسن خاں سے تھا، کی فوٹو اسٹیٹ روانہ کیں۔ ساتھ ہی ڈاکٹر گیان چند جین کی وہ نادر تحریریں جن کا تعلق رشید حسن خاں سے تھا، کے بھی عکس بنوا کر موصوف نے میرے لیے روانہ کیے۔

میں بے حد مشکور ہوں ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا کا، جنھوں نے کئی انٹرویوز کی فوٹو کاپیاں اور دیگر مواد بہ ذریعہ ڈاک میرے گھر پہنچایا۔ اگر ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا کی رہنمائی حاصل نہ ہوتی تو رشید حسن خاں کے انٹرویوز منصۂ شہود پر نہ آپاتے۔ موصوف سے انٹرویوز کے بارے میں بہ ذریعہ موبائل اور خطوط مشورہ ہوتا رہتا تھا۔ دراصل جب سے میں نے رشید حسن خاں کی شخصیت اور ادبی کاوشوں کی جانب تحقیقی قدم رکھا ہے، تب سے ہی انھوں نے میری قدم قدم پر رہنمائی کی ہے۔

میں اپنے میرٹھ کے ساتھیوں میں ڈاکٹر خالد ظہیر اور ڈاکٹر ارشاد سیانوی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن سے میں رشید حسن خاں کے انٹرویو کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتا تھا۔ اس موقع پر میں رشید حسن خاں کے دونوں فرزندوں، خورشید حسن خاں اور خالد حسن خاں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میری مدد اُس وقت کی جب میں نے اس میدان میں قدم رکھا ہی تھا۔ خورشید حسن خاں نے اپنے والدِ محترم رشید حسن خاں کی اُن باتوں، عادت واطوار کے بارے میں احقر کو مطلع کیا جن سے میں ناواقف تھا۔ میں نے کسی بھی بات کو دریافت کرنے کے لیے کسی بھی وقت شاہجہاں پور فون کیا اُسی وقت انھوں نے میرے سوالات کے تسلی بخش جواب دیے۔ اس ضمن میں میں رشید حسن خاں کے بچپن کے دوست ربابؔ رشیدی کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ موصوف نے کئی نادر تحریریں میرے استفسار پر، ارسال کیں۔ اس موقع پر میں ربابؔ رشیدی کے برادر خورد ماسٹر سہیل کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ موصوف

نے اپنی ذاتی لائبریری کے دروازے میرے لیے ہمیشہ کھولے رکھے۔

اس موقع پر میں اپنے والد افسر علی اور والدہ شکیلہ بانو کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے میرے لیے رات دن دعائیں کیں، تاکہ میرا کام جلد از جلد مکمل ہو کر صفحۂ قرطاس کی زینت بنے۔ میں اپنی اہلیہ یاسمین بیگم کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ جس نے اپنی خانگی زندگی کے قیمتی اوقات اس اہم کام پر قربان کیے۔ اس کام کو لے کر کئی مواقع ایسے بھی آئے جب ہم دونوں کے درمیان خلش بھی پیدا ہوئی۔ لیکن رب العالمین کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ مرحلہ بھی ہنسی خوشی پار ہو گیا۔ میں اپنی بیٹیوں گل افشاں جہاں، زینت ریشما اور صاحب زادوں فیصل ابراہیم، واصل ابراہیم کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا کہ جنھوں نے مقالہ تحریر کرتے وقت میری جو خدمت کی ہے اُس کا صلہ انھیں دنیا اور آخرت میں پروردگا عالم ضرور دے گا۔ آمین! ثم آمین۔

انسان غلطیوں کا پُتلا ہے۔ مجھے اپنی بشری کمزوریوں کا بھی احساس ہے۔ انٹرویوز کی اس کتاب میں اگر کہیں کوئی ایسی بات جس کی وضاحت ضروری تھی یا جس کو نظر انداز کر دینا ضروری تھا، در آ گئی ہے تو میں اس کے معذرت خواہ ہوں۔ قارئین حضرات سے التماس ہے کہ اگر کتاب میں کہیں املا اور کتابت کی غلطیاں انھیں نظر آئیں تو احقر کو مطلع کر دیا جائے تاکہ آیندہ اڈیشن میں ان غلطیوں کی تصحیح کی جا سکے۔ آپ کی دعاؤں کا طالب:

ابراھیم افسر

نگر پنچایت سِوال خاص ضلع میرٹھ (اُتر پردیش)

19 اگست 2019

☆☆☆

ابراہیم افسر

رشید حسن خاں کی سوانح وشخصیت

شاہ جہاں پور کا تاریخی پس منظر

شہیدوں کی نگری، سرفروشوں کی دھرتی، عالموں فاضلوں کی بستی، شاعروں کی سرزمیں اور ادیبوں کی آماج گاہ شاہ جہاں پور ہے۔ یہی وہ شہر ہے جسے تہذیبی، سیاسی اور ثقافتی اور ادبی وقار اور افتخار کا مرتبہ حاصل ہے۔ اس خطۂ ارض میں تہذیبیں پروان چڑھیں، علم وعرفان کے چراغ روشن ہوئے، شعروادب کے اساتذہ نے اس شہر میں آنکھیں کھولیں۔

شاہ جہاں پور اتر پردیش کا ایک اہم اور تاریخی ضلع ہے۔ شاہ جہاں پور دو ندیوں گرّہ اور کھنوت کے درمیان آباد ہے۔ یہ ایک زرعی علاقہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ شہر قالین سازی کے لیے بھی مشہور ہے۔ اس کے باوصف یو پی کا یہ ضلع جو اپنے علمی، تحقیقی اور تنقیدی کارناموں کے لیے بھی پورے ہندوستان میں اپنی ایک الگ شناخت اور شہرت رکھتا ہے۔ آزادئ ہند سے پہلے یہاں انگریزی حکومت نے آرڈیننس کلودنگ فیکٹری (Ordinance clothing factory) یا ''درزی خانہ'' کے نام سے ایک فیکٹری قائم کی تھی جس میں فوجیوں کے لباس تیار کیے جاتے تھے۔ یہ فیکٹری آج بھی اسی شہر میں قائم ہے۔

اس درزی خانہ کی بھی اپنی ایک منفرد تاریخ ہے۔ 1879 میں بنگال کے انگریز گورنر ایشلے ایڈن نے ایک حکم نامہ کے ذریعہ 3 درزی خانے بمبئی، مدراس اور علی پور میں قائم کیے تھے۔ 1914 میں علی پور کے درزی خانہ کی ایک شاخ تجربہ کے طور پر ایک سال کی مدّت کے لیے شاہ جہاں پور میں قائم کی گئی اور اس کا نام Army Clothing Factory, Shahjahanpur رکھا گیا، لیکن 1925 میں علی پور کے درزی خانہ کو مکمل طور پر بند کر کے اس کے دفاتر اور ملازمین کو شاہ جہاں پور مستقل طور پر منتقل کر دیا گیا۔

شاہ جہاں پور کی علمی حیثیت اس واقعہ سے واضح ہو جاتی ہے کہ اس شہر میں سرسید احمد خاں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا دسویں اجلاس 1895 میں منعقد کیا جس میں یہاں کے عوام نے سرسید کی

تعلیمی پالیسیوں سے والہانہ محبت کا نہ صرف اظہار کیا بل کہ ان پالیسیوں کی حمایت بھی کی۔ اس تاریخی جلسہ میں ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی نظم پڑھی جس کا ایک بند اس طرح سے ہے:

نچا مارا ہے یکسر کیا عرب اور کیا عجم سب کو
خدا غارت کرے اس اختلاف دین ومذہب کو
عجب بد عقل ہے انساں کہ بایں دعویِ دانش
ہزاروں سال سیکھا پر نہ سمجھا اصل مطلب کو
زمانے نے بہت سفاکیاں مذہب کی دیکھی ہیں
اگر شک ہو تو تم بھی آزما دیکھو مجرّب کو

(اُردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، ڈاکٹر منظر اعظمی، صفحہ 232، اُردو اکادمی، لکھنؤ، 2009)

شاہ جہاں پور کو شہرت، مقبولیت اور اہمیت اس وقت حاصل ہوئی جب آزادیٔ وطن کی چنگاری شعلۂ جوّالہ کی صورت اختیار کر گئی۔ جنگِ آزادی میں انگریزوں کی نیندیں حرام کرنے والوں میں اشفاق اللہ خاں، حسرتؔ وارثی، پنڈت رام پرساد بسمل، ٹھاکر روشن سنگھ، پریم کرشن کھنہ، بنواری لال اور جگدیش بنارسی کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔

اُتر پردیش میں شاہ جہاں پور کو یوں بھی افتخار حاصل ہے کہ یہاں اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے بہت سے قلم کاروں نے جنم لیا۔ مثلاً ہندی کے ڈرامہ نگار بھوتیشور، ہندی ناول نگار ہردیش اور انقلابی شاعر دروہیؔ وغیرہ نے اسی سرزمین کو اپنا کارزار بنایا۔

اس شہر کا سنگ بنیاد مغل دربار کے جری اور بہادر جرنیل نواب بہادر خاں چغتاںؔ نے 1637 میں مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے حکم پر رکھا اور اپنے شہنشاہ کے نام کو لازوال بنانے کے لیے اس کا نام ''شاہ جہاں پور'' رکھا تھا۔ اس ضلع کی تحصیلیں کانٹھ، کٹرا، تلہر، جلال آباد اور پوایاں ہیں۔ شاہ جہاں پور کی تاریخ کے حوالے سے فہیم بسملؔ نے اپنی کتاب ''نظریات'' میں جو بات لکھی ہے وہ اس طرح ہے:

''شاہ جہاں بادشاہ کے جواں سال سپہ سالار عمدۃ الملک نواب ابدال خاں المخاطب بہ نواب بہادر خاں چغتہ کی کاوشوں سے شاہ جہاں پور وجود میں آیا۔ بہادر خاں ایک دلیر سپہ سالار تھا اور اس علاقہ کی آب وہوا سے متاثر ہو کر اسے

آباد کرنے کا ارادہ بنایا۔ اس نے اپنے وطن افغانستان سے 52 قبیلے یہاں لاکر آباد کیے۔ ہر قبیلے کو الگ الگ آباد کیا اور ہر قبیلے کے نام پر محلے منسوب کیے۔ مثال کے طور پر ایمن زئی، باروزئی، نصر زئی، محمد زئی، علی زئی وغیرہ۔''

(نظریات، صفحہ 25، فہیم بسمل، تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی، 2012)

علم و ادب کا چرچا اور شعر و شاعری کا غلغلہ یہاں 1857 کے ''غدر'' کے بعد بھی قائم رہا اور آج بھی اس شہر میں شعر و شاعری کے علاوہ ادب، تاریخ، تحقیق، تنقید کا بازار گرم ہے۔ شاعری کے علاوہ شاہ جہاں پور کو پوری اُردو دنیا سے متعارف کرانے والوں میں رشید حسن خاں کا نام اور کام بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔ رشید حسن خاں ایک منفرد محقق، مایہ ناز نقاد اور صفِ اوّل کے مدوّن تھے۔

خاندانی پس منظر

رشید حسن خاں کے دادا علی حسن خاں انگریزی فوج میں ملازم تھے۔ ان کا تعلق پٹھانوں کے مشہور خاندان یوسف زئی سے تھا۔ آپ کے والد محترم کا نام امیر حسن خاں تھا۔ یہ انگریزی پولس میں سب انسپکٹر تھے۔ تحریک آزادی کے دوران گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک اور عالموں اور مولویوں کی تقاریر سے متاثر ہو کر وہ محکمۂ پولس سے نوکری چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کے سمجھانے اور بجھانے پر استعفیٰ کے بجائے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لیا۔ امیر حسن خاں ایک کٹّر قوم پرست آدمی تھے۔ ان کو انگریزی تعلیم سے سخت نفرت تھی۔ ساتھ ہی ان کے اندر مذہبی کٹّر پن بھی کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اس کی وضاحت پروفیسر رفیع الدین ہاشمی اپنے مضمون ''رشید حسن خاں تحقیق و تدوین کا مردِ میداں'' میں اس طرح سے کی ہے:

''امیر حسن خاں طبیعت کے بہت سخت تھے۔ دل کے بہت صاف اور سخی تھے۔ مگر نرمی کا اظہار بہت کم ہوتا تھا۔ وہ کٹّر دیو بند کے مخالف تھے۔ جب رشید حسن خاں نے قرآن پاک ختم کیا تو ان کے اُستاد نے اپنا باترجمہ ذاتی نسخہ بطور انعام انھیں دیا۔ یہ مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمۂ قرآن تھا۔ خوشی خوشی گھر آ کر بتایا کہ مولوی صاحب نے یہ قرآن شریف انعام میں دیا ہے۔ امیر حسن خاں نے جو کھول کر دیکھا تو بقول رشید حسن خاں: ''چہرے کا رنگ بدل گیا'' بل کہ بگڑ

گیا۔انتہائے غضب میں کہنے لگے اس وہابڑے کا ترجمہ میرے گھر میں بھیجا گیا
ہے۔مگر کیا کرتے قرآن شریف کی بے ادبی نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ دیر بل
کھاتے اور بڑبڑاتے رہے پھر والدہ کو آواز دی۔قینچی لاؤ۔وہ لے آئیں۔
میری آنکھوں کے سامنے سارے حاشیے کاٹ کر چولھے میں جلا دیے اوراس پر
بل کھاتے رہے کہ ترجمہ تو باقی رہ گیا اس میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔''

(مجلّہ بازیافت، رفیع الدین ہاشمی، صفحہ 3، لاہور، 2002)

امیر حسن خاں کی چھ اولادیں ہوئیں جن میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔بیٹوں میں بشیر حسن خاں، رشید حسن خاں اور سعید حسن خاں اور بیٹیوں میں ابین بیگم، حمیدن بیگم اور رضین بیگم تھیں۔

ولادت

میرٹھ کالج میرٹھ کے سابق صدر شعبۂ اُردو اور شاہ جہاں پور سے ہی تعلق رکھنے والے ڈاکٹر خالد حسین خاں نے رشید حسن خاں کا خاکہ تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''چمپئی رنگ جو عالم شباب میں سرخ اور سفید رہی ہوگی، بھرا بھرا جسم، کشیدہ
قامت، چوڑا چکالہ سینہ، اونچی ستواں ناک (جو پورے شاہ جہاں پور کی ناک
ہے) کشیدہ جبیں، سر پر سلیقہ سے سنورے بال، جن پر بیتے موسموں کی برف
نمایاں ہے۔دبیز شیشوں والوں چشمے کے شیشے غور وفکراور خلوص سب مزین
عقابی آنکھیں، پروقار متبسم کتابی چہرہ، صحتِ تلفظ کا وہ عالم گویا لفظوں کو ہمہ وقت
پرکھتے رہتے ہوں۔زبان وبیان کی کلاسیکی روایت کے امین، تحقیق وتدوین کے
مردِ میدان، تہذیب وشائستگی اور شاہ جہاں پور کے افغانی جلال و جمال کی جو
شخصیت ہمارے روبرو آتی ہے وہ ہے جناب رشید حسن خاں۔''

(ادبی تحریریں، ڈاکٹر خالد حسین خاں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2011، صفحہ 57)

رشید حسن خاں کی ولادت تعلیمی اسناد کے مطابق، 10 جنوری 1930 کو شاہ جہاں پور (اُتر پردیش) میں پٹھان خاندان میں ہوئی۔ان کے محلے کا نام بازوزئی ہے، لیکن ان کی تاریخ ولادت جو کاغذی اسناد میں درج ہے غیر معتبر ہے۔کیوں کہ ان کی اصل تاریخ ولادت 25 دسمبر 1925 ہے۔

اس بات کی تصدیق کئی رسائل و کتب سے ہوتی ہے جن میں رشید حسن خاں کی اصل تاریخ ولادت 25 دسمبر 1925 ہی درج ہے۔ چوں کہ خود رشید حسن خاں بھی کئی مواقع پر اس بات کی تردید زبانی و تحریری کر چکے ہیں۔ زبانی تردید کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم کے مضمون ''ممتاز محقق اور متنی نقاد، رشید حسن خاں'' کا یہ اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

> ''آگے بڑھنے سے پہلے میں خاں صاحب کی ابتدائی زندگی کے حالات بیان کردوں۔ شاہ جہاں پور میں ایک صاحب تھے امیر حسن خان، یہ خاں صاحب کے والد تھے۔ تعلیمی اسناد کے مطابق خاں صاحب 10 جنوری 1930 کو پیدا ہوئے مگر انھوں نے ہمیں بتایا تھا کہ ان کی تاریخ ولادت میں سنہ غلط لکھا گیا ہے۔ یہ سنہ 1930 نہیں، 1925 تھا۔''

(ہماری زبان، رشید حسن خاں نمبر یکم تا 28 دسمبر 2006، صفحہ 3، شمارہ نمبر 33، 36، 35، 34 جلد نمبر 65)

رشید حسن خاں کی تاریخ ولادت کے متعلق ڈاکٹر ٹی. آر. رینا (جموں) اپنی کتاب رشید حسن خاں کے خطوط (جلد اول) میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''رشید حسن خاں کی ولادت شاہ جہاں پور کے پشتینی مکان میں ہوئی۔ تعلیمی اسناد میں ان کی تاریخ ولادت 1930 ہے۔ اس کی تصدیق ان کے سوانحی کوائف سے ہوتی ہے جو ''شاعر'' ممبئی کے ہم عصر اُردو ادب نمبر جلد۔1، 98-1997 کے ضمیمے کے صفحہ 194 پر درج ہیں، جسے ڈاکٹر شمس بدایونی نے اپنے مضمون ''رشید حسن خاں کی یاد میں'' ہفت روزہ ہماری زبان دہلی کے ''رشید حسن خاں نمبر یکم تا 28 ستمبر 2006 کے شمارہ نمبر 36, 35, 34, 33 جلد نمبر 65 کے صفحہ 31 میں درج کیا ہے۔
>
> ''جموں یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں خاں صاحب تین بار تشریف لائے۔ ایک ملاقات کے دوران راقم نے ان سے تاریخ ولادت کے بارے میں پوچھا تھا تو انھوں نے پروفیسر شیام لال کالڑا، عابد پیشاوری اور ڈاکٹر ایم۔ ایل پروانہ کی موجودگی میں یونی ورسٹی گیسٹ ہاؤس کے اپنے کمرے میں اپنی تاریخ

پیدائش 25 دسمبر 1925 بتائی تھی۔ راقم اور پروانہ ہر سال انھیں اسی تاریخ پر مبارک باد کے خط لکھا کرتے تھے۔ راقم کبھی کبھی بذریعہ تار بھی مبارک باد کا پیغام بھیج دیا کرتا تھا۔ ہاں پروانہ صاحب انھیں کبھی کبھی جنم دن مبارک کا کارڈ بھیج دیا کرتے تھے۔ اگر ان کے ہاں سے خطوط ضائع نہ ہوئے ہوں تو اس بات کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ راقم نے ان کے فرزند خورشید حسن خاں سے بذریعہ خط دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ خاں صاحب کو خط محفوظ کرنے کا شوق نہیں تھا۔ مگر مجھے یقین نہیں۔ ان کے پاس مشاہیر ادب اور نئے اسکالروں کے مکتوبات کا ایک بڑا ذخیرہ ہونا چاہئے۔ جن پر الگ سے کام کیا جاسکتا ہے۔ پچھلے چند سالوں سے راقم انھیں بذریعہ ٹیلی فون جنم دن کی مبارک باد بھیج دیا کرتا تھا ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا حضور آج کرسمس بھی ہے اس کی مبارک باد بھی قبول کیجئے۔ تو آپ ہنس کے جواب دیتے کہ ہاں میاں ہمیں قبول ہے اور خوش ہوتے، ہمیں بہت سی دعائیں دیتے۔" (قلم سے "اصلاً" دسمبر 1925 لکھا ہے)

(رشید حسن خاں کے خطوط مرتب ڈاکٹر ٹی. آر. رینا، اُردو بک ریویو، نئی دہلی، 2011، صفحہ 21)

اُردو کے اس مایہ ناز محقق، نقاد اور مدون کی تاریخ ولادت کے بارے میں پورے پانچ سال کا امتیاز ہے۔ یہ امتیاز اس لیے بھی آیا کیوں کہ اس وقت معلم بچے کی قد و قامت کے حساب سے رجسٹر میں نام، پتا اور عمر کا اندراج کر لیتے تھے۔ لیکن خود رشید حسن خاں نے اپنی عمر کی صحیح تاریخ ولادت مشہور عالمی ادبی رسالے "بازیافت" مسرت انیس سے قلمی گفتگو کرتے ہوئے یوں بیان کی ہے:

"تعلیمی کاغذات میں تاریخ ولادت 10 جنوری 1930 لکھی ہوئی ہے۔ یہ تاریخ کس نے لکھائی تھی مجھے نہیں معلوم۔ صحیح سال ولادت 1925 ہے۔ دسمبر کا مہینہ، تاریخ کا علم نہیں۔"

(مجلّہ بازیافت، رفیع الدین ہاشمی، صفحہ 157، لاہور، 2002)

تاریخ ولادت کے متعلق خود رشید حسن خاں کے فرزند اکبر خورشید حسن خاں بھی اپنے والد کے قول کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔ رشید حسن خاں نے اپنی عمر کے بارے میں کبھی کسی سے طویل گفتگو

نہیں کی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ خود رشید حسن خاں کے انٹرویو، ہندوستان اور ہندوستان کے باہر اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ان کے علاوہ رشید حسن خاں کی زندگی میں ہی کتاب نما کا خصوصی شمارہ ''رشید حسن خاں حیات اور ادبی خدمات'' جولائی 2002 میں شائع ہو چکا تھا اور یہ رسالہ ان کے اسٹڈی ٹیبل پر سامنے ہی رہتا۔لاہور اورینٹل کالج شعبۂ اُردو کے تحقیقی مجلّہ 'بازیافت'' شمارہ ایک 2002 میں '' کچھ اپنے بارے میں''مسرّت انیس سے خصوصی گفتگو ان کے سامنے منظر عام پر آ چکا تھا۔

رشید حسن خاں کے متعلق ایک اور چونکا دینے والا دعوا ان کے قریبی دوست شبیر عباسی (52، خلیل غربی، شاہ جہاں پور) نے بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ان کے والدین بھی اتنے تعلیم یافتہ نہ تھے کہ میونسپل بورڈ آفس میں اندراج کرایا ہوتا لہٰذا اندازاً 10 جنوری 1930 درج کر دی گئی جو ہر جگہ یہی لکھی جاتی رہی۔ میرے دریافت کرنے پر صحیح تاریخِ پیدائش 10 جنوری 1925 بتائی تھی۔''

(رسالہ نیا دور، لکھنؤ، جلد 62، نمبر 9، صفحہ 45 تا 46، دسمبر 2007)

تعلیم

رشید حسن خاں کی ابتدائی تعلیم محلّے کے مولوی صاحب کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ یہ مولوی صاحب ان کے والد محترم امیر حسن خاں کے بھی اُستاد تھے۔امیر حسن خاں سرکاری اسکولوں کی تعلیم کے خلاف تھے۔کیوں کہ وہاں انگریزی پڑھائی جاتی تھی۔قرآن پاک مکمل ہونے کے بعد رشید حسن خاں کو شاہ جہاں پور کے مدرسہ بحرالعلوم (قائم 1346ھ) میں داخل کرایا گیا۔ان دنوں اس مدرسہ کی شہرت عالم گیر سطح پر تھی۔ دور دراز سے طلبہ یہاں حصولِ تعلیم کے لیے آتے تھے۔مدرسہ کے اُستاد مولوی مجتبیٰ حسن نامور اور جیّد عالم و بزرگ تھے۔ اپنے اُستاد کی شخصیت کا اثر رشید حسن خاں کی ادبی زندگی میں نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔وہ پانچ برس تک 1934 تا 1939 اس مدرسے میں زیرِ تعلیم رہے۔ رشید حسن خاں درسِ نظامی کی تکمیل نہ کر سکے چوں کہ گھر کے مالی حالات اچھے نہ تھے۔ان کے والد نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لیا تھا اور اب ان کو 15 روپے 2 آنے ماہانہ بطور پنشن ملتے تھے۔ جو گھریلو اخراجات کے لیے ناکافی تھے۔مگر رشید حسن خاں کے اندر تعلیم کا ذوق وشوق پیدا ہو چکا تھا۔کتابیں خرید کر پڑھنے کی استطاعت ان کے اندر نہ تھی۔ بہادر گنج (خاں صاحب کے گھر سے آدھا کلومیٹر) میں

واقع شوقین بُک ڈپو سے کتابیں کرایے پر لا کر پڑھتے تھےلیکن شوقین بک ڈپو کے مالک صغیر احمد نے ان کے بچپن کے دوست شفیق احمد کے نسبتی برادر ہونے کے سبب ان سے کتابوں کا کرایہ نہیں لیتے تھے۔تعلیم حاصل کرنے کے دوسرے طریق کار پر رشید حسن خان نے زیادہ زور دیا۔اسی دوران کچھ دوستوں نے فاضل اور دبیرِ کامل کے امتحانات پاس کرنے کا مشورہ دیا۔حکیم سلیم صاحب نے رشید حسن خاں کے فارم بھروائے۔رشید حسن خاں نے ذاتی طور پر اُردو عربی فارسی بورڈ کے امتحان پاس کیے۔لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر کامل(1949 میں اوّل درجے سے پاس)اور عربی فارسی بورڈ الہ آباد(اب اس کا مرکز لکھنؤ میں قائم ہے)سے مولوی کا امتحان امتیازی نمبرات سے پاس کیا۔رشید حسن خاں کے حصولِ تعلیم کے ذوق،شوق اور جنون پر تبصرہ کرتے ہوئے شبیر عباسی لکھتے ہیں:

> ”ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ لؤ ، دھوپ کی جلتی دو پہر میں مدرسہ سے پیدل آنا ان کا روز کا معمول تھا۔اس زمانے میں شاہ جہاں پور میں آمدورفت کے لیے نہ تو کسی سواری کا چلن ہوا تھا اور نہ ہی بجلی وغیرہ کا کوئی معقول بندوبست تھا۔ سڑکوں پر روشنی کے لیے میونسپل بورڈ کی جانب سے لالٹینیں لگی ہوئی تھیں۔گھر میں روشنی کے لیے مناسب انتظام نہیں تھا۔ان کی والدہ پڑھائی کے شوق کو دیکھتے ہوئے کڑوے تیل کے چراغ میں موٹی سی بتی ڈال کر جلا دیتی تھیں۔ دورانِ گفتگو رشید صاحب نے بتایا کہ مجھے جلدی سارے سبق یاد کر لینا پڑتے تھے کہ مبادا چراغ کا تیل ختم نہ ہو جائے۔“

(نیا دور لکھنؤ،جلد62،نمبر9،صفحہ 45،دسمبر 2007)

اس کے بعد رشید حسن خاں نے مدرسہ فیض عام شاہ جہاں پور کے طالب علم کے طور پر جامعہ اُردو علی گڑھ سے ادیب کامل(منعقدہ امتحان ماہ نومبر 1949)اوّل درجے سے پاس کیا۔

ملازمت

گھر میں ذمہ دار فرد ہونے کے سبب گھریلو ذمہ داریاں ان پر سب سے زیادہ تھیں۔اس لیے دوسری عالمی جنگ کے دوران شاہ جہاں پور کی آرڈیننس کلودنگ فیکٹری میں بڑے پیانے پر مزدوروں کی بھرتی شروع ہوئی تو رشید حسن خاں بھی محض 14 برس کی عمر میں 1939 میں اس درزی خانہ میں بحیثیت

مزدور بھرتی ہو گئے۔ فیکٹری میں تین شفٹوں میں کام ہوتا تھا۔ رشید حسن خاں کو رات کی شفٹ میں کام کرنا پڑتا تھا۔ پڑھنے لکھنے کا شوق شروع سے ہی تھا لٰہذا انٹرول میں جب تمام مزدور آرام کرتے تھے تو رشید حسن خاں ''آبِ حیات'' اور ''طلسمِ ہوش رُبا'' کا مطالعہ کرتے تھے۔ فیکٹری کے مزدور صاحبانِ اختیار کے ظلم وزیادتی اور استحصال کے شکار تھے۔ اس فیکٹری میں رشید حسن خاں کی ٹریڈ یونین سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ یہیں پر ان کو ''کامریڈ'' کے لقب سے نوازا گیا۔ خاں صاحب اور ان کے چند ہم خیال ساتھیوں نے مل کر خاموشی سے ٹریڈ یونین قائم کر لی۔ آرڈیننس فیکٹری میں ایسی سرگرمیوں کی کلی طور پر ممانعت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ بڑی جرأت کی بات تھی۔ رشید حسن خاں اس ٹریڈ یونین کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ شروع شروع میں یونین کے اجلاس گھروں میں میلاد اور کیرتن کے بہانے ہوتے تھے۔ بعد میں ان کی سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہونے لگیں۔ 1945 میں اس یونین نے مزدوروں کی حالت زار کے خلاف ہڑتال کرا دی۔ یہ ہڑتال مسلسل 33 دن چلی۔ چوں کہ رشید حسن خاں اس ہڑتال میں پیش پیش تھے اس لیے انھیں اس کی پاداش میں 1946 میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس کی وضاحت خود رشید حسن خاں نے باقر مہدی کے رسالے ''اظہار'' کے شمارہ 5، جنوری 1984 میں یوں کی ہے:

> ''ابتدائی تعلیم عربی مدرسے میں ہوئی تھی اور درس نظامی کے طالب علم کی حیثیت سے شعور نے بالیدگی پائی تھی۔ اچانک 1941 میں ٹریڈ یونین کے دائرے میں آ گیا۔ میرے شہر شاہ جہاں پور میں اس زمانے میں بہت بڑی آرڈیننس فیکٹری تھی جس میں 30 ہزار سے زائد آدمی کام کرتے تھے۔ اس فیکٹری میں پہلی بار چھپ چھپا کر مزدوروں کی یونین بنائی گئی۔ اور پھر 34 دن تک ہڑتال ہوئی۔ یہ 1945 کی بات ہے۔ اس فیکٹری میں 1939 میں مزدور کی حیثیت سے بھرتی ہوا تھا اور اب یونین کے جوائنٹ سکریٹری تھا۔''

(خصوصی شمارہ ''کتاب نما'' مرتبہ اطہر فاروقی، صفحہ 12، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، جولائی 2002)

ٹریڈ یونین کے دوران رشید حسن خاں کا رابطہ یو پی کے بعض کمیونسٹ لیڈروں سے ہوا۔ رشید حسن خاں کو ان کا طرز عمل بالکل پسند نہ تھا۔ کیوں کہ یہ لیڈر اپر کلاس (اعلا درجہ) سے تھے اور مزدور نچلے

طبقے سے تھے۔ ان دونوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق تھا۔ رشید حسن خاں نے ان کی کتھنی اور کرنی میں فرق محسوس کیا۔ ان کا نعرہ تھا کہ ''دنیا کے مزدور ایک ہو جاؤ'' رشید حسن خاں کو اس نعرہ میں کھوکھلا پن اور سیاسی ہتھکنڈہ نظر آتا تھا۔ کیوں کہ ان کی نظر میں ہر ملک اور ہر کارخانے کے اور مزدوروں کے مسائل یکساں نہیں ہوتے۔ پھر وہ سب ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟ آخر کار رشید حسن خاں ان لیڈران کے طرز عمل سے بددل ہو گئے۔ اس کی وجہ رشید حسن خاں یوں بیان کرتے ہیں:

''اپر کلاس سے آئے تھے۔ ان کی توجہ مزدوروں کے مسائل حل کرنے سے زیادہ پارٹی کی آئیڈیالوجی پھیلانے پر زیادہ ہوتی تھی۔ رشید حسن خاں یونین کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ یونین 1945 کے آخر میں فیکٹری میں ہڑتال کرائی جو کسی بھی آرڈیننس فیکٹری میں پہلی باضابطہ اسٹرائک تھی۔ یہ ہڑتال مسلسل 33 روز تک چلی۔ رشید حسن خاں ہڑتال کرانے والوں میں پیش پیش تھے۔ اس لیے انھیں اس کی پاداش میں ملازمت سے نکال دیا گیا۔ یہ 1946 کی بات ہے۔''

(ہماری زبان، خصوصی شمارہ، رشید حسن خاں، تحقیق و تدوین کا مرد میداں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، صفحہ 36، یکم تا 28 ستمبر 2006)

ملازمت سے برخاست ہونے کے بعد رشید حسن خاں نے تین چار برس تک متفرق ملازمتیں کیں۔ یہ دور رشید حسن خاں کے لیے مشکلوں سے بھرا تھا۔ خاں صاحب ایک چکی پر منشی رہے، پھر ایک زمین دار کے کارندے کے طور پر دیہی زندگی کا عملی مشاہدہ کیا۔ راشن کی دکان پر منشی گری بھی کی۔ جیسا کہ میں پہلے ہی تحریر کر چکا ہوں کہ رشید حسن خاں میں تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ تھا۔ اس مالی خلفشار کے زمانے میں بھی انھوں نے ''مولوی'' اور ''دبیر کامل'' کے امتحانات پاس کیے۔ اسی دوران خاں صاحب کو 1949 میں مدرسہ ''فیض عام، شاہ جہاں پور'' میں مدرس کا عہدہ حاصل ہو گیا مگر یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔ کیوں کہ رشید حسن خاں درسِ نظامی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی اسلامی شعار کا اہتمام نہ کرتے تھے۔ مدرسہ کے مہتمم نے کہا ''آپ کو ڈاڑھی رکھنا پڑے گی۔'' خاں صاحب نے ''رشوت کی ڈاڑھی'' رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ خود رشید حسن خاں نے اس کا خلاصہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''طلبہ نے مہتمم مدرسہ سے یہ کہا کہ اُستاد محترم تو داڑھی منڈاتے ہیں، بھلا ہم ان سے کیسے پڑھ سکتے ہیں؟ مہتمم صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ ڈاڑھی تو رکھنا پڑے

گی ورنہ مخالفت زیادہ ہوگی۔ بات ان کی بجائے خود درست تھی مگر میں نے یہ کہا کہ یہ رشوت کی داڑھی ہو جائے گی کہ نوکری کرنا ہے تو داڑھی رکھاؤ۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں داڑھی کی شرعی حیثیت کا معترف تھا اور ہوں لیکن اس وقت گویا ضد کی بات آپڑی تھی۔''

(رشید حسن خاں ایک عبقری شخصیت، ڈاکٹر محمد وسیم رضا، صفحہ 18، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013)

مدرسہ فیض عام شاہ جہاں پور میں ہی ان کو چھوٹے بچوں کو پڑھانے کے لیے دوسری جماعت میں بھیج دیا گیا۔ 1953 میں اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول (موجودہ وقت میں انٹر کالج) میں فارسی عربی کے اُستاد کی جگہ خالی ہوئی اور اسی اُسامی پر شہر کے معزز عالم دین مولوی یوسف صاحب بھی اُمیدوار تھے جو اسلامی شعار کی وجہ سے موزوں اور مناسب تھے۔ انھوں نے رشید حسن خاں کی کامریڈ پرستی کا خوب چرچا اور پروپیگنڈا کیا لیکن اللہ کے فضل اور اسکول انتظامیہ کی حمایت سے رشید حسن خاں کی تقرری عمل میں آئی۔ اس ملازمت کے بارے میں اطہر فاروقی نے ایک دل چسپ واقعہ بیان کیا ہے جو اس طرح ہے:

''اس ملازمت کے سلسلے میں ایک دل چسپ واقعہ یہ ہے کہ اسلامیہ اسکول کی اس جگہ کے لیے ایک عالم اور مرشد بھی امیدوار تھے۔ انھوں نے یہ دیکھا کہ ایک ایسے شخص کو ملازمت ملنے کا امکان ہے جو کمیونسٹوں کے ساتھ برسوں تک کام کر چکا ہے۔ کمیونسٹ دہریے ہوتے ہیں۔ لازماً یہ شخص بھی بے دین ہوگا۔ شہر کی ایک بڑی مسجد میں انھوں نے بعد نماز جمعہ یہ اعلان کیا کہ یہ شخص جو بے دینوں کے ساتھ رہا ہے اور خود بھی بے دین ہے، اسلامیہ اسکول میں اس کو جگہ نہیں ملنا چاہئے۔ مگر ان کی مشکل یہ تھی کہ شہر کے سب سے معروف عالم مولوی محمد مجتبیٰ خاں (مرحوم و مغفور) جو رشید صاحب کے اُستاد بھی تھے وہ رشید صاحب کے لیے کوشاں تھے۔ یوں مرشد موصوف کی آہ و فغاں بے کار گئی۔ البتہ ان کے اس ''اعلان'' کا اثر یہ ضرور ہوا کہ مینجنگ کمیٹی میں جب یہ معاملہ پیش ہوا اور رائے لی گئی تو صرف ایک ووٹ کی بڑھت سے رشید صاحب کو اسکول کی

ملازمت مل سکتی تھی۔ مولوی محمد مجتبیٰ خاں صاحب کی کوشش کے نتیجے میں مینجنگ کمیٹی کے چیئرمین خان بہادر فضل الرحمان خاں صاحب غیر جانب دار رہے تھے ورنہ صورت حال مختلف ہو جاتی۔''

(خصوصی شمارہ کتاب نما، رشید حسن خاں، مرتبہ اطہر فاروقی، صفحہ 10 مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی، جولائی 2002)

رشید حسن خاں نے بریلی آکر ہفتہ وار ''ندرت'' میں بھی نوکری کی۔ ہفتہ وار ندرت کے مالک و مدیر سید ابراہیم حسن رسا تلمیذ دلؔ شاہ جہاں پوری تھے۔ ان دونوں حضرات نے 1948 کو ہفتہ وار ''ندرت'' کا اجرا کیا تھا۔ خاں صاحب بریلی میں ہونے والے مشاعروں میں اکثر شاعروں کا کلام سننے جاتے تھے لیکن انھوں نے ''ندرت'' سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور واپس شاہ جہاں پور آ گئے۔ رشید حسن خاں بریلی میں 1949 کے وسط تک رہے۔

رشید حسن خاں کی دہلی یونی ورسٹی میں تقرری 6 اگست 1959 کو شعبۂ اُردو میں ریسرچ اسسٹنٹ کے عہدے پر ہوئی۔ میں یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ اُردو دنیا کی مایہ ناز شخصیت پروفیسر خواجہ احمد فاروقی جو بڑے مردم شناس تھے وہ رشید حسن خاں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بھانپ گئے اور انھیں شاہ جہاں پور کے پرسکون ماحول سے اپنے شعبۂ اُردو کے ساتھی ڈاکٹر قمر رئیس، متوطن شاہ جہاں پور کی وساطت سے دہلی لانے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن وہ درس و تدریس اور شعبۂ اُردو سے وابستہ اس لیے نہ ہو سکے کیوں کہ ان کے پاس کاغذی اسناد نہ تھیں۔ اس لیے ان کو یونی ورسٹی کی لائبریری میں تحقیق کے شعبۂ میں جگہ ملی۔ یہاں پر رشید حسن خاں عربی اور فارسی کے مخطوطوں کو پڑھتے اور ان کا ترجمہ اُردو میں کرتے تھے۔ اسی شعبہ سے رشید حسن خاں کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ یہیں پر انھوں نے شعبہ کے تحقیقی مجلّے ''اُردوئے معلیٰ'' کی ترتیب و طباعت کا کام بھی کیا۔ اسی مجلّے میں 1961 میں غالبؔ کی فارسی کتاب ''دستنبو'' کا اُردو ترجمہ رشید حسن خاں کا کیا ہوا شائع ہوا۔ شعبہ سے شائع ہونے والی بیش تر کتابوں کی ترتیب رشید حسن خاں کیا کرتے تھے۔ صدر شعبہ اُردو خواجہ احمد فاروقی نے ان کو تحقیقی کام کرنے کے لیے تمام طرح کی سہولتیں فراہم کر رکھی تھیں۔ پہلے یہ عہدہ جز وقتی تھا لیکن 1966 میں اسے کل وقتی منظوری حاصل ہو گئی۔ یہاں رہ کر رشید حسن خاں نے ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جن کے سبب اُردو تحقیق و تدوین کی دنیا میں وہ نہایت مشہور اور محترم ہو گئے اور پوری اُردو دنیا میں ان کی تحقیق

اور تدوینی کارناموں کی دھوم مچ گئی۔

ادبی زندگی کا آغاز

رشید حسن خاں کو رسائل میں لکھنے کا شوق شروع سے ہی تھا۔ان کی ادبی زندگی کو بام عروض بخشنے والوں میں ان کے مدرسے کے اُستاد مفتی مجتبیٰ حسن خاں کا اہم کردار رہا ہے۔رشید حسن خاں نے اپنے ابتدائی زمانے میں نیاز فتح پوری کی تنقیدی تحریروں سے بہت متاثر تھے۔نیاز فتح پوری کے بعد انھوں نے حافظ محمود خاں شیرانی اور قاضی عبدالودو کے تحقیقی مضامین کا بغور مطالعہ کیا۔رشید حسن خاں کے اندر تدوینی صلاحیت امتیاز علی خاں عرشی کی تدوینات کو دیکھنے کے بعد پیدا ہوئیں۔خاں صاحب کو اُردو نقادوں میں کلیم الدین احمد سب سے عزیز تھے۔اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ کلیم الدین احمد کی دوٹوک باتیں انھیں پسند تھیں۔کلیم الدین احمد کے بعد موصوف آل احمد سرور کی تنقید کے بھی مداح تھے لیکن ان کی تنقید میں انھیں انشائیہ کا رنگ نظر آتا تھا۔سید احتشام حسین کی شخصیت سے بھی خاں صاحب بہت متاثر تھے،لیکن ان کی تنقید نے انھیں مایوس کیا۔مجنوں گورکھپوری کی کلاسکی تنقید کی انھوں نے خوب تعریف کی۔ان تمام باتوں کا احاطہ خود رشید حسن خاں نے اپنے مضمون ''کچھ اپنے بارے میں'' کیا جو رسالہ اظہار،ممبئ میں شائع ہوا۔اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''میرے اُستادوں میں قابل ذکر نام مفتی مجتبیٰ حسن خاں صاحب (شاہ جہاں آبادی) مغفور و مرحوم کا ہے،جن سے میں نے عربی پڑھی تھی اور میری تربیت میں نمایاں حصہ انھی کا رہا ہے۔اساتذۂ معنوی کی حیثیت سے شیرانی مرحوم قاضی عبدالودود صاحب،ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم اور مولانا عرشی مرحوم کے نام قابل ذکر ہیں۔ان حضرات کی تحریروں سے میں نے صحیح معنوں میں تحقیق اور تدوین کے آداب سیکھے۔لیکن ان سب سے مقدم نام نیاز فتح پوری کا ہے۔جن کی تحریروں سے ابتدا ہی میں بہت کچھ سیکھا،تشکیک اور خطائے بزرگان سمجھنے کا سبق پہلے سے تھا۔یہ الگ بات ہے کہ جب تحقیق کے باضابطہ طالب علم کی حیثیت سے شیرانی صاحب اور قاضی صاحب کی تحریروں سے استفادہ کیا تو نیاز صاحب کا طلسم ٹوٹ گیا لیکن جو ابتدائی نقوش مرتسم ہو گئے تھے

وہ اب تک کچھ نہ کچھ نمایاں ہیں۔ روایت سے بغاوت اور تشکیک ان میں خاص کر شامل ہیں اسی لیے میں نیاز صاحب کا بہت قائل رہا ہوں۔ کچھ دنوں تک تو معتقدانہ انداز رہا، لیکن پھر وہ بات تو نہیں رہی، رہ بھی نہیں سکتی تھی، لیکن قائل آج بھی ہوں۔ ناقدین میں (بعض اختلافات کے باوجود) میں کلیم الدین احمد کی بہت عزت کرتا ہوں اور ان کی تحریروں کو بہت توجہ سے پڑھتا ہوں۔ سرور صاحب کے مطالعے اور ذہانت کا میں قائل ہوں لیکن ان سے بس شکایت یہ ہے کہ انھوں نے تنقید کو انشائیے سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ تنقید کا رنگ دب سا گیا ہے اور منافقانہ انداز بیان کے لیے بڑی گنجایش پیدا ہو گئی ہے۔ احتشام صاحب سے بہ حیثیت انسان میں بہت متاثر تھا، ایسے شریف انسان بہت کم پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی تنقیدی نگارشات سے کبھی متاثر نہیں ہو سکا۔ خواجہ احمد عباس کی فلموں کی طرح وہ مجھے بے اثر محسوس ہوتی رہیں۔ البتہ مجنوں صاحب کے ذوق اور کلاسیکی ادب کے مطالعے سے ہمیشہ متاثر رہا۔ ناقدین میں کم لوگ شعر کے معاملہ میں مجنوں صاحب کی طرح خوش ذوق ہوں گے۔ ایسا رچا ہوا شعری ذوق کم ملتا ہے۔''

(رسالہ اظہار، شمارہ 5، جنوری، 1984، صفحہ 19 تا 20)

رشید حسن خاں مدرسے میں ملازم تھے تب بھی انھوں نے اعلا درجے کے تنقیدی اور تحقیق مضامین لکھتے تھے۔ اس بات کی تائید خود پروفیسر قمر رئیس نے ''اُردو دنیا'' میں یوں کی ہے:

''1957-58 میں جب میں علی گڑھ میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا اور جامعہ اُردو کا ماہنامہ ''ادیب'' ترتیب دے رہا تھا تو رشید صاحب سے لکھوا کر میں نے کئی مضامین ''ادیب'' میں شائع کیے۔ ان میں ایک مضمون 1857 کی بغاوت پر تھا۔ اسی زمانے میں رشید صاحب نے ''اغلاط اللغات'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون انجمن ترقی ہند کے جریدے ''اُردو ادب'' میں اشاعت کی غرض سے مجھے بھیجا۔ میں نے مضمون آل احمد سرور صاحب مدیر رسالہ کو اس اُمید کے

ساتھ دیا کہ وہ اسے ضرور شامل کریں گے لیکن چار پانچ مہینے تک پاس رکھ کر سرور صاحب نے مضمون پڑھنے کی زحمت نہیں کی۔ کیوں کہ ان کے نام سے بھی وہ آشنا نہیں تھے۔ میں مضمون لے کر اپنے اُستاد معظم رشید احمد صدیقی کے پاس گیا۔ ان سے التجا کی کہ وہ اسے ضرور پڑھیں اور پسند آئے تو سرور صاحب کو ''اُردو ادب'' میں اشاعت کے لیے بھیج دیں۔ وہ انجمن کی مجلس معاملہ کے رکن تھے۔ انھوں نے مضمون پڑھ کر اپنی سفارش کے ساتھ سرور صاحب کو بھجوا دیا اور اس طرح اس طویل تحقیقی مضمون کی پانچ چھ قسطیں ''اُردو ادب'' میں شائع ہوئیں۔ میرا خیال ہے کہ رشید صاحب کا یہ پہلا عالمانہ مضمون تھا جس نے اُردو اہل نظر کو متاثر کیا۔''

(ماہ نامہ اُردو دنیا، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، اپریل 2006، صفحہ 11 تا 12)

رشید حسن خاں کی تحریریں جب ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہونے لگیں تو ان کی شہرت چہار سو ہونے لگی۔ ان کی تحریروں کے سبب ہی ان کو خواجہ احمد فاروقی جیسا قدر شناس انسان ملا۔ دہلی یونی ورسٹی میں رشید حسن خاں کی تقرری کی بھی ایک دل چسپ کہانی ہے جسے ان کے دوست پروفیسر قمر رئیس اپنی تحریر میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''1959 میں میرا تقرر دہلی یونی ورسٹی میں ہو گیا تو صدر شعبہ خواجہ احمد فاروقی نے ایک دن مجھ سے کہا کہ انھیں شعبے کے تحقیقی پروجیکٹ کے لیے ایک ایسے اسکالر کی ضرورت ہے جو عربی اور فارسی سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ میں نے فوراً رشید صاحب کا نام لیا اور ان کے تجربہ علمی کی تعریف کی۔ شاید ''اُردو ادب'' میں انھوں نے ان کا مقالہ پڑھا تھا۔ چند منٹ سوچ کر انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ابھی تار گھر جائیے اور رشید صاحب کو تار دیجیے کہ اگر ڈیڑھ سو ماہانہ (جہاں تک یاد پڑتا ہے یہی رقم تھی) مشاہرے پر انھیں یونی ورسٹی کی یہ ملازمت منظور ہو تو فوراً آ جائیں۔ تار رشید صاحب کو ملا اور وہ دوسرے ہی دن صبح کو دہلی پہنچ کر دریا گنج میں میری قیام گاہ پر آ گئے۔ میں انھیں فاروقی صاحب کے پاس لے کر گیا اور چند روز بعد آ کر انھوں نے ریسرچ اسسٹنٹ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔''

(رشید حسن خاں: رفیق اور دوست، اُردو دنیا NCPUL دہلی، صفحہ 12، اپریل 2006)

رشید حسن خاں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز فکشن کی تنقید کے علاوہ عروض وقواعد پر مضامین لکھ کر کیا۔ یہ مضامین اپنے زمانے کے معیاری اور مشہور ادبی رسالوں میں شائع ہوئے۔ جامعہ اُردو علی گڑھ کے رسالہ ''ادیب'' کے علاوہ ''نگار''، ''الحمراء''، ''نیا دور'' اور ''ایوانِ اُردو'' میں بھی ان کے کئی مضامین شائع ہوئے۔ ان رسائل کے علاوہ گوپال متّل کے رسالے ''تحریک'' میں بھی رشید حسن خاں کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ دہلی آنے کے بعد رشید حسن خاں اور گوپال متّل میں دیرینہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ لیکن تحقیق طلب بات یہ ہے کہ ان کا کون سا مضمون کب اور کس رسالے میں شائع ہوا۔ رشید حسن خاں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1944 سے بتایا ہے۔ رشید حسن خاں کے ابتدائی مضامین تنقیدی نوعیت کے ہیں۔ اس بات کی تصدیق انھوں نے خود ایک انٹرویو میں اس طرح کی ہے:

> ''بھئی یہ تو مجھے اچھی طرح یاد نہیں، لیکن یہ بات خوب یاد ہے کہ میرے لکھنے کا آغاز شاعری کی تنقید سے ہوا تھا۔ شاعری آج بھی مجھے پسند ہے اور تنہائی کے لمحوں میں میں شعری مجموعہ ضرور پڑھتا ہوں۔ وہ میرا بہترین رفیق ہوتا ہے۔ مجھے اپنا ایک پرانا مضمون یاد آتا ہے۔ جو غالباً 1950 میں نگار میں شائع ہوا تھا۔ مضمون کا عنوان تھا ''شبلی کی فارسی شاعری''۔ اسی زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے یا بعد میں ایک مضمون احمد ندیم قاسمی کی قطعات نگاری پر میں نے لکھا تھا۔ تو میرے لکھنے کا آغاز شاعری کی تنقید سے ہوا اور اس سے مجھے اپنے ذوق کی تربیت میں بہت مدد ملی۔''

(ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، رشید حسن خاں نمبر صفحہ 20، یکم تا 28 ستمبر، 2006)

ازدواجی زندگی

رشید حسن خاں نے اپنی ملازمت کے چند سال بعد دہلی کو چھوڑا تو ان کا دل اداس تھا اور آنکھیں نم تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بیش تر وقت دہلی یونی ورسٹی کے جبلی ہال اور گائر ہال میں گزارا تھا۔ البتہ درمیان میں وہ اپنے گھر شاہ جہاں پور جاتے رہتے تھے۔ لیکن زندگی کے موڑ بہت ٹیڑھے میڑھے ہوتے ہیں اور ان پُر کھار راہوں پر چلنے کے لیے ایک عدد جیون ساتھی کی

ضرورت ہوتی ہے۔ رشید حسن خاں کا نکاح نفیس بیگم سے 1944 میں 19 برس کی عمر میں ہوا تھا۔ ان کی شریکِ حیات نے زندگی کے آخری پڑاؤ تک ان کا ساتھ دیا۔ رشید حسن خاں اکثر ملازمت کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتے تھے۔ گھر کی تمام ذمہ داریاں ان کی اہلیہ ہی نبھاتی تھیں۔ خاص طور پر اپنے بچّوں کی پرورش کی ذمہ داری۔ اس طرف سے خاں صاحب بے فکر تھے اور اپنے علمی و ادبی کاموں کو بہ خوبی انجام دیتے رہے۔ ایک بار رشید حسن خاں اپنی اہلیہ کو دہلی لے گئے تھے لیکن نفیس بیگم کو دہلی کی آب و ہوا راس نہ آئی اور 1965 میں واپس شاہ جہاں پور آ گئی۔ 59 برس تک نفیس بیگم رشید حسن خاں کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد 29 مارچ 2003 کو اپنے حقیقی رب سے جا ملیں۔ اپنی شریکِ حیات کے دارِ فانی سے کوچ کرنے کے واقعے کا ذکر رشید حسن خاں نے کسی سے نہیں کیا بالخصوص اپنے ادبی رفقا اور قریبی ساتھیوں سے۔ اس رنج و غم کو انھوں نے اکیلے ہی برداشت کیا۔ ڈاکٹر ٹی. آر. رینا اس واقعہ کو یوں قلم بند کرتے ہیں:

> ''ساری زندگی ہم نے اپنی شریک حیات کی طرف توجہ نہیں دی عمر کا بیش تر حصہ دہلی میں گزار دیا۔ اب اس عمر میں ان کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتا ہوں۔ میری عادت ہے کہ دن غروب ہونے کے بعد کام نہیں کرتا۔ اس وقت اکیلا پن محسوس ہوتا ہے۔ کس سے گفتگو کی جائے؟ میں نے ان کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا تاثر دیکھا جسے میں اندر ہی اندر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ان سے شکایت کی ''خاں صاحب! نہ تو آپ نے کسی خط میں اس المناک واقعہ کا ذکر کیا اور نہ ہی کسی اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی۔ کم از کم ہفت روزہ ''ہماری زبان'' دہلی میں تو یہ خبر چھپ ہی جانی چاہیے تھی۔'' کہا، رینا صاحب کس لیے؟ جانے والا تو چلا گیا اب میں لوگوں کے خطوط کا کہاں تک جواب دیتا۔''

(ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، صفحہ 19 رشید حسن خاں نمبر یکم تا 28 ستمبر، 2006)

اولادیں

رشید حسن خاں کے یہاں چار اولادیں ہوئیں۔ پہلی اولاد جولڑ کی تھی پیدائش کے آٹھ نو مہینے تک حیات رہی۔ اس کے بعد دولڑکے خورشید حسن خاں اور خالد حسن خاں کی ولادت ہوئی۔ سب سے

آخر میں ایک لڑکی نادرہ کی ولادت ہوئی۔ خورشید حسن خاں اس وقت اتر پردیش حکومت کے بیسک ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے جونیر ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ خالد حسن خاں شاہ جہاں پور کے مدرسہ نور العلوم دلازاک میں مدرسہ جدید کاری اسکیم کے تحت ریاضی کے اُستاد ہیں۔ خالد حسن خاں کے روزگار کی جانب سے رشید حسن خاں تاعمر پریشان رہے۔ انھیں کبھی کپڑے کی دوکان تو کبھی آئس کریم فیکٹری لگوائی گئی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ مدرسہ میں ریاضی کی اُستادی کے ساتھ ساتھ انھوں نے گھر پر ایک چھوٹا سا برف خانہ بھی لگا رکھا ہے۔ ساتھ ہی خالد حسن خاں اپنے والد محترم کی تمام چیزوں کو سلیقے سے اسی بیٹھک میں سجا رکھا ہے، جس بیٹھک میں رشید حسن خاں تحقیق و تدوینی کام کیا کرتے تھے (جیسا راقم الحروف نے شاہ جہاں پور جا کر دیکھا)۔ ان کے تمام بچے شادی شدہ زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کی چھوٹی لڑکی نادرہ بیگم کی شادی ڈرافٹ انجینئر مقصود حسن خاں سے 17 اکتوبر 1990 کو ہوئی۔

ریٹائرمنٹ

رشید حسن خاں دہلی یونی ورسٹی میں تقریباً 30 سال ملازم رہے اور یہاں سے 31 دسمبر 1989 کو ریٹائر ہوئے۔ رشید حسن خاں دہلی آئے تو ان کے سامنے مکان اور رہنے کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ یونی ورسٹی نے ان کو کوئی کمرہ الاٹ نہیں کیا تھا۔ یونی ورسٹی نے بعد میں ان کو گائر ہال کے دو کمرے TC-9 الاٹ کیے تھے۔ اس سے پہلے رشید حسن خاں کچھ دن دہلی یونی ورسٹی کے جبلی ہال ہاسٹل بھی رہے۔ ان کے کمرے میں کتابوں کے شیلف، لکھنے پڑھنے کی ایک میز کرسی، ملاقاتیوں کے لیے لائن سے لگی چند کرسیاں موجود رہتی تھیں۔ حسن اتفاق کہ دہلی میں رشید حسن خاں کچھ دنوں کے لیے سالارِ تعلیم اور معمارِ قوم سرسید احمد خاں کے گھر میں رہے۔ اس بات کا خلاصہ ڈاکٹر اسلم پرویز نے خوب صورت انداز میں کیا ہے:

> ''رشید حسن خاں جب دلّی آئے تو پہلے پہل کچھ دنوں ان کا قیام سرسید روڈ پر سرسید کے مکان میں رہا۔ جامع مسجد کے اطراف میں اس وقت ڈی ڈی اے کا وہ بل ڈوزر نہیں چلا تھا جو اور چیزوں کے ساتھ جامع مسجد کے ادبی ٹھکانوں کو بھی ڈھاتا ہوا نکل گیا تھا۔ چناں چہ روزانہ شام کو دہلی کی بیش تر ادبی شخصیتیں اُردو

بازار میں مولوی سمیع اللہ قاسمی کے کتب خانہ عزیزیہ، فلورا ہوٹل، میر مشتاق کے
ارونا ہال اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر قائم بھائی ظہیر کے فرینڈز ٹی اسٹال
المعروف بہ چنڈو خانہ پر جمع ہوتی تھیں۔''

(رشید حسن خاں، کچھ یادیں کچھ جائزے، صفحہ 93، مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، در بھنگا، بہار، 2008)

وفات

رشید حسن خاں 1944 سے لے کر 25 فروری 2006 تک ادبی کاوشوں میں ہمہ تن مصروف رہے۔ مطالعہ کی عرق ریزی سے ان کی آنکھوں کی بینائی کمزور ہوگئی تھی۔ مسلسل بیماریوں نے انہیں تا عمر پریشان کیا۔ رشید حسن خاں کو پہلا ہارٹ اٹیک 1991 میں اور دوسرا ہارٹ اٹیک 27 اپریل 2002 کو ہوا تھا، اس وجہ سے ان کا باہر کا سفر کرنا ناممکن تھا۔ ہارٹ اٹیک کی وجہ سے ان کی انگلیوں پر زیادہ اثر ہوا۔ نتیجتاً تحریری کام متاثر ہوئے، گھٹنوں کے درد سے یہ پہلے ہی پریشان رہتے تھے۔ لیکن موصوف کا حوصلہ علم وادب کے تئیں بلند تھا۔ یہ چراغ کے بجھنے سے پہلے کی تیز روشنی تھی، بستر جو ایک بار پکڑا تو اُٹھ نہ سکے۔ اپنے حقیقی رب سے ملنے کا وقت قریب سے قریب آ گیا۔ انتقال سے ایک دن پہلے (25 فروری 2006) اپنے چھوٹے بیٹے خالد حسن خاں سے مچھلی کھانے کی فرمائش کی لیکن افسوس صد افسوس! کہ وہ دن نہ آ سکا۔ 26 فروری، بروز اتوار 2006 کی شب 2 بج کر 40 منٹ پر انھیں دل کا دورہ پڑا اور روح پرواز کرگئی۔ رشید حسن خاں نے اس دارِ فانی میں 80 سال، دو مہینے اور ایک دن کی زندگی گزاری۔ 26 فروری کی شام 5 بجے باڑوزئی پشاوری قبرستان شاہ جہاں پور میں (رشید حسن خاں کے مکان سے بمشکل 100 قدم دور) ان کی تدفین ہوئی۔ ان کے انتقال پر ملک اور بیرون ملک میں تعزیتی پروگرام منعقد ہوئے۔ کئی ادبی رسائل اور جرائد نے خصوصی شمارے نکال کر انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ رشید حسن خاں کے مقرب شعرا حضرات نے ان کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مولانا عبدالہادی خاں کاوش رامپوری نے ان کی وفات کو ایک قطعہ میں قلم بند کیا ہے:

قطعۂ تاریخِ وفاتِ نیک مرد

2006

رشید حسن خاں بلند ایواں

1427ھ

محقق ادیب اور نقادِ فن
گئے سوئے جنّت رشید حسن
جو کی فکر تاریخ آئی ندا
پسندیدہ سیرت رشید حسن

1427ھ

ایک اور قطعۂ تاریخِ وفات طارقؔ سلطان پوری نے قلم بند کیا ہے۔

''جامع کمالات شخصیات''

2006

اسے صبحِ ازل، دستِ عطا نے
عنایت کی قبائے علم و تحقیق
عطا اُس صاحبِ ذہن رسا کو
ہوئی زیب و ضیاے علم تحقیق
بلند، اس دور میں لاریب تھا وہ
نشانِ ارتقاے علم و تحقیق
ہوا دستِ اجل سے سر نگوں، حیف!
لواے اعتلاے علم و تحقیق
کہیں تاریخِ رحلت اس کی طارقؔ
''وہ خورشیدِ سماے علم و تحقیق''

2006

شخصیت

رشید حسن خاں جس کام کو کرتے اس میں ان کی مردم شناسی کا عکس نظر آتا تھا۔ وہ ہر کام کے لیے کوئی نہ کوئی وقت مقرر کرتے پھر اس کو اسی طے شدہ وقت پر انجام دیتے تھے۔ کام کی مصروفیت کی وجہ

سے ان کا ملنا جلنا دوسرے لوگوں سے کم ہوتا تھا۔اسی وجہ سے رشید حسن خاں پر یہ اعتراض کیا جاتا رہا کہ یہ روکھے انسان ہیں کبھی کسی سے نہیں ملتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔مگر ان سب باتوں سے بے پروا رشید حسن خاں لوگوں سے فراخ دلی سے ملتے۔ان کے پاس ملک اور بیرون ملک سے جو خطوط آتے ان کا بھی جواب دیتے اور اپنی تدوینی و تحقیقی کاوشوں میں بھی مصروف رہتے۔لوگ عام طور پر رشید حسن خاں کی پروقار شخصیت سے گھبرا جاتے تھے۔حالاں کہ رشید حسن خاں نرم گفتار اور شائستہ طبیعت پسند انسان تھے۔ جب کوئی ریسرچ اسکالر ان سے ملنے گائر ہال میں آتا تو اس کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتے اور اس کے مطمئن ہونے تک اس سے نرم لہجے میں گفت و شنید کرتے۔ان تمام باتوں اور جامع کمالات شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا محاکمہ خود رشید حسن خاں کے فرزند اکبر خورشید حسن خاں نے ان لفظوں میں کیا ہے:

> ''والد محترم نے ہر اس شخص کے لیے دروازے کھول رکھے جو ادبی کام کے لیے ان کے پاس آیا۔چاہے کوئی وہ اسکالر یا طالب علم۔طالب علموں کے والد محترم نے صبح کا وقت مقرر کر رکھا تھا۔کئی لوگ ان سے اُردو پڑھنے گھر پر آتے تھے اور وہ ان کو وقت دیتے تھے۔ان کو بے کار وقت برباد کرنے سے سخت نفرت تھی۔وہ کہتے تھے کہ وقت بہت قیمتی ہے اور بہت کم ہے اور کام زیادہ ہے۔والد محترم جنھوں نے اپنی زندگی کا بیش تر حصہ دلی میں گزارا اور وہاں پر بھی انھوں نے بہتوں کو علمی و ادبی تعاون دیا۔اس کے علاوہ انھوں نے لوگوں کی مالی امداد بھی کی، پریشانی وہ کسی کی دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔دہلی میں وہ یونی ورسٹی کے ہاسٹل میں رہتے تھے۔وہاں طالب علموں کی خاص طور پر مدد کرتے تھے اور ان سے بیٹھ کر بات چیت بھی کرتے تھے۔دہلی میں ان سے ملنے والوں میں ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر تنویر احمد علوی خاص لوگوں میں سے تھے۔

(ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، یکم تا 28 ستمبر 2006، صفحہ 11)

رشید حسن خاں اپنی میز پر اچھی خاصی ریز گاری رکھتے تھے تاکہ گاڑی میں سوار ہونے کے بعد کنڈکٹر سے ہونے والی چک چک سے بچا جا سکے اور سفر آرام سے طے ہو جائے۔

رشید حسن خاں نے ہمیشہ طالب علموں اور علم کے دیداوروں کی خوب مدد و ستایش کی۔انھیں

صرف ادبی لوگوں اور ریسرچ اسکالروں سے ملنا پسند تھا۔ ان کے مطابق یہ لوگ اپنا کام سنجیدگی سے کرتے ہیں۔ رشید حسن خاں ان کو کتابوں کے حوالے دیتے اور ان کے مسائل کو حل کرتے تھے۔ طلبہ سے ان قربتوں کے تعلق سے ان کے ادبی دشمنوں نے انہیں بدنام کیا۔ کہا کہ ''دو چار ریسرچ اسکالرس کے تحقیقی مقالے رشید حسن خاں نے ہی لکھے ہیں''۔ ان کی شخصیت ایک ہمہ گیر شخصیت تھی۔ رشید حسن خاں یاروں کے یار اور مددگار تھے۔ ان کے ادبی دشمنوں نے کبھی بھی ان کو اپنے ہم پلّہ نہیں مانا۔ اس کی وجہ ایک یہ تھی کہ ان کے پاس باضابطہ طور پر یونی ورسٹی کی کوئی اسناد نہ تھیں۔ اس کے باوجود بھی وہ کتنی ہی یونی ورسٹیوں میں ایم فل اور ڈی فل کے ممتحن بنائے گئے اور کتنی ہی ادبی انجمنوں، اُردو اداروں، اکادمیوں نے ان کو انعامات و اعزازات سے نوازا۔ ملک اور بیرون ملک زبان اور قواعد کے مسائل کو اپنے عالمانہ خطبوں سے آسان بنایا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ انھوں نے اپنا وقت کبھی برباد نہیں کیا اور اس کی تلقین انھوں نے اپنے تمام ملنے والوں کو بھی کی۔ اس بات کو ڈاکٹر اسلم پرویز نے اس انداز میں تحریر کیا ہے:

> ''رشید حسن خاں یاروں کے یار ہیں۔ منافقت سے انھیں سخت نفرت ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ ان کے بے تکلفی ہے ان سے ان کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ لیکن عام طور پر وہ کم آمیز ہیں۔ اس لیے کس وناکس کے ساتھ ہنسی مذاق تو کیا بات بھی احتیاط سے مختصر کرتے ہیں۔ بعض دوستوں کے ساتھ گاہے گاہے جا کر خود ملاقات کرنا بھی ان کی وضع میں شامل ہے۔ ایک تو ان میں غلام ربانی تاباں مرحوم تھے ان کے علاوہ بیگم ممتاز اور مخمور سعیدی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چوں کہ خاں صاحب ادب کے قدیم سرمائے پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ تنہا اس سمندر کے تمام موتی نہیں چن سکتے۔ اس لیے وہ اپنے ذہن میں طرح طرح کے موضوعات سوچتے رہتے ہیں۔''

(رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے، مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، صفحہ 99، دربھنگہ، بہار 2008)

آپ کی نفاست پسندی، آپ کی ہمہ گیر شخصیت کا آئینہ تھی۔ ہر مرحلہ میں محتاط رہتے تھے۔ عمدہ اور سادہ لباس پسند کرتے تھے۔ موسمِ گرما میں بُش شرٹ، پتلون کے ساتھ چمڑے کے براؤن

سینڈل پہنتے تھے۔ موسمِ سرما میں پوری آستین کی قمیص، پتلون کے ساتھ براؤن لیس والے جوتے پہنتے تھے۔ قمیص ہو یا شرٹ ہمیشہ چیک کی ہی ہوتی تھی اور مضبوط مردانہ کلائی پر ویسٹ اینڈ واچ کمپنی کی گھڑی بندی ہوتی تھی۔ آپ روشنائی قلم سے لکھا کرتے تھے جو اعلا کمپنیوں کے اقواع و اقسام کے ہوتے تھے۔ آپ کی تحریر بہت عمدہ خوش خطی کا اعلا نمونہ تھی۔ آپ کے احباب وغیرہ بھی آپ کی پسند کے قلم آپ کی خدمت میں تحفتاً پیش کرتے رہتے تھے۔ کالی روشنائی سے لکھنا آپ کو بہت مرغوب تھا۔ آپ کی تحریر بہ آسانی پڑھی جاسکتی تھی۔ اسی لیے لاتعداد افراد آپ کی خوش خط تحریر سے محظوظ ہوتے تھے۔

رشید حسن خاں 31 دسمبر 1989 کو دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے ریٹائر ہوئے۔ دہلی میں قیام کے دوران انھوں نے یہاں کی علمی و ادبی فضا میں عالمانہ روایت کو جنم دیا۔ بزرگوں کا احترام، بچّوں سے پیار، لوگوں کی بے لوث خدمت وغیرہ دیگر پہلوان کی شخصیت کو اور پرکشش بناتے ہیں۔ ان کے مزاج کے کھرے پن کی مثال ہر ملنے والے کی زباں پر تھی۔ اسی کھرے پن کو کئی لوگوں نے تنقید کا نشانہ بنایا۔ مگر اس کے برعکس یہ اپنے کاموں میں اتنے غرق ہوئے کہ انھیں فضول باتیں سننے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ ان کے مخالفین نے ملازمت سے سے ریٹائرمنٹ کے بعد گائر ہال خالی کرانے کی سازش بھی کی اور صدر شعبہ اُردو کے طرح طرح سے کان بھی بھرے لیکن اعتدال پسند صدر شعبہ اُردو نے رشید حسن خاں کو گائر ہال میں رہنے کی اجازت شیخ الجامعہ سے دلا دی۔ البتہ رشید حسن خاں دہلی سے مستقل طور پر 2 فروری 1996 کو واپس اپنے آبائی وطن شہر شاہ جہاں پور چلے گئے۔ لوگوں کی بد دلی اور دوہرے کردار کے بارے میں ان کی رائے صاف تھی:

> ''میں 23-22 سالوں سے دہلی میں ہوں اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آج تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کسی شخص کی اصل رائے کیا ہے اس کے برخلاف آپ میرے چھوٹے سے شہر میں چلیے۔ پانچ منٹ میں معلوم ہو جائے گا کہ کسی شخص کی اصلی رائے کیا ہے۔''

(کتاب نما، رشید حسن خاں حیات اور ادبی خدمات، صفحہ 13 مرتب اطہر فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 2002)

رشید حسن خاں نے جب دہلی کو خیر باد کہا تو تمام عمر کی رقابتیں ایک پل میں ان سے دور ہو گئیں اور شاہ جہاں پور جیسے چھوٹے شہر میں وہ سہولیات میسر نہ ہو سکتی تھیں جو قومی راجدھانی دہلی میں

فراہم تھیں۔ان کی بیماری نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا بل کہ روز بہ روز اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ بیماری کی وجہ سے ان کا وزن کم ہونے لگا شاہ جہاں پور سے ممبئی علاج کرانے جاتے تھے۔ممبئی میں پروفیسر عبد الستار دلوی کے گھر پر ٹھہرنے کا انتظام ہوتا تھا، وہیں پر ادبی لوگوں سے ملنا اور ان کو نیک صلاح و مشورہ دینا رشید حسن خاں کا معمول تھا۔انھوں نے اپنی بیماری اور گھریلو مشکلات کا کبھی کسی سے ذکر نہ کیا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اس بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''عمر کے ساتھ ان کی بیماریاں بڑھتی رہیں۔علاج کے وسائل کم ہوتے رہے۔ دہلی سے شاہ جہاں پور منتقل ہوئے اور بستر سے لگ گئے۔ میرے خیال میں دہلی کا چھوٹنا ان کی زندگی کا سب سے الم ناک واقعہ تھا۔دہلی ان کے دل و دماغ میں سما چکا تھا۔ یہاں کی صحبتیں ان کی زندگی کا حصہ بن چکی تھیں۔حالات نے انھیں دہلی چھوڑنے پر مجبور کیا۔ بیوی بچوں میں یقیناً خوش رہے مگر پھر بیوی کا انتقال اور ان کی اپنی بیماری کی بڑھتی ہوئی شدت نے ان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔''

(ہماری زبان رشید حسن خاں نمبر یکم تا 28 ستمبر 2006، صفحہ 2)

عمر کے آخری پڑاؤ پر رشید حسن خاں نے لوگوں سے خط و کتابت کم کر دی تھی۔ چوں کہ اب ادبی رفیق ان سے زیادہ تر فون پر باتیں کرنے لگے تھے۔شاہ جہاں پور کی گرمی اور رشید حسن خاں مچھروں سے بہت پریشان تھے۔اس کا ذکر انھوں نے ارجمند آرا سے کئی بار کیا۔انھیں جتنی بھی پنشن ملتی تھی وہ سب گھریلوں ضروریات پر خرچ ہو جاتی تھی۔ان کے اکاؤنٹ میں کبھی بھی زیادہ رقم جمع نہیں ہو پائی۔خاں صاحب نے بینک کا ATM بھی زیادہ استعمال نہیں کیا۔ ATM کارڈ خود ڈاکٹر ارجمند آرا کے کہنے پر ہی بنوایا جس کی جان کاری ہمیں 17 فروری 2006 کے اس خط سے ہوتی ہے جو رشید حسن خاں نے ارجمند آرا کو رقم کیا تھا:

> ''عزیزہ ارجمند! بہت سی دعائیں۔
>
> ATM کے کاغذ اور کارڈ بھیج رہا ہوں۔احتیاطاً انھیں متعلقہ فرد کو دے دینا۔ بینک کی پاس بک اکتوبر میں بھیجوں گا۔اسی وقت ''ابھی زندہ ہوں' والا فارم بھی بھیجوں گا۔مگر وہ فارم میرے پاس نہیں۔جلدی نہیں۔اکتوبر تک کسی وقت بھیج

دینا۔ ہاں بس یہ ضرور کرنا کہ بیلنس معلوم کر کے مجھے فون پر بتا دینا۔ .D.A کی کوئی زائد قسط شاید ملی ہو مجھے۔ اگر ملی ہوگی تو کام آجائے گی۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ تم وہاں نہ ہوتیں تو میرا کیا احوال ہوتا۔ کبھی ماننا ہی پڑتا ہے کہ کوئی ان دیکھی طاقت کہیں ہے ضرور جو مجھ جیسے ناکارہ لوگوں کے کام بنانے کے لیے ایسے وسیلے پیدا کر دیتی ہے۔ ہائے یگانہ کیا بات کہی ہے:

شش جہت میں ہے ترے جلوۂ بے فیض کی دھوم
کان مجرم ہیں مگر آنکھ گنہ گار نہیں

جیتی رہو اور شاد کا کام کرو... رشید حسن خاں۔''

(رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے، صفحہ 129، مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، دربھنگہ بہار، 2008)

مذکورہ بالا خط سے معلوم ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں کو پیسوں کی سخت ضرورت تھی اور وہ بینک کھاتے کو ATM سے منسلک کرانے کے خواہش مند تھے۔ ''ابھی زندہ ہوں'' والا فارم سال میں تمام پنشنرز کو پُر کرنا لازمی ہوتا ہے لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس خط کو ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا نے ''رشید حسن خاں کے خطوط'' میں شامل نہیں کیا ہے (ممکن ہے جلد دوم میں شامل کیا جائے)۔ شاید اس کی کاپی رینا صاحب کو دستیاب نہ ہو سکی ہو۔ ارجمند آرا کے نام آخری خط رینا صاحب نے 14 جنوری 2003 کو شامل کیا ہے۔ جب خاں صاحب کو DA کی قسط مل گئی اور ان کے کھاتے میں 13 ہزار سے زائد رقم ہو گئی تو انھوں نے ارجمند آرا کو فون کر کے یہ معلوم کیا کہ کہیں بینک کی غلطی سے کسی دوسرے کی رقم ان کے کھاتے میں ٹرانسفر تو نہیں ہو گئی ہے۔ رشید حسن خاں کی اس سادگی اور بے تکلفی کو ارجمند آرا نے یوں تحریر کیا ہے:

''پاس بک جب پُر کرا کے بھیجی تو گھبرا کر انھوں نے فون کیا کہ شاید کوئی غلط اینٹری ہو گئی ہے۔ اس میں تقریباً 13 ہزار روپئے زیادہ جمع ہو گئے ہیں اور اتنے روپئے تو میرے کھاتے میں کبھی جمع نہیں رہے۔ مجھے ہنسی بھی آئی اور دکھ بھی ہوا۔ تیرہ ہزار روپئے کیا واقعی اتنی بڑی رقم ہے کہ یک مشت ان کے ہاتھ میں نہ رہے۔ میں نے یونی ورسٹی جا کر معلوم کیا تو پتا چلا کہ Arriars جمع ہو گئے تھے۔ خاں صاحب کو بتایا تو بڑے خوش ہوئے کہ روپوں کی بڑی ضرورت تھی اور

یہ غیبی مدد کی طرح پہنچے۔‘‘

(رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے، صفحہ 129 مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، دربھنگہ، بہار، 2008)

کھیلوں سے دل چسپی

رشید حسن خاں ہاکی کے کھیل کو ترجیح دیتے تھے کیوں کہ وہ خود بھی ہاکی کے اچھے کھلاڑی رہے ہیں۔شیواجی اسٹیڈیم دہلی میں ہونے والے ہاکی میچوں کو وہ اکثر دیکھنے جاتے تھے۔ہاکی میچوں میں ان کو اتنی دل چسپی تھی کہ ان کو اس کھیل کی باریکیاں تک معلوم تھیں۔اس کھیل کو رشید حسن خاں قوتِ ارادی کا کھیل تسلیم کرتے تھے۔اس کے علاوہ موصوف اپنے کمرے میں عمدہ ریڈیو سیٹ اور ٹیپ ریکارڈر کا استعمال غزل سننے کے لیے کرتے تھے۔موڈ کو بدلنے کے لیے کبھی کبھی مشاعرہ بھی سن لیا کرتے تھے۔ان باتوں کا تذکرہ ٹی۔آر۔رینا نے اپنی مرتب کردہ کتاب ’’رشید حسن خاں کے خطوط‘‘ میں کچھ اس طرح کیا ہے:

> ’’خاں صاحب کو کھیل کود کا بھی شوق تھا۔ہاکی ان کا پسندیدہ کھیل تھا۔شاہ جہاں پور میں یہ کھیل کافی مقبول رہا۔قومی سطح کے اچھے کھلاڑی یہاں سے منظر عام پر آئے۔خاں صاحب نے خود یہاں کی ہاکی ٹیم میں دس سال کھیلا۔گو کوئی زیادہ نام نہیں کما سکے۔شاہ جہاں پور سے جب دہلی آئے اور یہاں یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں انھیں ملازمت ملی تو انھیں یہاں بڑے ٹورنامنٹ دیکھنے کا موقع ملا۔اب ان کا زیادہ وقت یہ کھیل دیکھنے میں صرف ہونے لگا۔ان کے دوسرے پسندیدہ کھیل فٹ بال، والی وال، باسکٹ بال اور کبڈی تھے۔ان میں انھوں نے خود بھی حصہ لیا۔کرکٹ سے انھیں کوئی شغف نہیں تھا۔فٹ بال کا ورلڈ کپ جب شروع ہوتا تو خاں صاحب اسے شوق سے ٹی وی پر دیکھتے۔اس کا انھیں انتظار رہتا۔ان کھیلوں کے دیکھنے سے ان کے ادبی کاموں پر کبھی کوئی اثر نہیں پڑا۔‘‘

(رشید حسن خاں کے خطوط، مرتب ٹی۔آر۔رینا، صفحہ 26، اُردو بک ریویو، دہلی 2011)

خود رشید حسن خاں نے باقر مہدی کے رسالے ’’اظہار‘‘ کے شمارہ 5، جنوری 1984 میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ وہ کھیلوں کی باریکیوں سے نہ صرف واقف ہیں بل کہ وہ خود اسپورٹس مین بھی رہے ہیں:

> ’’مشاغل میں سرفہرست اسپورٹس کو رکھنا چاہیے۔ہاکی خود کھیلی ہے۔اس لیے وہ

میرا پسندیدہ کھیل ہے۔اس کھیل میں جوفن کارانہ دقت پسندی ہوتی ہے اس کا
میں عاشق ہوں۔اس کے بعد باسکٹ بال، والی بال اور فٹ بال کا نمبر ہے۔
میں ابھی اپنے وقت کا اچھا خاصا حصہ ان کھیلوں میں صرف کرتا ہوں۔''

(کتاب نما خصوصی شمارہ رشید حسن خاں حیات اور ادبی خدمات، مرتب اطہر فاروقی، صفحہ 12، مکتبہ جامعہ، جولائی 2002)

معمولاتِ زندگی

رشید حسن خاں وقت کی پابندی ہمیشہ کرتے تھے۔وقت کی پابندی ان کے معمول کا ایک لازمی حصہ تھی۔علی الصباح 5 بجے بستر چھوڑ دینا ان کا معمول تھا۔ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد چاہے موسم کیسا بھی ہو نہانا لازمی تھا۔چائے اور ناشتے کا وقت 8 بجے مقرر تھا۔چائے بغیر دودھ اور شکر کے پیتے تھے۔دوپہر کے کھانے کا وقت 1 بجے مقرر تھا۔جوانی میں تو وہ ہر قسم کا کھانا کھالیا کرتے تھے لیکن 1983 کے بعد سے ہلکا کھانا لینے لگے تھے۔اس کی خاص وجہ دل کا مرض اور شوگر کی بیماری تھی۔انڈا، مکھن، مسالے اور روغنی اشیا انھوں نے ترک کر دی تھیں۔البتہ گوشت میں مچھلی انھیں خوب پسند تھی۔

شوق

رشید حسن خاں چائے پینے کے بے حد شوقین تھے۔پہلی چائے بہت سویرے لیمن والی، پھر سادہ چائے۔اکثر ہوٹلوں اور دوسروں کے گھروں کی چائے پینا وہ پسند نہیں کرتے تھے۔جو چائے دودھ اور شکّر ملا کر جوش دے کر تیار کی جاتی تھی، رشید حسن خاں اسے اونٹا ہوا کاڑھا یا جوشاندہ کہتے تھے۔چائے سے متعلق ایک واقعہ مجھے احسن قدوائی (اُردو اکادمی، لکھنؤ میں ملازم) نے بتایا کہ رشید حسن خاں اکادمی کے ممبر ہونے کے ناتے اکثر لکھنؤ آتے تھے۔پروفیسر محمود الٰہی صاحب سے رشید حسن خاں عمدہ چائے پلانے کا مطالبہ ہمیشہ کرتے تھے لیکن چائے بازار سے منگوا کر پلا دی جاتی تھی۔اس حرکت پر رشید حسن خاں اُردو اکادمی لکھنؤ کے اہل کاروں پر بہت ناراض ہوتے۔رشید حسن خاں نے اکادمی میں آئندہ آنے کے لیے عمدہ چائے پیش کرنے کی شرط رکھی۔ان کی شرط مان لی گئی اور احسن قدوائی کو اس خدمت پر معمور کیا گیا۔احسن قدوائی اپنے گھر سے کیتلی میں عمدہ چائے بنوا کر لے آئے۔جب میٹنگ میں رشید حسن خاں کے سامنے چائے پیش کی گئی تو انھوں نے برجستہ کہا، ''محمود صاحب! اب جب بھی آپ مجھے یاد کریں گے میں حاضر ہو جاؤں گا۔'' اور احسن قدوائی کو عمدہ چائے پلانے کا شکریہ ادا کیا۔چائے کے

علاوہ انہیں کافی پینا بھی پسند تھا۔اس کے لیے دو جگہیں مقرر تھیں۔ایک کناٹ پیلس والا کافی ہاؤس اور دوسرا دہلی یونی ورسٹی کا کافی ہاؤس۔یونی ورسٹی کے کافی ہاؤس کے بیرے ان کی طبیعت سے خوف واقف تھے۔مہینے کی آخری تاریخوں میں بیرے نے کبھی بھی بل رشید حسن خاں کو لاکر نہیں دیا۔ان کے پاس اگر پیسے ہوئے تو ادا کر دیے نہیں تو اُٹھ کر چلے آتے۔رشید حسن خاں بل کی ادائیگی اگلے مہینے کی تاریخوں میں کرتے۔کافی ہاؤس کا ایک بیرا ان کا خاص خیال اور احترام کرتا۔جتنے پیسے اس نے کہے رشید حسن خاں نے فوراً ادا کر دیے اور حساب کتاب کبھی معلوم نہیں کیا۔کافی ہاؤس میں اکثر اکیلے بیٹھتے۔انھیں لوگوں کے ساتھ بیٹھنا اور فضول باتیں کرنا ناپسند تھا۔تنہائی میں ان کے ذہن میں ہمیشہ ادبی کام ہی گردش کرتے رہتے تھے۔ان کی سوچ اسی حالت میں پروان چڑھتی۔کافی کی ہلکی چسکیاں ان کے چودہ طباق کو اور روشن کر دیتی اور طرح طرح کے ادبی پلان ایسے ہی موقعوں پر عمل میں آتے۔چائے اور کافی کے علاوہ رشید حسن خاں کو ایک ایسا شوق اور بھی تھا جس کا خلاصہ حیران کن ہے۔دراصل رشید حسن خاں کبھی کبھار عمدہ اور اعلا درجے کی وہسکی پینے کا شوق رکھتے تھے۔یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ میں رشید حسن خاں کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی نہیں کر رہا ہوں بل کہ ان کے معمولاتِ زندگی کے چند اوراق قارئین کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔اس حیرت انگیز باب کا خلاصہ ڈاکٹر ٹی۔آر رینا نے کافی دل چسپ انداز میں یوں کیا:

> ”خاں صاحب کا ایک اور عزیز شوق تھا۔بڑھیا کوالٹی کی وہسکی۔راقم نے انھیں جموں یونی ورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں یہ شوق فرماتے ہوئے دیکھا۔شام کے وقت جب ہم تینوں (پروفیسر شیام لال کالڑا، ڈاکٹر ایم ایل پروانہ اور راقم) کے علاوہ کوئی نہ ہوتا تو گیسٹ ہاؤس کا خان ساماں ان کے کمرے میں برف کے پیس، پانی سلاد وغیرہ رکھ دیتا۔خاں صاحب اپنے ہاتھ سے خود اپنا پیگ بناتے، گلاس میں وہسکی، پانی اور برف ڈال کر اسے بھر لیتے۔دھیرے دھیرے ایک ایک گھونٹ لیتے اور باتیں کرتے جاتے۔گفتگو صرف ادبی ہوتی یا کبھی کبھار سیاسی معاملات پر بھی بات چیت کر لیتے۔مولانا ابوالکلام آزاد جس طرح صبح چائے پیتے ہوئے ایک گھونٹ سے دوسرے گھونٹ تک زیادہ وقفہ لیتے تھے

ٹھیک اسی طرح خاں صاحب کا وقفہ ایک گھونٹ سے دوسرے گھونٹ تک کافی طویل ہوتا۔ تین پیگ سے زیادہ میں نے انھیں کبھی پیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس دوران وہ کسی دوسرے شخص سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ گیسٹ ہاؤس کے چوکی دار یا خان ساماں کو خاص ہدایت ہوتی تھی۔ پروفیسر عابدؔ اور پروانہ صاحب دونوں اس کا شوق رکھتے تھے۔ مگر احتراماً انھوں نے اس معاملے میں خاں صاحب کا کبھی ساتھ نہیں دیا۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط، مرتب ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا، صفحہ 26، اُردو بک ریویو، فروری 2011)

ادبی کاوشیں

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ علالت کے دوران بھی آپ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہے اور تمام حضرات سے یہی کہتے کہ ابھی کئی اور کام کرنے باقی ہیں۔ زندگی کے آخری دنوں میں وہ ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' نامی کتاب مرتب کر رہے تھے۔ گنجینۂ معنی کا طلسم ایک نوع کی ''دیوانِ غالب کی فرہنگ'' ہے۔ اس کتاب کے تقریباً 750 صفحات ''انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی'' کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم (اب سکریٹری اطہر فاروقی ہیں) کمپوزنگ بھی کرا چکے ہیں اور اس کا کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے۔ رشید حسن خاں کے بڑے صاحبزادے خورشید حسن خاں سے معلوم ہوا کہ ''انجمن ترقی اُردو ہند'' والے اس کا صحیح معاوضہ دینے میں آنا کانی کر رہے ہیں۔ لیکن خورشید حسن خاں نے راقم الحروف سے دوران گفتگو کہا کہ والد محترم کے انتقال کے بعد 1750 صفحات (اصل مسودہ) ہم نے انجمن کو دیا تھا۔ بار بار اصرار کرنے کے باوجود بھی انجمن کوئی جواب نہیں دے رہی ہے۔ اب تو انجمن کے ملازمین اور رشید حسن خاں کے شناساؤں نے ہم سے بات کرنی بھی بند کر دی ہے۔ اب یہ کتاب (جلد اول) انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے باہمی اشتراک سے دسمبر 2017 کو منظر عام پر آ چکی ہے۔ اس کی دوسری جلد دسمبر 2018 کو اسی ادارے سے شائع ہوئی ہے اور اُمید ہے کہ تیسری اور آخری جلد بھی 2019 تک منظر عام پر آ جائے گی۔ اس کے علاوہ ایک اور کتاب ''غرائب اللغات'' (تدوین) بھی زیر ترتیب تھی جو مکمل نہ ہو سکی۔ رشید حسن خاں ''امراؤ جان ادا'' کی بھی تدوین کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ خاں صاحب کی دلی خواہش علامہ اقبال کے کلام کی صحیح ترتیب و تدوین کرنے کی تھی۔ اس سلسلے میں

انھوں نےپروفیسر رفیع الدین ہاشمی کی مدد سے اچھا خاصا مواد بھی اکھٹا کرلیا تھا۔اس سلسلے میں آپ اپنے پاکستانی ادبی دوستوں سے مشورہ بھی کرتے رہتے تھے۔اس کا ذکر خود لاہور یونی ورسٹی کے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے اپنی تحریر میں کیا ہے:

''البتہ حیات مستعار کے آخری برس (2005 میں) انھوں نے ڈاکٹر خلیق انجم کی تحریک و تجویز پر کلیات اقبال اُردو کی تدوین کا پختہ عزم کرلیا تھا اور معاونت کے لیے خاں صاحب نے اس ناچیز کو شریک تدوین کیا تھا۔ ہم نے اس کام کا ایک نقشہ بنایا۔ طریق کار طے کیا۔ میں نے انھیں ضروری کتابیں، کلام اقبال کی بعض بیاضیں اور متفرق لوازمہ بھیجا۔ خاں صاحب کے ایک مداح اور نیاز مند جناب عبدالوہاب خاں سلیم ہر طرح سے ان کی حوصلہ افزائی کررہے تھے۔ مگر خرابیِ صحت کے سبب یہ کام شروع کرنے میں تاخیر ہوتی رہی۔ راقم کے نام ایک خط میں عید الاضحیٰ کے بعد یہ کام بالفصل شروع کر دینے کا عزم ظاہر کیا تھا۔ (ممکن ہے آغاز کر بھی دیا ہو) وہ طویل عرصے سے متعدد عوارض کا شکار چلے آرہے تھے۔ ذیابیطس، عارضۂ قلب اور بے خوابی ایک زمانے میں پھیپھڑوں کی خرابی میں بھی مبتلا رہے۔ 16 دسمبر 2005 کے ایک خط میں لکھا ''سردی کا موسم مجھے راس نہیں آتا۔ اب پچھلے مہینے کے اواخر سے احوال یہ ہے کہ سر جھکا کر ذرا دیر بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ ریزش، چھینکیں اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے۔ لکھنا پڑھنا بند ہے۔'' اس کے باوجود عزم یہ تھا کہ میں اقبال والے کام کو مثالی کام کے طور پر مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں دو سال تو لگ جائیں گے۔ راقم خوش تھا کہ خاں صاحب جیسے محقق اور نقاد نے اقبالیات کی جانب اعتنا کیا ہے۔ اسے میں نے اقبالیات کی خوش قسمتی جانا لیکن کیا خبر تھی کہ یہ خوشی عارضی ہوگی اور وہ اقبالیات تو ایک طرف دنیائے فانی ہی سے منھ موڑ کر، اُردو ادب خصوصاً دنیائے تحقیق و تدوین اور اپنے مداحوں اور قدر دانوں کو سوگوار کر جائیں گے۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور ان کی روح کو آسودہ رکھے۔ آمین۔''

(ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو ہند، خصوصی شمارہ رشید حسن خاں کیم تا28 ستمبر، 2006، صفحہ 35 شمارہ نمبر 36, 35, 34, 33 جلد نمبر 65)

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رشید حسن خاں ادبی مصروفیات میں منہمک رہتے تھے۔ وہ کسی بھی کام کی تہہ تک جانے کے بعد ہی اس کو اپنے ہاتھ میں لیتے تھے۔ چاہے اس کے لیے انھیں برسوں انتظار ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ تحقیق ہو یا تدوین یا تنقید پوری عرق ریزی سے کام کرنا ان کا دل چسپ اور محبوب ترین مشغلہ تھا۔ کسی بھی کتاب کا اول عکس دیکھنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ اسی لیے ان کی شہرت ایک تدوینی Legend کی ہے۔ پروفیسر گیان چند جین نے ان کی تدوینی صلاحیتوں کے مدنظر انھیں ''خدائے تدوین'' کے لقب سے یاد کیا۔ کیوں کہ خاں صاحب کا ماننا تھا کہ ہم سے پہلے جو کچھ کہا جا چکا ہے اس کو از سرِ نو زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی جائے اور اگر کوئی نیا پہلو نظر آئے تو اس کو بھی اُجاگر کیا جائے۔ یہی نہیں پہلے جو کچھ سچ سمجھا جاتا رہا ہے اگر وہ غلط ثابت ہو جائے تو اسے سب کے سامنے لایا جائے۔

رشید حسن خاں کی تحقیقی، تدوینی اور تنقیدی کارناموں اور کارگزاریوں کے سبب حافظ محمود خاں شیرانی، امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود کے بعد ان کا شمار سب سے اہم اور ممتاز محقق و مدون کے طور پر ہوتا ہے۔ خاں صاحب نے تحقیق میں حافظ محمود خاں شیرانی کو معلم اول قرار دیا ہے۔ تدوین میں وہ خود کو امتیاز علی خاں کا تلمیذ معنوی سمجھتے تھے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے حافظ محمود خاں شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی تحریروں میں تحقیق کے آداب سیکھے اس لیے ان چاروں حضرات کو میں اپنا معنوی اُستاد مانتا ہوں۔

رشید حسن خاں کو زبان اور قواعد پر عبور حاصل تھا۔ ملک اور بیرون ملک کی مختلف یونی ورسٹیوں میں وہ زبان و قواعد کی سیریز پر خطبہ دینے جاتے تھے۔ کئی یونی ورسٹیوں میں وہ ویزیٹنگ فیلو بھی رہے۔ جس سے ان کی شہرت بام عروج کو پہنچی۔ اُردو اِملا کے موضوع پر رشید حسن خاں کی کتابیں ''اُردو اِملا''، ''زبان و قواعد''، ''انشاء اور تلفظ''، ''اُردو کیسے لکھیں''، ''عبارت کیسے لکھیں'' وغیرہ اہمت کی حامل ہیں۔ انھوں نے صرف بڑوں کے لیے ہی نہیں نوجوانوں اور بچوں کے لیے بھی کئی کتابیں لکھیں۔ مثلاً ''اُردو کیسے لکھیں''، ''عبارت کیسے لکھیں'' وغیرہ۔ بہ حیثیت محقق ان کی یہ کتابیں ان کے نقطۂ نظر کی بخوبی وضاحت کرتی ہیں۔

رشید حسن خاں ایک خوش گفتار، سلیقہ شعار اور نفیس انسان تھے۔ اصول پرست، صاف گو اپنے

مقاصد اور اہداف علمی میں یکسوئی، ہر طرح کی مصلحتوں، منافقتوں، ریاکاریوں اور کج روی سے بے زار، ان کی باتیں بہت کھری کھری اور اسلوب واضح اور دوٹوک ہوتا تھا۔ خشک سے خشک موضوع اور مسئلہ کو بھی اپنے سلیس اور سادہ مگر علمی انداز اور انہماک سے اس طرح واضح کرتے کہ زیر بحث نکتہ قاری کے ذہن نشیں ہو جاتا۔ چوں کہ باقاعدہ درس اور تدریس کا اولین موقع انہیں اپنی ابتدائی دورِ زندگی میں صرف شاہ جہاں پور میں ملا۔ لیکن اس کے بعد دہلی یونی ورسٹی کی ملازمت کے دوران انھیں متعدد سیمناروں میں لیکچر دینے کے لیے اور ادبی جلسوں میں تقریر کرنے کے بہت مواقع ملے۔

رشید حسن خاں تحقیق کرتے کرتے تدوین کے میدان میں بھی جوہر دکھانے لگے۔ انھوں نے متنی تنقید کے بنیادی مسائل پر اہم کتابوں کا بڑی عرق ریزی سے مطالعہ کیا اور اس میدان میں ان کی پہلی کتاب ''فسانۂ عجائب'' ہے۔ اس کے علاوہ رشید حسن خاں نے ''باغ و بہار''، ''مثنوی گلزار نسیم''، ''مثنوی سحر البیان''، ''مثنویاتِ شوق'' جیسی اہم کلاسیکی ادب کی کتابوں کے تنقیدی اڈیشن بھی تیار کیے۔ یہ تمام کتابیں مولوی عبدالحق سیریز کے تحت ''انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی'' سے شائع ہوئیں۔ ان کتابوں کے علاوہ رشید حسن خاں نے ''انتخاب ناسخ''، ''انتخاب سودا''، ''انتخاب شبلی''، ''انتخاب نظیر اکبر آبادی''، ''انتخاب مراثی انیس و دبیر'' وغیرہ بھی مرتب کر کے شائع کیں۔ ان کتابوں کے علاوہ رشید حسن خاں نے دو اور اہم کتابیں بھی مرتب کیں۔ جو ''مصطلحات ٹھگی'' اور ''زٹل نامہ'' ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ، ''تلاش و تعبیر'' اور ''تفہیم'' جیسی معرکہ کی کتابیں بھی لکھیں۔ یہ کتابیں ہمیں رشید حسن خاں کے تحقیقی، تدوینی اور تنقیدی نظریات کو سمجھنے میں آسانی پیدا کرتی ہیں۔ اب میں رشید حسن خاں کی تخلیقی و تدوینی کاوشیں اور ان کو ملے اعزاز و انعامات، وزیٹنگ فیلو اور ادبی تقاریر کا محاسبہ کرنے کی سعی کروں گا۔ رشید حسن خاں کی مطبوعات کی فہرست درج ذیل ہے۔

تصنیفات / تالیفات / تدوینات

1. انتخاب نظیر اکبر آبادی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1970
2. انتخاب مضامین شبلی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1971
3. انتخاب مراثی انیس و دبیر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1971
4. دیوان درد مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 1971
5. انتخاب سودا مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1972

6. انتخاب ناسخ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1972
7. اُردو اِملا ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی، 1974
8. اُردو کیسے لکھیں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1975
9. زبان اور قواعد (لغت، تلفظ، اور قواعد شاعری) ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی، 1976
اشاعت اول 1976، اشاعت ثانی 1983
10. ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ ایجوکیشن بک ہاؤس، اشاعت اوّل، 1978
11. دیوان حالی (تدوین) اُردو اکادمی دہلی، کشمیری گیٹ، دہلی، 1987
12. تلاش و تعبیر (تنقیدی مضامین) دہلی اُردو اکادمی کی اعانت سے 1988
13. فسانۂ عجائب (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی 1990
انجمن ترقی اُردو، لاہور، 1990
دہلی اشاعت ثانی 1996
اشاعت سوم، 2002
14. باغ و بہار (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 1992
انجمن ترقی اُردو، لاہور، 1992
15. حیاتِ سعدی (تعارف) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1992
16. تفہیم (تنقیدی اور تحقیقی مضامین) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1993
17. انشاء اور تلفظ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1994
18. عبارت کیسے لکھیں؟ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1994
19. انشائے غالب مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1994
20. مثنوی گلزار نسیم (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 1995
21. انتخاب کلام ناسخ کراچی، پاکستان، 1996
22. مثنویات شوق (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 1998
23. تدوین، تحقیق، روایت ایس۔ اے۔ پبلی کیشنز، دہلی، 1999

24. مثنوی سحرالبیان (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 2000
25. اِملائے غالب غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2000
26. انتخاب نظیر اکبرآبادی (ہندی) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 2001
27. مصطلحات ٹھگی (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 2002
28. کلیات جعفرزٹلی (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 2003
29. کلاسیکی ادب کی فرہنگ (جلداول) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 2003
30. ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری کچھ ان کی زبانی انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 2009
31. دہلی کی آخری شمع (پیش لفظ) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 2009
32. گذشتہ لکھنؤ (مقدمہ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 2011
33. مقدمہ شعروشاعری مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 2013
34. گنجینۂ معنی کا طلسم (جلداول) غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، 2017
35. گنجینۂ معنی کا طلسم (جلددوم) غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، 2018
36. گنجینۂ معنی کا طلسم (جلدسوم) غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، 2019

رشید حسن خاں تقریباً 37 برس تک دہلی میں رہے۔اس لحاظ سے انھوں نے ایک طویل ادبی زندگی یہاں گزاری۔ بِرصغیر کے ادبی حلقوں میں ان کو انتہائی عزت واحترام حاصل تھا۔اس لیے بِرّصغیر کی مختلف یونی ورسٹیاں اپنے یہاں رشید حسن خاں کو لیکچر دینے کے لیے مدعو کرتی تھیں۔جن اداروں، شعبوں اور سیمناروں میں رشید حسن خاں نے صحتِ اِملا، اصول تحقیق، زبان وقواعد، مشرقی شعریات اور قواعد شاعری کے علاوہ دوسرے موضوعات پر خطبہ دیے ان کی ترتیبِ فہرست درج ذیل ہے:

1. انٹرنیشنل نیاز سیمنار کراچی، پاکستان، 1984
2. اصول تحقیق (5 لیکچر) شعبۂ اُردو، ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی 24 تا 28 فروری 1986
3. مولانا آزاد سیمنار ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی، 1989
4. مشرقی شعریات (6 لیکچر) شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی نومبر 1991
5. مشرقی شعریات (3 لیکچر) جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، دہلی

6. اصول تحقیق (3 لیکچر) جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، دہلی
7. اصول تدوین پر (3 لیکچر) جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، دہلی
8. نیاز لیکچر کے سلسلے میں ایک ہفتے کے لیے کراچی، پاکستان 29 نومبر 1991 سے آگے
9. تصوف اور تحقیق (1 لیکچر) اورینٹل کالج، لاہور پاکستان 1992
10. اخلاقیات تحقیق (1 لیکچر) خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ 24 جولائی 1993
11. مشرقی شعریات پر (3 لیکچر) شعبۂ اُردو، ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی ستمبر 1995
12. کلاسیکی ادب کی تفہیم (3 لیکچر) شعبۂ اُردو، ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی ستمبر 1995
13. تین سو سالہ جشن یادگار اورنگ آباد مہاراشٹر شاہ سراج اورنگ آبادی
14. شیرانی سیمنار خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ
15. اصول تدوین سیمنار خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ
16. چکبست سیمنار مہاراشٹر اُردو اکادمی، ممبئی
17. دکنی ادب سیمنار ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی
18. عوامی ادب سیمنار شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی، دہلی
19. نصابِ تعلیم سیمنار دہلی اُردو اکادمی، دہلی
20. اصنافِ ادب سیمنار دہلی اُردو اکادمی، دہلی
21. دلّی والے، دہلی اُردو اکادمی، دہلی
22. فانی سیمنار الٰہ آباد
23. نیاز سیمنار یو پی اُردو اکادمی، لکھنؤ
24. سیماب سیمنار سینٹ جانس کالج، آگرہ
25. جوش سیمنار شیعہ کالج، لکھنؤ
26. جوش سیمنار یو پی اُردو اکادمی، لکھنؤ
27. انٹرنیشنل غالب سیمنار، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی
28. دکنی ادب سیمنار، شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی، دہلی

29. انٹر نیشنل اِملا سیمنار، شعبۂ اُردو ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی
30. مولانا آزاد صدی تقریبات سیمنار، یوپی اُردو اکادمی، لکھنؤ
31. سوسالہ جشن اورینٹل کالج، لاہور، پاکستان، دسمبر، 1995
32. دوسوسالہ جشن رضالائبریری، رام پور، اُتر پردیش 27 جولائی 1998
33. سالانہ جلسہ راجستھان اُردو اکادمی، راجستھان، اپریل 2000
34. نیاز فتح پوری سیمنار کراچی پاکستان، دسمبر 2001

اِملا ورک شاپ کا انعقاد

ہندوستان کے مختلف صوبوں کے شعبۂ تعلیم نے پرائمری، انٹر کالج، ڈگری کالج اور یونی ورسٹیوں میں درس وتدریس کے فرائض کو انجام دینے والے اُردو اساتذہ کے لیے مختلف اوقات میں تربیتی پروگرام کنڈکٹ کیے جن میں رشید حسن خاں کو اِملا، زبان وقواعد کے مسائل پر لکچر دینے کے لیے خاص طور پر مدعو کیا جاتا رہا۔ ان ورک شاپ کی ترتیب درج ذیل ہیں:

1. یونی ورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ کے لیے 3 ہفتے کا تربیتی کورس شعبہ اُردو جموں یونی ورسٹی، جموں۔ یکم جنوری سے 21 جنوری 1981 تک
2. ہائر سیکنڈری اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کے لیے دس دن کا تربیتی کورس (صحتِ اِملا)
3. پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کے لیے صحتِ اِملا کا تربیتی کورس، علامہ اقبال ایجوکیشنل سوسائٹی، ہبلی، کرناٹک۔ 27 مئی سے 3 جون، 1983 تک
4. پرائمری اور ہائر سیکنڈری اسکولوں کے اساتذہ کے لیے صحت اِملا کا پانچ دن کا تربیتی کیمپ ''کارواں'' زیر اہتمام کرناٹک اُردو اکادمی، بنگلور، 1985
5. اُردو اِملا کی معیار بندی پر تین روزہ سیمنار، اُردو ٹیچنگ ریسرچ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز (حکومت ہند) لکھنؤ، 28 دسمبر سے 30 دسمبر 1987 تک
6. پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کے لیے اِملا ورک شاپ، 17 اکتوبر سے 24 اکتوبر 1989، احمد آباد، گجرات
7. ممبئی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں 5 دن کی ورک شاپ منعقد ہوئی۔ 11 جنوری سے 15 جنوری 1990 تک

وزیٹنگ فیلو

رشید حسن خاں کو ملک کی کچھ یونی ورسٹیوں نے اپنے یہاں وزیٹنگ فیلو بھی مقرر کیا۔ وزیٹنگ فیلو کی حیثیت سے انھوں نے مختلف موضوعات پر لکچر دیے جن کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

1. شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی، تین ہفتے کے لیے بحیثیت وزیٹنگ فیلو، اصول تحقیق، قواعد زبان اور مشرقی شعریات پر لکچر دیے۔ اپریل 1983
2. شعبۂ اُردو ممبئی یونی ورسٹی میں بحیثیت وزیٹنگ فیلو دو ماہ کے لیے۔ اصول تحقیق، قواعد زبان، قواعد شاعری اور علوم بلاغت پر لکچر دیے۔ فروری، مارچ 1992
3. شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی میں بحیثیت وزیٹنگ فیلو 4 ہفتے کے لیے۔ متن کی قرأت، کلاسیکی ادب کی تفہیم، علوم بلاغت اور اصول اِملا پر لکچر دیے۔ دسمبر 1995
4. شاعری اور علوم بلاغت پر لکچر دیے۔ دو ماہ کے لیے۔ فروری، مارچ 1992
5. شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی میں بحیثیت وزیٹنگ فیلو، 3/ہفتے کے لیے۔ 26 جنوری سے 14 فروری 1990 تک

انعامات واعزازات

رشید حسن خاں کی علمی و ادبی خدمات کے مدِّ نظر ہندو پاک کے مختلف اُردو اداروں اور انجمنوں نے انھیں مختلف ادبی انعامات واعزازات سے نوازا۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

1. دہلی ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ، 1977
2. یو پی اُردو اکادمی ایوارڈ، 1978
3. غالب ایوارڈ، 1979
4. امتیازِ میر اعزاز (آل انڈیا میر اکادمی، لکھنؤ)، 1980
5. نیاز فتح پوری ایوارڈ (کراچی)، 1989
6. نیشنل ایوارڈ، مہاراشٹر اُردو اکادمی، 1990
7. محمد طفیل ادبی ایوارڈ (لاہور، پاکستان) 1990
8. نیاز فتح پوری ایوارڈ (کراچی) 1991

9. کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ (دہلی اُردو اکادمی) 1991
10. نیشنل حالی ایوارڈ (ہریانہ اُردو اکادمی) 1992
11. نوائے میر ایوارڈ (آل انڈیا میر اکادمی، لکھنؤ) 1993
12. یو پی اُردو اکادمی انعام 1994
13. پرویز شاہدی ایوارڈ (مغربی بنگال) 1996
14. یو پی اُردو اکیڈمی ایوارڈ 1996
15. افتخار میر (آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ) 1997
16. مولانا ابوالکلام آزاد (یو پی اُردو اکادمی لکھنؤ) 1998
17. مدھیہ پردیش اُردو اکادمی ایوارڈ 2004

☆☆☆

رشید حسن خاں

کچھ اپنے بارے میں

تعلیمی کاغذات میں تاریخِ ولادت 30 جنوری 1930 لکھی ہوئی ہے۔ یہ تاریخ کس نے لکھائی تھی، مجھے نہیں معلوم۔ صحیح سال ولادت 1925 ہے، دسمبر کا مہینا۔ تاریخ کا علم نہیں۔ والد کا نام :امیر حسن خاں۔ دادا کا نام: علی حسن خاں میرے والد پولس میں ملازم تھے، کشتی کے شوقین تھے۔ اس لیے پولیس کی ملازمت کو ترجیح دی؛ ورنہ ہمارے خاندان میں فوج کی ملازمت کو نشانِ امتیاز سمجھا جاتا رہا ہے۔ دادا بھی فوج میں تھے۔ آباواجداد سے متعلق مزید تفصیلات معلوم نہیں۔ میرے والد نے تحریک عدم تعاون کے زمانے میں ملازمت سے استعفا دے دیا تھا مگر ان کا ریکارڈ بہت اچھا تھا یوں ان کے سپرنٹنڈنٹ نے سمجھا بجھا کر قبل از وقت رٹائرمنٹ کی درخواست دلوا دی۔ اُن کی پینشن ہوگئی تھی۔ پندرہ روپے دو آنے پینشن تھی، جو آخر تک ملتی رہی۔ وہ انگریزی ملازمت کو ناجائز سمجھنے لگے تھے اور انگریزی تعلیم کو بھی خلاف مذہب ماننے لگے تھے؟ اسی لیے اُنھوں نے مجھے کسی اسکول میں داخل کرنے کے بجائے، عربی پڑھنے کے لیے بٹھا دیا تھا اور پھر ابتدائی کتابوں کے بعد شہر کے مشہور مدرسے بحرالعلوم میں درسِ نظامی کے لیے داخل کرادیا تھا، جہاں میں نے 1939 کے وسط تک زیر تعلیم رہا۔

میرے اساتذہ میں قابل ذکر نام مولوی مجتبیٰ حسن خاں مرحوم کا ہے۔ وہ بہت روشن خیال عالم تھے اور کٹرپن کے سخت مخالف تھے۔ ایک قول عموماً طالب علموں کو سنایا کرتے تھے کہ جو شخص خدا کی وحدانیت کا رسول کے آخری نبی ہونے کا اور یومِ حساب کا قائل ہے میں اسے کافر کبھی نہیں کہہ سکتا۔ وہ گنہ گار ہوسکتا ہے کافر نہیں ہوسکتا۔ شروعات میں اُلجھنے سے منع کرتے تھے اور سُنی سنائی کو ماننے سے منع کیا کرتے تھے کہتے تھے کہ پہلے تصدیق کرلو۔ میرے ذہن میں تحقیق کے پہلے نقوش اُنہی کی تعلیم کا نتیجہ تھے۔

ابتدائی تعلیم محلے کے مولوی صاحب سے حاصل کی۔ وہ میرے والد کے بھی اُستاد

تھے۔ جب میں پڑھنے بیٹھایا گیا تو ان کی عمر 75 سال کے لگ بھگ ہوئی۔ پھر 1934 میں مدرسہ بحر العلوم بھیج دیا گیا۔ درسِ نظامی کی تکمیل نہیں کر سکا۔ متوسطات تک کی کتابیں پڑھیں تھیں کہ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوگئی۔ گھر کے حالات اچھے نہیں تھے۔ آمدنی وہی 15 روپے دو آنے پینشن کی تھی۔ اس لیے آرڈیننس کلودنگ فیکٹری میں جب بھرتی شروع ہوئی تو میں بھی بھرتی ہو گیا۔ اس وقت میری عمر چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔ آرمی کی اس فیکٹری میں فوجی وردیاں سلتی تھیں۔ یہ فیکٹری اب بھی ہے۔

اسکول کالج میں ایک دن نہیں پڑھا۔ جب میں فیکٹری میں مزدور کے طور پر کام کرتا تھا، اُنہی دنوں محلے کے ایک پنڈت جی سے ہندی کی پہلی کتاب پڑھی تھی۔ جس کے نتیجے میں میں اب ہندی پڑھ تو لیتا ہوں، اُس طرح لکھ نہیں پاتا، مگر ضروری باتیں ٹھہر ٹھہر کر لکھ سکتا ہوں۔ انگریزی ایک رشتے کے بھائی سے کنگ ریڈر پڑھی تھی اور بس۔ پھر رفتہ رفتہ انگریزی اخبار پڑھنے کی مشق کرنا شروع کی۔ شروع شروع میں الجھا، مگر پھر کچھ دنوں میں عبارت کو بہ آسانی پڑھنے لگا۔ بہ ضابطہ انگریزی زبان حاصل نہیں کر سکا۔ مگر ہلکی پھلکی کتابیں بہ آسانی پڑھ سکتا ہوں اور حوالے کی کتابیں سے بھی بہ خوبی استفادہ کر سکتا ہوں۔

سب سے پہلے شہر کے عربی مدرسے فیض عام میں تقرر ہوا۔ وہاں مشکل یہ پیش آئی کہ درسِ نظامی کی جو ابتدائی کتابیں مجھے پڑھانا تھیں (جنھیں میں خود اپنے زمانے میں پڑھ چکا تھا) اُن کے پڑھنے والے ذرا الجھنے لگے ذہنی طور پر، اور پھر چند روز کے بعد بات کھل کر سامنے آ گئی کہ طلبہ کے مہتمم مدرسہ نے (جو میرے دوست بھی تھے اور کرم فرما بھی) یہ کہا کہ اُستادِ محترم تو داڑھی منڈواتے ہیں، بھلا ہم لوگ ان سے کیسے پڑھ سکتے ہیں۔ مہتم صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ داڑھی تو رکھنا پڑے گی، ورنہ مخالفت زیادہ ہوگی۔ بات اُن کی بجائے خود درست تھی! مگر میں نے یہ کہا کہ یہ تو رشوت کی داڑھی ہے۔ کہ نوکری کرنا ہے تو داڑھی رکھاؤ۔ میں نے انکار کر دیا میں داڑھی کی شرعی حیثیت کا معترف تھا اور ہوں لیکن اُس وقت گویا ضد کی بات آ پڑی تھی۔ خیر! سمجھوتا اس پر ہوا کہ میں درسِ نظامی کے کے بجائے منشی، مولوی اور منشی کامل کے امتحانات کی تیاری کراؤں اور اس پر سبھی مطمئن ہوگئے۔

اسی درمیان اسلامیہ ہائر سکینڈری اسکول میں فارسی، اُردو کے اُستاد کی ایک جگہ نکلی۔ میں نے بھی درخواست دی۔ اس جگہ کے لیے ہمارے شہر کے مولوی محمد یوسف صاحب بھی اُمیدوار تھے، جو گورنمنٹ اسکول میں اُس وقت ٹیچر تھے اور ریٹائر ہونے والے تھے۔ وہ شہر کی ایک مسجد کے امام تھے اور

بہت لوگوں کے پیر بھی تھے۔مشہور شخص تھے۔وہ دو تین سال کے لیے اس اسکول میں ملازمت کرنا چاہتے تھے۔میرے اُستاد مولوی مجتبیٰ حسن صاحب میرے لیے کوشاں تھے اور ان کے اثرات سے میرا کامیاب ہونا یقینی سا تھا۔یوسف صاحب نے بعد نماز جمعہ منبر سے یہ اعلان کیا کہ یہ شخص چوں کہ کمیونسٹوں کے ساتھ ٹریڈ یونین میں کام کرتا رہا ہے اور کمیونزم کو مانتا ہے اس لیے یہ مسلمان نہیں ہو سکتا اور ایسے شخص کو اسلامیہ اسکول میں جگہ کیسے دی جا سکتی ہے۔یہ گویا ترپ کا پتا تھا۔مگر افسوس انھیں کامیابی نہیں ہوئی اور اس طرح 1953 میں میں اسلامیہ اسکول میں اُردو فارسی کے اُستاد کے طور پر کام کرنے لگا۔اُس وقت تک میں یو پی کے عربی فارسی بورڈ سے مولوی کا امتحان پاس کر چکا تھا اور لکھنؤ یونی ورسٹی کے اورینٹل ڈپارٹمنٹ سے دبیر کامل کا امتحان بھی امتیاز کے ساتھ پاس کر چکا تھا۔ہاں اُردو فارسی ٹیچر بہ آسانی بن گیا۔یہاں میں 1959 کے وسط تک رہا۔1959 میں اگست کے مہینے میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر چلا گیا اور پھر وہیں ریسرچ ایسوسی ایٹ ہو گیا اور وہاں سے ذرا سا قبل از وقت 31 دسمبر 1989 کو رٹائر ہو گیا۔

اسکول کی ملازمت سے پہلے اور آرڈیننس فیکٹری کی ملازمت کے بعد تین نوکریاں اور کیں۔بہت پریشان تھا معاشی طور پر، پہلے آٹا پیسنے والی ایک چکی پر منشی رہا اور پھر ایک زمین دار کے یہاں کارندہ بنا۔طرح گاؤں کی زندگی اور زمین داری کی زندگیاور دیگر احوال بھی ہوئے۔1946 کے آغاز سے 1949 تک یہ رکھا۔پھر راشن کی ایک دکان پر منشی بن گیا اور 1949 میں وہاں سے مدرسہ فیض عام میں اُستاد بن کر گیا تھا۔

جنگِ عظیم زوروں پر تھی۔اُس وقت تک سول کارخانہ میں یونین بنائی جا سکتی تھی۔آرڈی نینس کارخانہ میں اس کی اجازت نہیں تھی۔کچھ لوگوں نے 1940 کے وسط میں کیرتن اور میلاد شریف کے نام سے گھروں میں چھپ چھپا کر یونین کا ڈول ڈالا۔پھر کھل کر کام ہونے لگا۔یہاں تک 1945 کے آخر میں 33 دن کی اسٹرائک ہوئی۔جو کسی بھی آرڈیننس فیکٹری میں باضابطہ اسٹرائک تھی۔میں اُس وقت اپنی یونین کا جوائنٹ سکریٹری تھا۔اس کی پاداش میں 1946 کے بالکل شروع میں نکالا گیا۔اور یہ حسن اتفاق واقع نہ ہوتا تو شاید میری زندگی کا رُخ ہی کچھ دوسرا ہوتا۔معاش طور پر اُس کے بعد چار پانچ سال بہت پریشان رہا۔45ء میں میری شادی ہو چکی تھی۔بے حد قانع اور صابر و شاکر بیوی ملی تھی، جس

بے حد استقلال اور خوش دلی کے ساتھ اُن دنوں رفاقت کا حق ادا کیا اور یہ روش آج بھی برقرار ہے۔

ہماری یونین کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ایک تربیت یافتہ شخص تھے، بہت محنتی ایمان دار اور پڑھے لکھے۔ اُن دنوں کمیونسٹ پارٹی میں کامریڈ رندیو کے گروپ کو برتری حاصل تھی اور یہ زمانہ انتہا پسندی کا تھا سیاسی سطح پر۔ مفاہمت نام کی اُن دنوں کوئی چیز نہیں تھی۔ ٹریڈ یونین کے مزدوروں کے مسائل کو حل کرنے سے زیادہ، پارٹی کی آئیڈیالوجی کو پھیلانے کا کام لیا جاتا تھا اور ورکروں کی اسی لحاظ سے شام کی بیٹھکوں میں ذہنی تربیت کی جاتی تھی۔ یونین میں تین چار لوگ ایسے تھے جو اس پالیسی سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ میں بھی اُنھیں میں تھا۔ ہمارا کہنا تھا کہ دنیا کہ مزدوروں ایک ہو جاؤ، کھوکلا نعرہ ہے اور محض سیاسی ہتھکنڈا۔ ہر فیکٹری، ہر کارخانے کے مزدوروں کے مسائل یکساں نہیں۔ پھر وہ سب ایک کیسے ہو سکتے ہیں۔ ہم یہ کہتے تھے کہ مینجمنٹ سے لڑنا ہمارا مقصود نہیں ہو سکتا۔ طریقۂ کار کا عارضی حصہ ہو سکتا ہے مگر یہ پارٹی کی پالیسی کے خلاف تھا۔

پھر شخصی جھگڑے تھے۔ اب ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اُس وقت ورکر تو نچلے درجے سے آتے تھے جو بہت ایمان دار، سچے تھے مگر سادہ دل تھے اور سیاسی داؤ پیچ سے نا آشنا۔ جب کہ جتنے لیڈر تھے، وہ سب اپر کلاس سے آتے تھے اور اپنے طبقے کے سارے ذہنی اور علمی تضادات ساتھ لے کر آتے تھے۔ اس سے ایک سطح پر کش مکش کا پیدا ہونا لازمی تھا اور وہ ہوا۔ آخر میں دو گروہ بن گئے تھے یونین میں اسی سوال پر۔

تحقیق کے نقش مختلف وقفوں میں ذہن پر مرتسم ہوتے رہے۔ سب سے پہلے مدرسے میں اُستاد محترم کی اس بات سے کہ ہر سُنی ہوئی بات سچ نہیں ہوتی۔ تصدیق ضروری ہے پھر گھر میں ایک دوسرے انداز میں تربیت ہوتی تھی۔ یہ بے حد دل چسپ امر ہے کہ میرے اُستاد جس قدر نرازق ذہن اور عمل کے مالک تھے، میرے والد اُسی قدر متشدد تھے۔ صلح سمجھوتے کے تو قائل ہی نہیں تھے جس بات کو اپنے نزدیک درست سمجھتے تھے اُس کو علی الاعلان کہتے تھے اور بار بار۔ مولویوں کے بہکاوے میں آکر نوکری چھوڑنے پر تیار ہو گئے، یہ سوچے بغیر کہ اس کے اثرات کیا ہوں گے۔ مگر دل کے بہت صاف اور نرم تھے اگر چہ نرمی کا اظہار بہت کم ہو پاتا تھا۔ کھرا پن اور بے لچک شخصیت۔ یہ دو اُن کی ذہانت کے اہم افراد تھے۔ ایک واقعے سے اس کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ کٹر دیوبند مخالف تھے اور اُن کے اُستاد

(جو میرے بھی پہلے اُستاد تھے) دیو بندی تھے۔ ہمیشہ کہتے تھے کہ کیا کروں، اُستاد ہیں، کچھ کہہ نہیں سکتا؟ دیو بندی ہیں۔ خیر! میں نے قرآن پاک بہت جلد ختم کر لیا۔ خوش ہو کر میرے مرحوم اُستاد نے مجھے اُس دن اپنا نسخہ قرآن پاک دے دیا بہت سی دعاؤں کے ساتھ۔ وہ مترجم تھا۔ ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب کا تھا اور حاشیے پر تفسیر بھی انھیں کی تھی۔ میں نے خوش خوش گھر آ کر اپنے والد کے سامنے اُسے رکھ دیا۔ اب جو اُسے کھول کر دیکھتے ہیں تو ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب کا (جو معروف دیو بندی عالم تھے)۔ چہرے کا رنگ بدل گیا، بل کہ بگڑ گیا۔ انتہائے غضب میں کہنے لگے کہ ''اُس وہابڑے کا ترجمہ میرے گھر میں بھیجا گیا ہے!''۔ مگر کیا کرتے، معاملہ قرآن پاک کا۔ بے ادبی کر نہیں سکتے تھے۔ کچھ دیر بل کھاتے رہے اور بڑبڑاتے رہے پھر میری والدہ کو آواز دی: قینچی لاؤ۔ وہ لے آئیں۔ میری آنکھوں کے سامنے حاشیے کاٹ کر چولھے میں جلا دیے۔ اور اس پر بل کھاتے رہے کہ ترجمہ تو باقی رہ گیا۔ اس میں وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

چھے بجے لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ آٹھ بجے تک۔ پھر 9 بجے سے ایک بجے تک۔ ایک بجے دوپہر کا کھانا کھاتا ہوں۔ دو گھنٹے آرام کرتا ہوں، ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق، یوں کے دل کا مریض ہوں۔ تین بجے اُٹھ کر چائے پیتا ہوں اور پھر آٹھ بجے تک کام کرتا ہوں۔ شام کی خبریں سُن کر ساڑھے نو بجے بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔

چائے بغیر دودھ کے پیتا ہوں۔ علی الصباح لیمن ٹی، پھر سادہ چائے۔ لپچیو میری پسندیدہ چائے ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ کہیں اور چائے نہ پیوں کیوں کہ عموماً گھروں میں اور معمولی ہوٹلوں میں جو چیز ملتی ہے اُسے چائے کہا گناہِ کبیرہ کے ذیل میں آئے گا۔ چائے کی پتی کو دودھ اور شکر کے ساتھ اوٹا نا کاڑھا تیار کرنا ہے۔ چائے کا اس سے کیا واسطہ! اس غلیظ مشروب کو یار لوگ چائے کہتے ہیں اور شوق سے پیتے ہیں۔ دنیا میں بہت سی چیزیں عجائبات کی ہیں۔ اُنھی میں اِسے بھی سمجھنا چاہیے کہ جوشاندہ جیسی اوٹی ہوئی چیز کو چائے کہا جاتا ہے۔ عمدہ پتی کو دم دیا جائے۔ اُس پتی کو مقررہ وقفے تک (جو محض بہتروں کے لیے پانچ منٹ اور بعض کے لیے آٹھ منٹ ہوتا ہے) تب کہیں وہ خوش بو پیدا ہوتی ہے۔ چائے کا حاصل ہے اور اور وہ ذائقہ جو ذوق کی تربیت میں معاون ہوتا ہے اور خوش ذوقی کی پہچان بنتا ہے۔ اب یہ میں دیکھتا ہوں کہ چائے کے کپ پینے کے دل کمائی تنگ تر بننے لگے ہیں۔ مجھے ایسے

کپ سے وحشت ہوتی ہے۔متوسط دست کا خون ہو۔جب کسی کو گلاس میں چائے پیتے دیکھتا ہوں تو کچھ دیر کے لیے ساری خوش ذوقی مرحوم ہو جاتی ہے۔میں مغربی مشروبات کے اُس بنیادی اصول کا اس سلسلے میں اطلاق کرتا ہوں جو لفظ معنی کی بحث میں مانے کرتا ہے کہ خیال بھی اچھا ہو اور باتیں بھی۔اسی لیے چائے بھی اچھی ہو اور کپ بھی؛ سبک، خوش رنگ اور دس دار۔چائے دانی سر پوش (ٹیکوزی) سادہ ہو تو بہتر ہے۔کراچی میں سنہری لیس لگے ہوئے چمک دار سر پوش ملتے ہیں۔اچھے ہوتے ہیں، مگر سادگی میں جو حُسن ہوتا ہے اُس میں کہاں۔اُس میں تکلف ہے، رکھ رکھاو ہے اور بھی کچھ ہوگا، مگر امانت کی شاعری دوسری بات بھی ہوتی ہے لفظی مناسبتوں کے بوجھ سے شعریت سے خالی آتی ہے۔پاؤڈر زدہ چہرے حُسنِ قدرتی کے حریف کیسے ہو سکتے ہیں؟ جو تکلف سے بری ہوتا ہے۔دہلی میں یونی ورسٹی کے ہاسٹل میں رہتا رہا۔عمر کاٹ دی اُسی بے رنگ کمرے میں۔کھانا ناشتا میس میں ملتا تھا۔میں ناشتا کر لیا کرتا تھا۔چائے نہیں پیتا تھا۔چائے اپنے کمرے میں آ کر پیتا تھا خود بنا کر۔صبح کی چائے تو 6 بجے ہی پی لیتا تھا خود بنا کر۔یہ معمول اب بھی ویسا ہی ہے بس اس ترمیم کے ساتھ اب چائے خود نہیں بنانا پڑتی، صبح وقت پر مل جاتی ہے۔دو بہوئیں ہیں۔جو اس کا بہت خیال رکھتی ہیں۔مگر وہ خود وہی اولٹی ہوئی چائے پیتی ہیں اور اس سلسلے میں میں کچھ نہیں کر سکتا۔اچھی باتوں کو نہ ماننے والوں کی تعداد بہت زیادہ رہی ہے۔اس پر تعجب کیوں کیا جائے یہ اولٹی آسانی سے بن جاتی ہے اور کم وقت میں۔آسان پسندی بد ذوقی کے ساتھ مل کر جواز کا فتوا بہ آسانی تیار کر لیا کرتے ہیں اور یہاں وہ مثل یاد آتی ہے کہ: قاضی جی تو ہراتے رہے، میں ہاری نہیں۔

آج ہم آپ اس کو یوں بھی کہیں، مگر وہ لوگ اِس کو برحق سمجھتے ہیں۔اِس کو کسی بھی شکل میں گوارا نہیں کریں گے۔اُن کے دل اور اُن کی زبان میں فاصلہ نہیں تھا۔میں دہلی کے ''مہذب اور شائستہ' لوگوں کے ساتھ 36 سال رہا ہوں اور اِس پوری مدت میں آخر تک یہ معلوم نہیں کر سکا کہ کس شخص کی حقیقی رائے کیا ہے۔جب کہ اس زمانے میں میرے گھر اور محلے میں اور شہر میں ہر شخص کو خوب معلوم ہوتا تھا کہ کس کی رائے کیا ہے۔پانچ منٹ بھی نہیں لگتے تھے صحیح رائے معلوم ہونے میں۔وہ بے مروت لوگ تھے۔ضدی تھے، ہٹیلے تھے، نا عاقبت اندیش بھی تھے؛ مگر کھرے لوگ تھے۔جن کے دل آئینے کی طرح روشن تھے۔اور زبان میں تلوار کی دھار ہوتی تھی کہ کوئی لگی لپٹی رہتی ہی نہیں تھی۔گھر کے

اس ماحول نے جذبۂ عدمِ مفاہمیت اور کھرے پن کو بڑھاوا ضرور دیا ہے۔ بے جھجک بات کہنے کی عادت ڈالی اور ادب تحقیق کے عمل میں اس ابتدائی تربیت سے بہت مدد ملی۔ میرے خاندان میں ایک بزرگ تھے، اُن کا قول تو یہ تھا کہ جس پٹھان میں ضد اور جہالت نہیں، اُس کے نطفے میں فرق ضروری تھا۔ اسے بجا طور پر منافقانہ مبالغہ مان لیا جائے۔ لیکن یہ تو تھا کہ پٹھان مصلحت اندیشی سے عموماً ناآشنا ہوتے تھے اور منافقت سے اور ریا کاری سے خاصے دور رہا کرتے تھے۔ اکثریت کا احوال یہی تھا۔

تقریباً 1944 میں رسالہ نگار سے متعارف ہوا اور نیاز فتح پوری کی تحریروں نے اثر ڈالا۔ (اُس زمانے میں نوجوانوں کی بڑی تعداد کی ذہنی تربیت نیاز کی تحریروں سے ہوتی تھی) تشکیک، دلیل کاری سے، شہادت کا تصور اور روایت کے سچے جھوٹے متعلقات کا ابتدائی سطح پر شعور نیاز کی تحریروں سے ہوا۔ یہ بہت دل چسپ بات ہے کہ جب باضابطہ تحقیق کے دائرے میں آیا تو معلوم ہوا کہ نیاز کے ذہن کو تحقیق بہت کم مناسبت تھی اور شناسائی بھی دور کی تھی اور مصلحت پسندی سے وہ غافل نہیں ہوتے تھے۔ تب بھی علی الاعلان اِس کی شہادت دیتا ہوں کہ اُس زمانے میں بہت سے سوالیہ نشان پیدا کیے تھے؟ جو بالآخر تحقیق کے عمل میں میرے کام آئے۔

میں نے حافظ محمود خاں شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی تحریروں سے تحقیق کے آداب سیکھے۔ اسی لیے ان چاروں حضرات کو میں اپنا معنوی اُستاد مانتا ہوں۔

شاہ جہاں پور ہاکی کا بڑا مرکز رہا ہے۔ یہاں اچھے اچھے کھلاڑی پیدا ہوئے اور چمکے۔ اس لیے اس کھیل نے مجھے شروع ہی سے دل چسپی رہی ہے۔ 1949 سے 1959 تک خود بھی ہاکی کھیلی ہے۔ کھیل میں کھلاڑی کے طور پر کوئی قابل ذکر حیثیت تو حاصل نہیں کر سکا، مگر ٹیم میں کھیلتا رہا۔ دہلی آیا تو بڑے ٹورنامنٹ دیکھنے کا موقع ملا اور وہاں میرے وقت کا خاصا حصہ اسپورٹ اسٹیڈیم کی نذر ہو جایا کرتا تھا۔ ہاکی کے بعد میرے پسندیدہ کھیل فٹ بال، والی بال اور باسکٹ بال ہیں۔ کرکٹ سے مجھے دل چسپی نہیں۔ کبڈی بھی کھیلی ہے۔ اب ٹی وی پر میچ دیکھنے پر قناعت کرنا پڑتی ہے (اتفاقات ہیں زمانے کے!)۔ مجھے ابھی سے فٹ بال کے ورلڈ کپ کے میچوں کا انتظار ہے۔ اُنھیں پابندی سے دیکھتا ہوں۔ اس انہماک سے میرے تحقیقی کاموں پر ذرا بھی اثر نہیں پڑتا (ہر ہوسنا کے نداند جام وسنداں

باختن)۔

میرے معمولات میں 1959 کے بعد بہت کم تبدیلی آئی ہے، یوں کہوں کہ گویا نہیں آئی۔صبح پانچ بجے اُٹھتا ہوں۔ہر موسم میں ساڑھے پانچ بجے کے قریب نہاتا ہوں، شدید سردی کے زمانے میں بھی اس کا ناغہ نہیں ہوتا۔(بیماری کی بات الگ ہے)۔پھر چھے بجے سادہ چائے پیتا ہوں لیمن ٹی۔آٹھ بجے ناشتا۔جی ہاں کافی ہاؤس میں پابندی کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا جب تک دہلی میں رہا۔مگر ہمیشہ تنہا، کسی کے ساتھ نہیں۔اس سے وحشت ہوتی تھی۔مجلس آرائی کا میں قائل نہیں۔فضول باتوں کا شوق نہیں، اتنا وقت ہی نہیں ملا کہیں۔مزاج بھی یہ۔لیکن اب جب دہلی جاتا ہوں تو کافی ہاؤس ضرور جاتا ہوں کم سے کم دوبار۔یونی ورسٹی کا کافی ہاؤس میری پسندیدہ جگہ ہے۔یہاں کے بیرے تربیت یافتہ تھے اور مردم شناس۔مہینے کی آخری تاریخوں میں اکثر جیب میں روپے نہیں ہوتے تھے مگر یونی ورسٹی کا کافی ہاؤس کا ناغہ نہیں ہوتا تھا۔پُرانا بیرے تھا اس کو خوب معلوم تھا کہ جیب میں پیسے ہوں گے تو فوراً دیے جائیں گے۔نہیں ہوں گے تو نہیں۔اُس نے کبھی پیسے نہیں مانگے، کبھی بل لاکر ٹیبل پر نہیں رکھا۔دو دن، تین دن، چار دن جب تنخواہ ملی اُسی دن ادائگی کردی گئی۔نہ اُس نے حساب بتایا، نہ اُس سے پوچھا کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ کمی بیشی بھی کی ہے۔ایسی ایمان داری تو بہت سے ادیبوں اور ناقدوں میں بھی نہیں ملتی۔اساتذہ کا نام یوں نہیں لیا کہ یہ حضرات عموماً اس سلسلے میں غیر تکلف ہوتے ہیں۔جو دوسروں کے لیے واجب اور فرض ہے۔جو ان کے لیے فرض کفایہ ہوتا ہے۔

آج کل کے معمولات بس لکھنے پڑھنے تک محدود ہیں۔میں تقریبات میں عموماً شرکت نہیں کرتا۔رشتے داریوں میں بہت کم کبھی کبھار جاتا ہوں اور وہ بھی مجبوراً۔چاہتا ہوں کہ مجھ سے ملنے کے لیے بھی لوگ نہ آئیں۔وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔اسی لیے میں نے آخر تک ٹیلی فون نہیں لگوایا کہ وقت ضائع ہوتا ہے۔لوگ عموماً فضول باتیں کرتے ہیں۔غیر ضروری اور دیر تک۔ذہن سے لازمی سوچی سمجھی باتیں نکل جاتی ہیں۔لیکن میرے بڑے صاحب زادے فون لگوانا چاہتے ہیں۔میں نے اس شرط پر اتفاق کیا ہے کہ اُس کو میرے کمرے سے دور رکھا جائے گا اور مجھے وہاں نہیں بلایا جائے گا۔جب تک کہ واقعی کوئی اہم بات نہ ہو، جواب کم ہوتی ہے۔

جی ہاں سحرالبیان کو پچھلے دو سال سے مرتب کر رہا ہوں۔ابھی سال ڈیڑھ سال اور لگے گا۔مشفق خواجہ صاحب کی جانب سے پاکستان کے کئی اہم خطی نسخے مل گئے ہیں، ورنہ یہ کام شاید اس

طرح نہ ہو پاتا جس طرح ہو پا رہا ہے۔مثنویاتِ شوق لکھنوی پریس میں ہے کہ مجوزہ اصول تدوین پر ایک مجموعہ زیر کتابت ہے۔آیندہ کے پروگرام میں کلام جعفر زٹلی کو مرتب کرنا اور غرائب الغات کی تدوین شامل ہے۔

میرے اور دوسروں کے لیکچر اور سنہ کی تفصیل لکھنا مشکل ہے۔میرے پاس یادداشتیں نہیں۔ایسی چیزوں کو یاد رکھنا یا محفوظ رکھنا فضول کام ہے۔اس سلسلے میں معذرت طلب ہوں۔لکھنے پڑھنے کو ان باتوں کا کیا تعلق۔

میری نجی زندگی میں ایسی کوئی بات ہیں جیسے بیان کرنا ضروری نہیں۔مری نجی زندگی گریا رہی ہی نہیں۔جو عمر عشق کرنے کی ہوتی ہے وہ ٹریڈ یونین کے ہنگاموں میں گزری۔یا پھر تلاش معاش میں اور اگر کچھ ہے بھی، جسے سعدی نے لکھا ہے کہ درایام جوانی فنا نکہ افتد دانی، تو وہ دوسرے لوگوں کے لیے نہیں۔ایسی چیزیں شخصی ہوتی ہیں، پنچایتی نہیں۔

سوالات کے جوابات سب ترتیب میں آ گئے ہیں۔آپ کے اُستادمحترم ”رفیع الدین ہاشمی صاحب“ کا بھی حکم تھا۔اُنھیں میں پیر جی مانتا ہوں، اسی لیے حکم کی تعمیل تو کرنا ہی تھی۔اس کی رسید مجھے مل جائے گی تو اطمینان ہوگا کہ خط تم تک پہنچ گیا۔یہ خط ہاشمی صاحب کی خدمت یوں بھیج رہا ہوں کہ وہ اسے دیکھ لیں اور اگر کوئی ناگفتنی ہو تو اسے قلم زد کر دیں۔

رشید حسن خاں

پس نوشت ۔یہ سوال تو رہ جاتا تھا: جی نہیں پچھتاوا کبھی ہوا۔اب بھی نہیں زندگی کے راستے میرے سامنے تھے، میں نے سمجھ بوجھ کر گھاٹے والے سودے کو خریدا۔پھر پشیمانی کیوں؟ سب سے بڑی بات میری یہ ہے کہ میرا ضمیر مطمئن ہے اور یہی میرے لیے کافی ہے۔اس لیے یہ جو حرام زدگان ادب ہیں، ان سے کبھی سمجھوتا نہیں کر سکا۔اور یہ بھی اسی کا فیض ہے کہ جس بات کو، کام کو غلط سمجھا اور صحیح طور پر اُس پر گرفت کی، ہندوستان پاکستان میں بیش تر لوگ مجھ سے خوش نہیں رہے، مگر میں نے کسی کی خوشی یا ناراضگی کو کبھی اہمیت نہیں دی۔میں قطعی طور پر خوش ہوں اور مطمئن۔

(مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتب، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، ادبیات، اُردو بازار لاہور، 2009، ص 196 تا 202)

....

نوٹ ۔یہ خود نوشت نما خط رشد حسن خاں نے اورینٹل کالج لاہور (پاکستان) سے ایم۔اے اُردو کی طالبہ

مسرت انیس کے مقالے ''رشید حسن خاں احوال و آثار'' کے 16 سوالات کے جوابات کے طور پر 12 مئی 1998 کو ارسال کیا تھا۔اس خط میں رشید حسن خاں نے اپنی زندگی کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔اس سے قبل خاں صاحب مسرت انیس کو اپنے بارے میں کچھ بھی لکھنے اور بتانے سے منع کر چکے تھے۔بل کہ مسرت انیس کو یہ مشورہ بھی دیا کہ ان کے جو طویل انٹرویوز پاکستانی اخبارات جسارت،نوائے وقت اور مشرق میں شائع ہوئے ہیں ،ان سے استفادہ کر لے۔ساتھ ہی شاہد علی خاں (منیجر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،نئی دہلی) سے استفسار کرنے کو بھی کہا۔کیوں کہ شاہد صاحب کے پاس بھی خاں صاحب سے متعلق غیر مطبوعہ مواد تھا۔جسے بعد میں ڈاکٹر اطہر فاروقی نے بڑی جاں فشانی،لگن اور محنت سے بہ عنوان''رشید حسن خاں :حیات اور ادبی خدمات'' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ،جولائی 2002 میں شائع کرایا۔مسرت انیس کے سوالات اور جوابات کی تفصیل 11 مئی 1998 میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے نام تحریر کیے خط سے بھی معلوم ہوتی ہے:

> ''آپ کے خط کے بعد آپ کی شاگردہ کا خط آیا،میری طبیعت اِدھر کُچھ یوں ہی رہی،یوں تاخیر ہوتی رہی۔بارے اب سوال نامے کے جوابات لکھ لیے گئے اور کل بہ حوالۂ ڈاک ہوگا۔آپ کی معرفت یوں بھیج رہا ہوں کہ آپ ایک نظر ڈال لیں ،غیر ضروری باتوں کو قلم زد کر دیں اور ناروا تفصیل پر خط کھینچ دیں حشو و زائد جس قدر کم ہوں،اُتنا ہی اچھا ہوگا۔''

(مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی،مرتب،ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد،ادبیات،اُردو بازار لاہور،جون 2009،صفحہ 107)

☆☆☆

رشید حسن خاں

ادب اور صحافت

یہ مشہور بات ہے کہ صحافت اور ادب میں تضاد کی نسبت ہے۔ روزانہ اخبار کا پہلا صفحہ اگر ہمارے سامنے ہو تو اپنے آپ معلوم ہو جائے گا کہ اخباری خبروں میں اور ادبی تحریروں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اخبار کا اڈیٹوریل بڑی اہم چیز ہوتا ہے، مگر یہ بھی مبنی ہوتا ہے کسی خاص خبر پر، اگر چہ اصل خبر کے مقابلے میں وہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ایک اخبار میں اگر اڈیٹوریل کے دو یا تین حصے ہیں یعنی دو یا تین عنوانوں کے تحت دو یا تین مختلف تحریریں ہیں، تو وہ سب بھی کسی نہ کسی خاص خبر ہی سے متعلق ہوں گی۔ خبروں میں اور اُس نوٹ میں جو فرق ہوتا ہے اُس کو انداز پیش کش سے متعلق سمجھا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ نکلے گا کہ سارا معاملہ "کیسے لکھا گیا ہے" سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے باوجود روزانہ اخبار کے شاید ہی کسی اڈیٹوریل کو ادبی تحریر کہتے ہوں، اور اس سے ظاہری طور پر یہی مطلب نکلتا ہے کہ ادبیت کے لیے صرف انداز پیش کش کا مختلف ہونا کافی نہیں، اصل بات کو بھی ادب کے دائرے سے متعلق ہونا چاہیے۔ مگر یہاں ایک اور مشکل صورت حال سے ہم کو دو چار ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً اخبار میں کسی فساد سے متعلق ایک خبر چھپی، اڈیٹر نے اُس پر ایک پُرزور اڈیٹوریل لکھا۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد اسی فساد پر مبنی ایک افسانہ چھپا اور اب معلوم ہوا کہ اس خبر اور اس اڈیٹوریل نوٹ کو اس افسانے سے کوئی نسبت ہی نہیں، جب کہ بنیاد ان تینوں کی ایک ہی ہے۔ افسانہ تو ادب پارہ قرار پایا اور وہ دونوں تحریریں اخباری چیزیں بن کر رہ گئیں۔

اس سلسلے میں ایک اور پریشان کرنے والا پہلو سامنے آ جاتا ہے کہ ایک حادثہ اس قدر متاثر کرنے والا تھا کہ ایک ہی وقت میں یا تھوڑے وقفے سے کئی پُرشور اڈیٹوریل لکھے گئے، کئی افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے اور شاعروں نے بہت سی نظمیں لکھیں۔ اس حادثے سے متاثر ذہنوں نے جب ان سب تحریروں کو پڑھا یا سنا تھا تو یہ سب پُراثر معلوم ہوئی تھیں۔ چند روز کے بعد سب سے پہلے اخباروں کا تاثر زائل ہونا شروع ہوا اور اڈیٹوریل نوٹ بھی اُسی کے ساتھ ذہنوں سے نکل گئے۔ وہ جو چار چھ یاد س

بارہ افسانے لکھے گئے تھے، اُن میں سے بس ایک افسانہ ایسا نکلا جو زندہ رہا اور متاثر کرتا رہا، اور نظم ایک بھی ایسی نہیں نکلی جس کو دوبارہ پڑھنے کو جی چاہتا ہو۔ گویا اخباری خبروں کی طرح وہ نظمیں بھی مرحوم ہو گئیں۔ شکل صورت اور انداز پیش کش کے اختلاف سے یہاں بحث نہیں، اصل بات یہ ہے کہ نظموں، افسانوں اور خبروں میں گویا کچھ زیادہ فرق نہیں رہا، انجام سب کا ایک ہی ہوا۔

اس سے پہلے کہ ساری بحث سے ہم کوئی نتیجہ نکالیں، ایک اور رُخ بھی ہمارے سامنے رہنا چاہیے اور یہاں بھی ایک مثال سے بات واضح ہو سکے گی۔ 1912 میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے مسئلے پر گرما گرم بحثیں ہوتی رہیں، مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' کے کئی شماروں میں اس سلسلے میں متعدد مضامین لکھے۔ یہ مضامین 25 اگست 1912 سے 12 اپریل 1913 تک مختلف شماروں میں ''تشنۂ شام کی نصف شب'' اور ''حدیث الغاشیہ'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ستر برس سے کچھ زیادہ ہو گئے ہیں ان مضامین کو چھپے ہوئے، اصل مسئلہ اب شاید دو چار لوگوں کے ذہن میں ہو، مگر یہ مضامین آج بھی ادبیت کے لحاظ سے خاصے کی چیز ہیں۔ اُردو کی اعلا ادبی تحریروں میں بلا تکلف ان کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ اُسی زمانے میں دوسروں نے بھی اس مسئلے پر لکھا تھا، مگر آج ہم اُس سے واقف بھی نہیں، اخباری خبروں کی طرح وہ بھی رفت و گذشت ہوا۔

ایک اور بات عام طور پر صحافیانہ ادب کی ترکیب استعمال کی جاتی ہے۔ ایسی تحریروں کے لیے جو لکھی گئی تھیں کسی خاص موضوع پر، اُنھوں نے کم یا زیادہ شہرت بھی پائی ان دنوں، مگر دو چار یا دس بارہ برس کے بعد اُن کی آب و تاب جاتی رہی اور اخباروں کے پُرانے اڈیٹوریل نوٹس کی طرح آج وہ بے رنگ اور بے تہہ نظر آتی ہیں۔ اسی طرح جب کوئی ادیب بے تکان لکھتا ہے اور ہر موضوع کے ساتھ اُس کا سلوک اُسی طرح کا ہوتا ہے جیسا اخباروں میں فی الفور خبریں بنانے اور اُن پر اُسی وقت تبصرے مرتب کرنے والوں کا ہوتا ہے، تو ہم یہ کہتے ہیں کہ صحافت کا انداز غالب آ گیا ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ ادب کی تہہ داری، سنجیدگی اور بلندی ان صاحب کی تحریروں میں نہیں پائی جاتی۔

ان سب باتوں سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ موضوعِ سخن اصل چیز نہیں، اصل چیز ہے لکھنے والے کا اندازِ فکر اور طرزِ عمل۔ اخبار میں جو خبریں چھاپی جاتی ہیں اور اڈیٹر جو بعض خبروں پر اڈیٹوریل لکھتا ہے تو یہ سارا عمل تجارتی ہوتا ہے۔ اخبار کی جو طے شدہ پالیسی ہے، اُس کے تحت یہ سارے کام

انجام پاتے ہیں۔ نیوز اڈیٹر ہو یا چیف ایڈیٹر دونوں ملازم ہوتے ہیں۔ دوسری طرف اخبار کو کسی مستقل جریدے کے طور پر مرتب کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ یہاں اصل چیز تجارتی کامیابی ہے اور مقررہ پالیسی کی رعایت۔ اخبار کسی کا ہے، مرتب کوئی اور کر رہا ہے، خبریں ایک شخص بناتا ہے اور دوسرے متعلقات کا کوئی دوسرا شخص انتظار کر رہا ہے، غرض پورا کارخانہ ہے۔ ادبی تخلیق خالص شخصی اور ذاتی معاملہ ہے، اُسے بھلا اس کوآپریٹیو طریق کار اور اس تجارتی مصلح نظر سے کیا واسطہ! یہی وجہ ہے کہ اخبار میں کام کرنے والے کیسے ہی ہوں، مگر اس کا بیش تر حصہ خالص صحافتی ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات واضح ہونا چاہیے کہ ہمیں اُن خبروں سے بحث نہیں کرنا ہے جو اخبار کے لیے اصل مسالا مہیا کرتی ہیں۔ وہ بالکل الگ ایک حصہ ہے۔ خبریں کیسی ہی ہوں، وہ خبریں ہوتی ہیں اور خبریں رہتی ہیں۔ جب اُن خبروں کی بنیاد پر کچھ اور لکھا جاتا ہے وہ اڈیٹوریل نوٹ ہو، کوئی مضمون ہو ،کوئی افسانہ ہو، نظم ہو یا ڈرامہ، تب ادب اور صحافت کی یہ بحث شرع ہوتی ہے۔ صحافت کا جو اجتماعی اور تجارتی طریق کار ہے، اگر یہ کسی ادیب کے مزاج کا جز بن جائے اور اُس کا طرزِ عمل بھی مکمل طور پر وہی ہو جائے جو ایک اخبار کے ایڈیٹر کا ہوتا ہے، جس کو روز ایک زوردار اڈیٹوریل لکھنا ہے، تو پھر اُس کی تحریریں بھی اخباروں کی ادارتی نگارشات کی طرح بے تہہ رہیں گی۔ وہ پرشور اور پر زور کتنی ہی ہوں اور چٹک بھڑک ان میں جیسی بھی ہو، وہ سچے ادب کا حصہ نہیں بن پائیں گی۔ اور ان کے متعلق شاعر کی زبان میں یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ:

اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمانِ صبح

شخصیت کی دورنگی سے ہم میں سے کون واقف نہیں ہوگا اور اس دورنگی کے کرشموں سے بھی۔ دورنگی ہے تو الگ الگ وقفوں میں الگ الگ انداز کا ظہور میں آنا بھی لازم ہے۔ یہاں بھی ایک دو مثالوں سے بات کی اچھی طرح وضاحت کی جا سکے گی۔ نیاز فتح پوری کے ادیب ہونے سے کون انکار کر سکے گا۔ اور کسی کے رائے دینے کی ضرورت ہی نہیں، اُن کی تحریریں ان کو ادیب ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اس کے باوجود، اُن کی سب تحریروں کا اُن کے سوانح کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ ہوگا کہ اُن کی شخصیت میں ادبیت اور تجارت دونوں کا حصہ تقریباً برابر کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات یہ طے کرنا آج بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ نیاز کی فلاں خاص تحریر رسالہ ''نگار'' کے تجارتی اغراض و مقاصد کے

تحت وجود میں آئی تھی یا وہ ایک ادیب کا تقاضائے اظہار تھا۔ آپ رسالہ نگار کے ملاحظات کو پڑھیں جو ادارتی نوٹ کے طور پر رسالے کے شروع میں شامل ہوتے تھے، تو ان میں اور کسی اچھے روزنامہ اخبار کے اڈیٹوریل میں کچھ زیادہ فرق محسوس نہیں ہوگا۔ پھر ان کے وہ خط پڑھیں جو رسالے میں چھپتے رہتے تھے تو معلوم ہوگا کہ یہ تو انشا ہی انشا ہے اور ادب ہی ادب ہے۔ اس کے بعد ایسا کوئی مضمون پڑھیں جو روشن خیالی اور آزادئ فکر و نظر کی دعوت دیتا ہو تو خیال آئے گا کہ یہ تو مفکرانہ رنگ ہے ایک دانشور کی تحریر کا۔ اسی ذیل میں بعض ایسی تحریریں بھی سامنے آئیں گی جن کے متعلق ساری خوش کمائی کے باوصف یہ طے کرنا مشکل ہوگا کہ یہ کس جذبے یا کس منصوبے کے تحت لکھی گئی ہیں، مگر بار بار یہ بدگمانی دل میں پیدا ہوگی کہ یہ تو نیاؔز صاحب کی اُس دوسری یعنی تجارتی شخصیت کا اظہار ہے۔ یوں دیکھئے تو نیاؔز کے یہاں ادبیت بھی اور صحافت بھی، فرق یہ ہے کہ ہم نیاز کو صحافی نہیں کہہ سکتے، ہاں ان کی ایسی تحریروں کو صحافیانہ ضرور کہہ سکتے ہیں۔

ایک اور مثال کرشن چندر کی ہے۔ ان کا ادیب ہونا مسلّم ہے، لیکن شہرت پا جانے کے بعد انھوں نے افسانہ نگاری کو صحافیانہ سطح پر بھی اختیار کر لیا تھا یوں وہ مجبور ہوئے بہت لکھنے پر اور بہت کچھ لکھنے پر۔ یہاں بھی وہی یہی صورت ہے کہ کچھ تحریریں خالص ادبی ہیں اور کچھ تحریریں صحافیانہ ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ادیب تھے، مگر جب شعوری طور پر اُن کا انداز بدلتا تھا اور تخلیق کا عمل معاشی ضرورت کے تابع ہو جاتا تھا تو اس کی سطح بھی بدل جاتی تھی اور انداز بھی۔ جب زاویہ بدلتا تھا تو تحریریں بھی بدل جاتی تھی اور کسی منجھے ہوئے اخبار نویس کی طرح وہ لکھتے چلے جاتے تھے۔ جس کی سطح تو بہت روشن تھی، مگر گہرائی اور تہہ داری سے نسبت باقی نہیں رہتی تھی۔

ایک اور بہت اچھی مثال خواجہ حسن نظامی کی ہے۔ خواجہ صاحب کو ادیب کون نہیں مانے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ماننا ہوگا کہ خواجہ صاحب کے یہاں تجارتی سوجھ بوجھ بھی بلا کی تھی، اور جسے صحافیانہ انداز کی منصوبہ بندی کہنا چاہیے، اُس میں اُن کو کمال حاصل تھا۔ کیسے کیسے معرکے لڑے ہیں انھوں نے اخبار کی سطح پر یہاں ایک بات اور بھی تھی کہ اُن کے زیادہ مخاطب وہ لوگ تھے جن کو ادب کا قاری کہنے کے بجائے اخبار کا قاری کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ خواجہ صاحب کو اس کا ہمیشہ لحاظ رہتا تھا، اور یوں رہتا تھا کہ اُنھوں نے منصوبہ بند طبیعت پائی تھی۔ وہ کوئی مولانا محمد علی تو تھے نہیں کہ محض جاں بازی

کے جذبے میں سرشار ہمہ وقت سر سے کفن باندھے رہتے تھے۔ وہ ایک اچھے صحافی، ایک اچھے تاجر، ایک دیدہ ور انسان کی طرح معاملات و مسائل کو دیکھتے تھے اور اپنے خاص انداز کو کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔ اب آج آپ ذرا اطمینان سے بیٹھ کر اُن کی تحریروں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ صحافیانہ انداز کی تحریروں کا بہت بڑا حصہ ہے اُن کے یہاں وہ ادیب بھی تھے، صحافی بھی تھے اور تاجر بھی تھے۔ کبھی ایک حیثیت غالب آجاتی تھی اور کبھی دوسری جہت چمک اٹھتی تھی۔

بس ایک اور مثال، جو پچھلی مثالوں سے ذرا مختلف ہے کہ اُس کے اثرات بہت ہمہ گیر رہے ہیں۔ یہ بہت صحیح بات ہے کہ مگر اسی قدر صحیح بات یہ بھی ہے کہ آج جب ہم اُن تحریروں کا جائزہ لینے بیٹھتے ہیں جو اُس تحریک کے زیر اثر وجود میں آئیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا ایک حصہ تو وہ ہے جس کی ادبیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ایک حصہ وہ ہے جو اس قدر با اثر ہو چکا ہے کہ اخباری تحریروں کی دوسری شکل معلوم ہوتا ہے اسی کو صحافیانہ ادب کہا جاتا ہے یہاں نہ تجارت مدِ نظر تھی اور نہ ایسی کوئی اور وجہ ادیب پر حاوی تھی، بس بات یہ تھی کہ جیسے اخبار میں خبروں کو مرتب کرنے والا اور ٹی وی پر خبریں پڑھنے والا محض دوسروں کے احکام کی تعمیل کرتا ہے، اُس عمل میں اُس کی ذات اور اُس کے جذبہ و احساس کی شمولیت نہیں ہوتی، اسی طرح بہت سے لکھنے والوں نے ایک منشور اور ایک طے کردہ نقطۂ نظر کے تحت بہت کچھ لکھا تھا۔ بہ ظاہر ہر فرق جو بھی مکمل طور پر یہ وہی طریق کار تھا جو صحافت سے نسبت رکھتا ہے۔ یہ لوگ صحافی نہیں تھے مگر ان کی تحریروں کا شمار صحافیانہ ادب ہی میں کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسی مفروضہ اور مبینہ ادبی تحریروں کا انجام وہی ہونا چاہیے تھا جو باضابطہ صحافیانہ تحریروں کا ہوتا ہے، یہی ہوا۔ جہاں یہ طریق کار حاوی نہیں ہو پایا، وہاں ادبیت کے لیے گنجائش باقی رہی اور بہ قدر فرق مراتب اس نے نمود حاصل کی۔

اُس کے مقابلے میں یہ دیکھیے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی بہت سی تحریریں ایسی ہیں جو ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے لیے لکھی گئی تھیں، اُن میں سے اکثر وقتی اور ہنگامی مسائل سے متعلق تھیں مگر اُن کی ادبیت آج بھی مسلّم ہے۔ وہی بات ہے کہ مولانا کا اندازِ نظر صحافیانہ نہیں تھا۔ ان کی شخصیت، اُن کی طبیعت، اُن کا جذبہ اور اُن کا احساس، یہ چیز ان تحریروں میں شامل ہے۔ یہ ادب ہے۔ پھر ایک بات بھی ہے کہ مولانا نے سب کے لیے نہیں لکھا تھا۔ اصل مخاطب کون ہیں، اُن کا تعین اُن کے ذہن میں واضح طور پر موجود تھا۔ اس امتیاز نے بھی اُن کی تحریروں کو عوامی یا عامیانہ نہیں بننے دیا۔ سب کے لیے لکھتے تو پھر اپنا انداز اُن کو بدلنا پڑتا اور خواجہ حسن نظامی کی زبان میں بات کرنا پڑتی۔

اس ساری بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اصل چیز لکھنے والے کا طرزِ عمل ہے، اُس کا اندازِ فکر اور اندازِ نظر۔ بہت اچھے صحافی کی تحریر ادبی ہو سکتی ہے، اور بہت اچھے ادیب کی تحریر صحافیانہ ہو سکتی ہے۔ ادب اور صحافت میں دور کی نسبت ہے، مگر یہ دونوں نسبتیں ایک ہی شخص میں بہ خوبی جمع ہو سکتی ہیں، اور اُس کی تحریروں میں نمایاں ہو سکتی ہیں۔ صحافت کا جو مزاج اور انداز ہے اُس سے ہم سب واقف ہیں۔ جب ادیب بھی اسی طرز اور اسی انداز کو اپنائے گا تو وہ صحافیانہ ادب کی تشکیل کی ذمّے داری کو اپنے اوپر مسلط کر لے گا۔

اُردو میں صحافیانہ ادب کی کمی نہیں۔ اس سرمایے کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب لوگ یا تو وہ تھے جو ادب کو صحافت کے انداز سے تجارت کا مال خیال کرتے تھے، یا وہ لوگ تھے جن کے یہاں یہ دونوں لہریں اٹھتی، پھیلتی تھیں، یوں کبھی ادبیت چمک جاتی تھی، کبھی صحافیانہ انداز غالب آ جاتا تھا۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ بڑا ادیب اور سچّا ادیب وقتی اور ہنگامی مفاد کو مطمحِ نظر قرار نہیں دیتا۔ اس سطحیت کو وہ اُن لوگوں کے لیے چھوڑ دیتا ہے جو خسارے کا سودا کرنے کے قائل نہیں ہوتے اور ہر قیمت پر اور ہر انداز سے دنیاوی کامیابی کو اصل چیز سمجھتے ہیں۔

آخر میں یہ بات بھی کہنے کی ہے کہ ’’ادبی صحافت‘‘ اور ’’صحافیانہ ادب‘‘ میں جو فرق ہے، اسے ضرور رکھنا چاہیے۔ اس لفظ یعنی ’’ادبی صحافت‘‘ کو اگر ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جائے تو پھر اس کا اطلاق ادبی یا نیم ادبی رسالوں پر بہتر طور پر ہوگا۔ مگر یہ ایک الگ اور ایک مستقل موضوع ہے جو ایک مفصل مقالے کا طلب گار ہے، اسی لیے میں اس تحریر میں جس کا مقصد ادب اور صحافت کے ربطِ باہم پر کچھ گفتگو کرنا ہے، ادبی رسائل یا یوں کہیے کہ ادبی صحافت کے متعلق کچھ کہنا چاہتا۔

(تلاش و تعبیر، رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1988، صفحہ 288 تا 295)

(اُردو صحافت مسائل اور امکانات، مرتب، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2006، صفحہ 55 تا 61)

☆☆☆

مراسلہ رشید حسن خاں
شاہ جہاں پور

عابد شاہ جہاں پوری

ذیل میں دلؔ صاحب کے ایک محنتی شاگرد جناب عابد شاہ جہاں پوری کی تین غزلوں کا انتخاب درج ہے۔اگر آپ ''الحمراء'' میں شامل کرسکیں تو بسم اللہ۔رشید

1

چُپ ہوں اُٹھا کے پردہ در کُچھ نہ پوچھیے
ٹکرا گئی نظر سے نظر کچھ نہ پوچھیے
تنہائیوں کا لُطف کہاں راہِ عشق میں
ناصح بھی ہے شریکِ سفر کچھ نہ پوچھیے
دیر و حرم سے کوئی تسلی نہ ہو سکی
مجھ سے مرا مذاقِ نظر کچھ نہ پوچھیے

2

نازک تھا آبگینۂ دل ٹھیس لگ گئی
ان پرسشوں کا اب کوئی حاصل نہیں رہا
لب آشنا ہوئے گلۂ سوز و ساز سے
اب عشق احترام کے قابل نہیں رہا
ہر جورِ ناروا تھا محبت میں اک کرم
در پردہ پُرسشوں سے وہ غافل نہیں رہا
کیوں لب پہ ہیں گلے خلشِ اضطراب کے
دل کو جہاں سکون ہوا دل نہیں رہا

جھکتی ہے ذرّے ذرّے پہ عابد جبینِ شوق
میں خود اب احترام کے قابل نہیں رہا

3

برق اکثر تڑپ کے گرتی ہے
آشیاں کو اب آشیاں کہیے
التجا کے ہیں مختلف پہلو
خامشی کو بھی اک زباں کہیے
وہ ہوا عشق میں جو ہونا تھا
اور کیا آگے داستاں کہیے

(رسالہ الحمراء، لاہور، مدیر حامد علی خاں، جلد 5، جولائی، 1953، صفحہ 25)

☆☆☆

محفلِ احباب

رشید حسن خاں

جناب ڈاکٹر سلیم نے اپنے مترجمہ افسانے کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ ''خیابان'' فارسی زبان میں باغ کو کہتے ہیں، لیکن ایران جدید میں خیابان کا لفظ سڑک کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ''خیابان'' فارسی میں باغ کے لیے استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ مگر اس کا مفہوم دوسرا ہے ایران میں بعض راستے ایسے ہوتے ہیں جن پر پہ در پہ درخت اس طرح لگے ہوتے تھے کہ ان کا سایہ راستے پر پڑتا تھا جس سے ایک خنکی سی رہتی تھی۔ اسے خیابان کہا جاتا تھا۔ بعد کو وہ باغ کی روش کے معنی بھی استعمال ہونے لگا۔ ہندوستان میں بالعموم اس کے ہی دوسرے معنی معروف میں (ملاحظہ ہو بہار عجم) اب وہ ایران جدید میں مطلق سڑک کے معنی بھی استعمال ہوتا ہوگا لیکن باغ کے معنی میں فارسی قدیم میں حسب قول سلیم صاحب میری نظر سے کہیں نہیں گزرا اور نہ کسی لغت ہی میں اس کے یہ معنی نظر دیکھا ہو تو مطلع فرمائیں تاکہ میری معلومات میں ایک اضافہ ہو جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آج کل نئے غزل گو شعرا، میں ایک عجیب رجحان بڑھ رہا ہے۔ یہ حضرات غزل اور نظم میں اسلوب و زبان کے اعتبار سے کوئی فرق محسوس نہیں کرتے نتیجہ یہ ہے کہ ان کی غزلیں حسن تغزل اور شیرنی و گداز سے معرا ہوتی ہیں۔ غزل کی زبان، نظم کی زبان سے بالکل علاحدہ ہوتی ہے لیکن یہاں ہر چیز ایک ہی میزان پر بولی جاتی ہے۔ غزل بڑی کافر صنفِ سخن ہے اس میں اُس وقت تک نکھار پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ دل خون نہ ہو جائے۔ اس شمارہ میں دوسری غزلوں کے علاوہ تاجور صامری کی غزل خاص طور پر محل نظر ہے۔ انھوں نے اس کی ردیف ہی میر متغزلانہ کہی ہے، پھر اور کس چیز کو کہا جائے۔ فیاض صاحب اور علوی صاحب کے طنزیہ خاکے بہت دل چسپ ہیں۔ خصوصاً علوی صاحب کا مختصر سا طنزیہ خاکہ نہایت عمدہ چیز ہے۔ پڑھ کر کئی واقعے یاد آ گئے۔

(رسالہ الحمراء، لاہور، مدیر حامد علی خاں، جلد 5، جولائی، 1953، صفحہ 43)

☆☆☆

محفلِ احباب

رشید حسن خاں

جولائی کے الحمراء میں ترتیبِ نو کے ضمن میں جناب پروفیسر سراج احمد صاحب علوی کے خاکے پڑھ کر بے حد تعجب ہوا کہ پروفیسر صاحب نے ایسی عجیب وغریب مکتبی مسامحت فرمائی ہے جس کی داد نہیں دی جاسکتی۔ معلوم ہوتا ہے یا تو علویؔ صاحب نے مضمون کو غور سے نہیں پڑھا یا محض کسی کی روایت پر اعتبار کر کے اپنی رائے ظاہر کر دی۔ موصوف نے مندرجۂ ذیل الفاظ مثالاً نقل کیے ہیں:

اسرا، نخسہ، تخمہ، صقیل، قابلی چنا، چنیدہ، دوبارہ۔

علویؔ صاحب کی رائے میں میں نے قابلی چنا اور صقیل وغیرہ کو غلط العام کے تحت جائز بتایا ہے۔ حالاں کہ یہ بات قطعاً غلط اور غلط ہے۔ یہ الفاظ قسم چہارم سے ماخوذ ہیں۔ قسم چہارم میں میں نے ایسے الفاظ جمع کیے ہیں جن کو عوام الناس ناواقفیت و جہالت کے سبب سے غلط بولتے ہیں اور ان الفاظ کے مقابل صحیح الفاظ بھی لکھ دیے ہیں۔ علویؔ صاحب اگر جون کے شمارے کو غور سے پڑھیں تو ان کو معلوم ہوگا کہ میں صقیل کو غلط اور اس کے مقابل فصیل کو صحیح لکھا ہے۔ معلوم نہیں موصوف خط لکھتے وقت کس عالم میں تھے کہ سخن فہمی کے عالم بالا کا مظاہرہ فرماتے چلے گئے۔ پھر اگر وہ میرے مضمون کو شروع سے پڑھتے تو یہ شکل آسان ہو سکتی تھی۔ مضمون کی پہلی قسط میں قسم چہارم کی تعین میں میں نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس قسم میں صرف وہ الفاظ ہوں گے (مثالاً) جن کو عوام الناس غلط بولتے ہیں۔ میں اس عبارت کو بجنسہ نقل کرتا ہوں:

''چوتھی قسم کے الفاظ بالیقین غلط ہیں کیوں کہ وہ پڑھے لکھے افراد کے استعمال میں بہ ایں بہت نہیں آتے۔ ان کو صرف وہ لوگ استعمال کرتے ہیں جو نسخے کو نخسہ، مزاج کو مجاز اور فصیل کو صفیل بولتے ہیں اور جس کی مہملیت عیاں ہے، استعمال عام کا یہ مطلب نہیں کہ ہر دہقانی و نااہل کی بات قابلِ قبول ہو (مطبوعہ نومبر 52)''

میرا خیال ہے کہ اب علویؔ صاحب کو اس کا شکوہ نہیں رہے گا کہ میں نے شاہ جہاں پوری

زبان کو آفاقی بنانے کی کوشش کی ہے یا بہ الفاظ دیگر سارے شاہ جہاں پوری نخسہ اور قنخمہ بولتے ہیں۔ مجھ کو افسوس ہے کہ علوی صاحب نے اس مضمون کو ایک خاص زاویہ اور ایک مخصوص نگاہ سے دیکھا۔ کاش ان کو اس مضمون میں کوئی مفید بات بھی مل سکتی۔

میرا یہ خیال ہے کہ اگر صاحب نظر افراد طنز و تعریض کے بجائے سنجیدگی اور افہام و تفہیم کے جذبے کے ساتھ اس مضمون پر نظر کریں تو انسب ہے ورنہ جلی کٹی سُنانے سے سوائے اس کے کہ زبان کے ساتھ ذہن بھی بگڑ جائے اور کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔

اس شمارے میں مجھ کو فیاض محمود صاحب کا طنزیہ خاکہ ''درست'' بے حد پسند آیا۔ نہایت عمدہ طنز اور بڑی کامیاب عکاسی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ طنز میں کہیں تیزی یا تلخی نہیں پیدا ہوئی نیز یہ کہ اپنے موضوع کے مناسب سے وہ مختصر بھی ہے۔ اور یہ دونوں باتیں فنی اعتبار سے بڑی اہم ہیں، اگر وہ اس خاکہ کو ذرا اور بڑھا دیتے یا کہیں بھی کوئی تیز جملہ لکھ دیتے تو اس کی ساری خوبی ختم ہو جاتی۔ کاش ہمارے نئے ادبی مجاہد ایسی چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

(رسالہ الحمراء، لاہور، مدیر حامد علی خاں، جلد 5، شمارہ نمبر 2، اگست، 1953، صفحہ 96)

☆☆☆

رشید حسن خاں سے انٹرویو

(اُردو کے ممتاز محقق رشید حسن خاں سے پاکستان میں یہ انٹرویو محمد طفیل،اڈیٹر نقوش ،لاہور،ڈاکٹر اکرام چغتائی،ڈاکٹر معین الرحمٰن ،ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، تحسین فراقی ،عطاالحق قاسمی، بیدار سرمدی نے لیا ہے جسے ہم روزنامہ قومی آواز لکھنؤ کے شکریہ کے ساتھ شائع کرر ہے ہیں۔)

اکرام چغتائی : خاں صاحب! اُردواملا آپ کا خاص موضوع رہا ہے اس پر کتابوں اور مقالوں کی شکل میں بہت کام ہوا ہے۔عرصہ ہوا انجمن ترقی اُردو نے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کی سر براہی میں ایک املا کمیٹی بنائی تھی۔پھر ترقی اُردو بیورو (دہلی) نے بھی ایک ایسی ہی کمیٹی تشکیل دی تھی۔ان کمیٹیوں نے کیا کام کیا؟ان کے بعد آپ نے اس موضوع پر ضخیم کتاب لکھی۔اس کے کیا محرکات تھے۔آپ کی کتاب کے بعد اُردو املا کی الجھنوں کو دور کرنے میں کیا مدد ملی ہے؟

رشید حسن خاں : سب سے پہلے میں اپنا یہ خوش گوار فریضہ سمجھتا ہوں کہ قاسمی صاحب کا شکریہ ادا کروں، جنھوں نے یہ موقع دیا۔کہ میں آپ کے سوالات کے جواب دے سکوں اکرام چغتائی صاحب نے بڑا الجھا سوال کیا ہے اُردو کی صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک کوئی لغت جدید اصولوں کے مطابق مرتب نہیں ہوئی۔اس بنا پر اُردو الفاظ کے معانی کا تعین تو ہوتا ہے۔لیکن املا کا تعین نہیں ہوتا بالعموم ہماری کتابیں کاتب لکھتے ہیں۔اگر ایک کتاب چار جلدوں میں ہے اور اسے چار کاتبوں نے لکھا ہے ممکن ہے کہ ایک لفظ کی ایک سے زیادہ املا کی شکلیں ان جلدوں میں پائی جائیں۔انگریزی کی کوئی لغت اٹھالیں اس میں آپ کو ہجے کا تعین ملے گا۔معانی کا تعین ملے گا۔اور استعمال کا تعین ملے گا۔اس کے برعکس اُردو کی لغت دیکھیں تو اس میں استعمال کو تعین ہوگا۔معانی کا تعین ملے گا۔لیکن املا کا تعین نہیں ہوگا۔کیوں کہ یہ کاتب پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے انجمن نے اس پر توجہ کی۔کیوں کہ زبان کے لیے یہ بات باعث خوبی نہیں ہے کہ اس میں

املا کے ضابطے تعین نہ ہوں۔ میرے خیال میں تھا کہ اُردو لغت مرتب کرتے وقت تو الفاظ کو کیسے لکھا جائے گا۔اب دیکھیے کہ لغت میں لفظ درج ہوتے ہیں۔حروف تہجی کی نسبت سے مثال کے طور پر میں ایک لفظ لیتا ہوں 'مہندی'۔مہندی کو کچھ لوگ لکھتے ہیں (م ن ہ د ی)۔کچھ لوگ لکھتے ہیں (م ہ ن د ی)...لغت میں یہ لفظ دوسری فصل میں آئے گا۔جب تک آپ یہ طے نہیں کریں گے کہ اس لفظ کا معیاری املا کیا ہے؟اس وقت تک لغت میں اس لفظ کے اندراج کی صحیح شکل متعین نہیں کی جا سکتی ہے۔

اس صورتِ حال نے مجھے متوجہ کیا کہ میں اس موضوع پر کچھ کام کروں۔چناں چہ میں نے 1960 کے اواخر میں اس موضوع پر با قاعدہ طور پر کام شروع کیا۔مرحوم ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اس زمانے میں زندہ تھے اور وہ واحد شخص تھے جو املا کے معاملے میں اپنی ساری عمر صرف کر چکے تھے۔میں نے ان سے ہدایت اور رہنمائی کی درخواست کی تو انھوں نے بڑی خوشی سے ہاں کر دی۔1972 میں مسلسل 12 سال کی کوشش کے بعد میں اپنی کتاب ''اُردو اِملا'' کو مرتب کر سکا۔جس میں ان ساری چیزوں کو یکجا کر دیا گیا ہے جو اب تک لکھی گئیں تھیں۔ان میں بنیاد بنایا گیا ہے انجمن ترقی اُردو کی املا کمیٹی کے اس فیصلے کو جو 1944 میں کیا گیا تھا۔اس کتاب میں، میں نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اس موضوع پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اور وہ مستند قابل قبول اور معیاری ہے۔اسے یکجا کر دیا جائے اس میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ املا اور رسم خط دو الگ چیزیں ہیں۔ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم چیزوں کو گڈمڈ کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ہم رسم خط میں اصلاح چاہتے ہیں۔حالاں کہ رسم خط میں اصلاح نہیں ہوتی.....اصلاح ہوتی ہے املا میں۔رسم خط نام ہے روش کا...املا نام ہے لفظوں میں حرف کے تعن کا۔اور اس کے لکھنے کے طریقے کا۔غرض اس سات سو صفحات کی کتاب میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اس میں سارے مسائل یکجا ہو جائیں۔مجھے مسرت ہے کہ اس زمانے میں جب کہ زبان اور قواعد کی طرف توجہ کم ہے اس کتاب کی۔بڑے اثرات ظاہر ہوں گے علاوہ اور اثرات کے...مجھے بہت تعجب ہوا کہ بمبئی سے دو افسانہ نگاروں کے مجموعے آئے۔ان دونوں مجموعوں کے سرورق پر لکھا ہے کہ اس کتاب کا املا رشید حسن خاں کی کتاب اُردو املا پر لکھا گیا ہے۔ہمارے یہاں جب کوئی شخص لکھنے بیٹھتا ہے تو اس وقت وہ سوچتا ہے کہ میں کیسے لکھوں۔یہ خیال اس سے پہلے نہیں آتا یعنی املا نے ہمارے یہاں موضوع کی اہمیت حاصل نہیں کی تھی۔میں نے کوشش کی ہے کہ اس کو یہ اہمیت حاصل ہو جائے اور آدمی

جب لکھنے بیٹھے تو اس کے ذہن میں ہو کہ اس لفظ کو کیسے لکھنا ہے۔

یہ ایک عجیب صورتِ حال ہے کہ جن حروف کے بدلنے سے معنی بدل جاتے ہیں ہماری اس طرف بالکل توجہ نہیں ہے۔فارسی میں دو حروف ہیں الگ الگ ۔ایک ہے''گذشتن''،''ذ'' سے اور ایک ''گزشتن''،''ز'' سے ۔''ذ'' کا خاندان دوسرا ہے اور''ز'' کا خاندان دوسرا۔مگر آپ عبادت گزار''ذ'' سے لکھیں گے تو اس کے معنی ہوں گے عبادت ترک کرنے والا اور اگر آپ عبادت گذار''ذ'' سے لکھیں گے تو اس کے معنی ہوں گے عبادت کرنے والا۔''آذر''ایک لفظ ہے۔اگر آپ ''ذ'' سے لکھیں گے اس کے معنی ہوں گے آگ...اور اگر''ز'' سے لکھیں گے تو اس کے معنی حضرت ابراہیمؑ کے والد یا چچا کا نام...لفظ''معمار'' ہے۔اگر اسے''ہ'' سے لکھیں گے تو اُردو کے سیکڑوں شعر بحر سے خارج ہو جائیں گے...تقاضا...شوربا...اس طرح کے بہت سے عام الفاظ ہیں جن کے آخر میں الف ہے لیکن ہم''ہ'' سے لکھتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی: جو انگریزی لفظ اُردو میں آئے ہیں مثلاً''اسٹیشن، سکول وغیرہ ان کے شروع میں کچھ لوگ الف لگاتے ہیں اور کچھ نہیں لگاتے۔کون سا درست ہے؟

رشید حسن خاں : اُردو کا یہ مزاج ہے کہ وہ لفظ کے شروع میں خوشے کو برداشت نہیں کرتی۔اس لیے معیاری تلفظ ہوگا الف کے ساتھ یعنی اسٹیشن، اسکول وغیرہ۔

تحسین فراقی :اس سے متعلق ایک سوال ہے مجھے اُردو املا ابھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔لیکن میں نے کتاب''اُردو تحقیق مسائل اور تجزیہ'' دیکھی ہے۔اس میں بھی املا کے مسائل ظاہر ہوئے ہیں۔مثلاً''بلکہ'' لکھا ہے تو''بل'' الگ ہے اور''کہ'' الگ ہے۔اسی طرح بوالہوسی ہے۔میرا سوال اس ضمن میں یہ ہے کہ یہ تو آپ نے درست کیا۔لیکن اس میں، میں نے یہ قباحت محسوس کی ہے کہ ہم بعض لفظوں کے املا کے حوالے سے ان کے معنی کا تعین کرتے ہیں۔مثلاً''بوالہوسی''اس کا ہم تعین ''بل'' کے حوالے سے کرتے ہیں جیسے ابوالکلام تو ظاہر ہے کہ جب ہم بوالہوسی کو اس کے معروف املا کے بجائے''بل''اور''ہوسی'' الگ لکھ دیں گے تو کیا اس کے معنی کے تعین کرنے میں دقت پیش نہیں آئے گی اور کیا اس سے مزید الجھن پیدا نہیں ہو جائے گی؟

رشید حسن خاں : آپ کے سوال کے دو حصے ہیں انھوں نے اصول طے کیا تھا کہ وہ

مرکب لفظ جو دو اجزا سے مل کر بنیں، ترجیحی صورت یہ ہے کہ ان کو الگ۔ الگ لکھا جائے۔ مثلاً؛ خوب صورت اس کو ہم خوب الگ لکھیں گے اور صورت الگ لکھیں گے...''چوں کہ'' اس میں چوں الگ اور کہ الگ لکھیں گے اور دلیل یہ دی گئی تھی کہ اُردو میں کئی حرفوں کو ملا کر لکھنے کا رواج عام ہے طالب علم کو ابتدائی سطح پر جوڑوں کے سمجھنے اور املا لکھنے میں آسانی ہو،اب سوال ہے ''بوالہوسی'' کی ایک غلط فہمی یہ ہے کہ یہ ''بوالہوسی'' لفظ اس قبیلے کا لفظ ہے جس میں ''ابو'' آتا ہے اور ''بو'' اس کا مخفف ہے....ایسا بالکل نہیں ہے۔اس میں وہ لفظ ہی نہیں ہے وہ ''ابو'' عربی کا لفظ ہے جیسے ابوالکلام....جس کے معنی بعد کے ہیں۔

''بوالہوسی'' عربی کا لفظ نہیں ہے فارسی کا لفظ ہے فارسی میں ایک سابقہ ہوتا ہے۔''بل کثرت'' کے معنی ہیں ''بل عجیب'' یہ ہوس اس قبیلے کا آدمی ہے۔اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ فارسی اور اُردو کے فرہنگ اثر میں بڑی صراحت سے لکھ دیا گیا ہے کہ اس لفظ کا صحیح املا بغیر ''ذ'' کے ہے۔کیوں کہ یہ فارسی لفظ ہے عربی نہیں۔

بیدار سرمدی : آپ نے فرمایا کہ بچوں کو سکھانے کے لیے یا وہ جو اُردو سیکھ رہے ہوں ،ان کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا تھا لیکن میں اس سلسلے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہم بچوں کو جو آج سکھاتے ہیں وہ کل ان کے کام آئے گا۔اور بڑی عمر میں یہ باتیں ان کے کام آئیں گی۔ پر ایک بات غور طلب ہے کہ مروجہ اصول کیا ہے؟ عام لوگ اس کو کس طرح سمجھتے ہیں۔مثلاً انجمن کے اس اصول کو کسی نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور شاید یہی اس میں خامی تھی۔کہ اسے قبول نہیں کیا گیا کہ اس میں وقت کی بچت کا پہلو نہیں ہے۔اگر چہ انجمن نے کچھ خامیاں دور کرنے کی کوشش کی۔لیکن میرے خیال میں اس سے خامیاں اور بڑھ گئی ہیں؟

رشید حسن خاں : پہلی بات تو یہ ہے کہ زبان جب کسی بچے کو سکھائی جاتی ہے تو زبان کی آزمائش گاہ بچے کی تعلیم ہوتی ہے۔اگر چہ کسی ایسے بالغ فرد کو زبان سکھائی جائے جس کی یہ زبان مادری نہ ہو تو دیکھا یہ ہے کہ وہ یہ زبان کیسے لکھے گا۔اُردو کی مشکل یہ ہے کہ اس میں حرفوں کے جوڑ الگ الگ ہیں۔یعنی ''ج'' ہے۔اس کے تین جوڑ ہیں۔یہ صرف تین طرح سے آتا ہے۔یہ صورت حال اُردو لکھاوٹ سیکھنے والوں کے لیے بڑی مشکل پیدا کرتی ہے۔اس لحاظ سے انجمن نے یہ طے کیا تھا کہ پہلی بار یہ صورت حال فورٹ ولیم کالج میں نظر آئی۔ جہاں سے جدید اُردو نثر کی باقاعدہ داغ بیل پڑی۔ جب

غیر ملکی طلبہ نے اُردو پڑھنا شروع کی تب معلوم ہوا کہ لکھاوٹ سکھانے اور پڑھنے کے اصل مسائل کیا ہیں۔ ہمارے یہاں طالب علم چوں کہ عربی، فارسی پڑھ کر آتا تھا، اس لیے یہ دقت پیش نہیں آتی تھی۔ تقسیم کے بعد جب یہ طریقہ ختم ہوگیا تو مشکل کا اندازہ ہوا۔ اب اُردو پڑھانا ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ جو اُردو پہلے پانچ سال میں پڑھائی جاتی تھی اگر آپ اسے اب دو سال میں نہیں پڑھاتے تو کئی مشکلیں پیدا ہوں گی۔ اس بنا پر یہ کوشش کی گئی کہ اگر لکھنے میں ہم اصولوں کو توڑے بغیر آسانی فراہم کر سکتے ہیں جن سے لفظوں کے ٹکڑے کرنے اور سیکھنے میں آسانی ہو تو یہ بہتر ہوگا.... رہی چلن کی بات.... تو یہ تجاویز پیش کی جاتی ہیں تو یہ لازمی نہیں کہ سب کو قبول کرلیا جائے۔ ایک وقفہ درکار ہوتا ہے اور اس وقفے کے بعد وقت خود فیصلہ کرتا ہے کہ اتنی چیزیں قبول عام میں آئیں اور اتنی نہیں آئیں۔

تحسین فراقی : ان سے جو الجھن پیدا ہوگی، فرض کیا کہ اس طریق کار کو اپنا لیا جائے اور آیندہ کتابیں انھیں اصلاحات کی روشنی میں لکھی جائیں تو سوال یہ ہے کہ جو کتابیں پہلے لکھی جا چکی ہیں اور ہمارا کئی سو سال کا جو تہذیبی سرمایہ ہے اس کا کیا بنے گا؟

رشید حسن خاں : اگر یہ بات آپ کہیں گے تو آپ بڑی مشکلوں کو دعوت دیں گے۔ ہماری جو پرانی چھپی ہوئی کتابیں ہیں اگر ان کو معیار بنائیں گے تو آپ کوئی اصلاح کر ہی نہیں سکتے.... آپ نہ دیکھیے کہ وہ لفظ جس کا ایک نقش بچے نے ایک سطح پر سیکڑوں سے ملتے جلتے نقش وہ اپنے آپ سیکھ لے گا۔ ہماری پرانی کتابوں میں پیراگرافنگ نہیں ہوتی تھی۔ ان میں فل اسٹاپ اور کومے کا وجود نہیں تھا۔ بہت سی باتوں کا تعین نہیں تھا۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ زبان کے ساتھ دوسرے مسائل خود بہ خود حل ہوجاتے ہیں۔

تحسین فراقی: میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایک طرف آپ کی انجمن نے جو فیصلے کیے وہ مثالی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کی عملی صورت حال کیا ہے۔ خود انجمن بھی عملی طور پر اس کو اختیار نہیں کر سکی۔ ان چیزوں کو عام کرنے والی چیزیں اخبارات اور جرائد میں آپ نے بعض ایسے الفاظ کا املا بھی تبدیل کیا ہے جو مروج ہیں۔ مثلاً ''بشرطیکہ، چونکہ، کیونکہ'' وغیرہ.. تو کیا اب اس سے مزید انتشار کی کیفیت پیدا نہیں ہوگی؟

رشید حسن خاں : انجمن نے بیس سال تک اپنی ساری مطبوعات میں املا کی پابندی

کی، تقسیم کے فوراً بعد جہاں اور بہت سی ٹوٹ پھوٹ ہوئی انجمن کا نظام بھی درہم برہم ہو گیا لیکن اب مکتبہ جامعہ کی جتنی کتابیں چھپتی ہیں ان میں اس املا کی پابندی مکمل کی جاتی ہے۔ ترقی اُردو بورڈ (دہلی) اس املا کی پابندی کرتا ہے۔ پرانے پن پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ ہم اس طرح اصرار کرتے رہیں گے تو کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ آپ یہ دیکھئے کہ جو تبدیلی کی جارہی ہے وہ صحیح ہے یا غلط اور اس سے آسانی ہوگی یا مشکلات میں اضافہ ہوگا... یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ چیزوں کو قبول کرنے کے لیے ایک وقفہ درکار ہوتا ہے اور وقفہ گذرنے کے بعد اس بات کا فیصلہ ہوتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی : ہم بات کر رہے ہیں املا کی اور آپ نے ہندوستان میں بیٹھ کر یہ کام مکمل کیا، میرے ذہن میں کچھ اور خدشات بھی ہیں کہ ہم املا کے تحفظ کی بات کر رہے ہیں لیکن وہاں رسم خط بھی محفوظ ہے کہ نہیں؟

رشید حسن خاں : یہ بہت اچھا سوال ہے۔ یہ عجیب صورت حال ہے کہ اب سے پہلے رسم خط کی اہمیت کا احساس اُردو والوں کو اتنا نہیں تھا جتنا اب ہے... یہ احساس اب شدت اختیار کر رہا ہے۔ کہ اگر رسم خط ختم ہو گیا تو صرف زبان ہی ختم نہیں ہوگی بل کہ تہذیب ہی ختم ہو جائے گی۔ اس کی خوش گوار صورت یہ ہے کہ ساؤتھ میں جنوبی ریاستوں اور مہاراشٹر وغیرہ میں انہوں نے زبان اور رسم خط کو تہذیب سے جوڑ لیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہر شخص اصرار کرتا ہے کہ رسم خط یوں ہی رہے گا، کیوں کہ اگر یہ نہ رہا تو وہ تشخص ختم ہو جائے گا جو زبان اور اس زبان کو بولنے والوں کی تہذیب کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ خیال اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا کہ رسم خط تہذیب کی نمایندگی کرتا ہے۔ اب جب سے یہ خیال آیا ہے بعض حالات کی بنا پر تب سے یہ خطرہ کم ہو گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ رسم خط رہے گا یا نہیں، اس بارے میں یہ عرض کروں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ تقسیم کے فوراً بعد حالات بے حد خراب رہے۔ اس حد تک خراب رہے کہ اچھے خاصے لوگوں میں مایوسی پیدا ہوگئی۔ لیکن اس کے بعد حالات سدھرنا شروع ہوئے اور اب صورت حال یہ ہے کہ مایوسی کی جگہ اُمید نے لے لی ہے اور اس کا امکان ہے کہ سارے حقوق نہ پا سکے تو اتنے حقوق ضرور پالیں گے کہ وہ زندہ رہے۔

عطاء الحق قاسمی : اس سلسلے میں بہت سارے لوگوں پر بہت سارے فرائض عائد ہوتے ہیں لیکن وہاں جو اُردو لکھنے والے ادیب ہیں ان پر کم از کم یہ ذمہ داری تو عائد ہوتی ہے کہ ان کے

بچے اُردو سیکھتے ہوں۔ میرے علم میں یہ بات آئی کہ ہمارے بہت سے ہندوستانی ادیب دوست ایسے ہیں جن کے بچے والدین کی چیزیں نہیں پڑھ سکتے؟

رشید حسن خاں : آپ نے بڑی دکھتی رگ پر اُنگلی رکھی ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ اُردو والے دوسروں کی اتنی شکایت کرتے ہیں جن میں حکومت اور سیاسی جماعتیں شامل ہیں۔ اس کے مقابلے میں اپنی ذمہ داریوں پر توجہ نہیں دیتے۔ میں ایک بات اور عرض کروں، اُتر پردیش سے میرا تعلق ہے۔ وہاں چار ہزار پرائمری اُردو اساتذہ کا تقرر ہوا اور یہ کہا گیا کہ ہر اسکول میں ایک اُردو اُستاد ہوگا۔ تقرر تو ہو گیا لیکن بہت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان میں بہت کم نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا اور اُردو کو ذوق وشوق سے نہیں پڑھایا۔ یہی صورت حال ان والدین کی ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے بچوں کو پبلک اسکولوں میں پڑھاتے ہیں۔ وہاں پبلک اسکولوں میں اُردو نہیں ہے۔ جب کہ صاحب استطاعت لوگ اپنے بچوں کو پبلک اسکولوں میں پڑھانا چاہتے ہیں۔ اب یا تو کوئی آدمی رکھیں جو شام کو آکر انھیں اُردو پڑھائے اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان کے بچے اُردو سے آشنا ہیں۔ جو ایسا نہیں کرتے ان کے بچے آشنا نہیں ہیں۔ آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ایسی متعدد مثالیں ہیں کہ وہ لوگ جو اُردو کے نام کی روٹی کھاتے ہیں جن کی شہرت اُردو پر مبنی ہے ان میں سے بعض کے بچے اُردو زبان سے ناآشنا ہیں۔ اور بڑی اندوہ ناک صورت حال ہے۔ اور یہ اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ ہم نے شکایت کرنا سیکھا ہے۔ کام کرنا نہیں سیکھا۔

تحسین فراقی: ان کی بھی صحیح معنوں میں مجبوری ہے کہ زبان کا مسئلہ تو معاشی بھی ہے جو شخص اُردو پڑھے گا اس کے لیے وہاں وہ معاشی آسودگیاں نہیں ہیں جو دوسروں کے لیے ہیں۔ ایسی صورت میں اُردو کی طرف کون توجہ دے گا؟

رشید حسن خاں : یہ آپ نے صحیح بات نہیں سوچی یا اس کا صحیح تاثر قبول نہیں کیا۔ یاد رکھیے کہ صرف اُردو پڑھنے سے نوکری نہیں ملتی۔ اسکولوں میں جو بچہ پڑھتا ہے اسے ایک زبان کے علاوہ وہ چار مضامین اور بھی پڑھنے پڑتے ہیں۔ اُردو ٹیچر کم ہوتے ہیں جو اُردو میں ایم۔اے کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ بالکل نہیں ہے۔ ملازمت کا کوئی تعلق اُردو سے نہیں ہے۔ بل کہ بعض جگہ ترجیح دی جاتی ہے۔ جو شخص ہندی اور انگریزی کے ساتھ اُردو بھی جانتا ہو.... یہ تاثر غلط ہے صرف اُردو پڑھ کر تو یہاں آپ کے ملک

میں بھی نوکری نہیں ملے گی۔ جب تک دوسرے مضامین نہیں پڑھے جائیں گے۔

معین الرحمٰن: آپ نے کئی جگہ لکھا ہے کہ اگر ہم سب لوگ جو تحقیق کے مارے ہوئے ہیں یہ محسوس کرتے ہیں کہ اُردو میں جو ادبی تحقیق ہے، حافظ محمود شیرانی اس کے معلم اول ہیں۔ان کے نتائجِ فکر سے ہم نے بنیادی آداب سیکھے ان کا ایک کام ''پنجاب میں اُردو'' خاصا معروف کام ہے۔آپ سے گزارش کروں گا کہ حوالے کے ایک سے زیادہ مدارج ہیں ادبی تحقیق میں... یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے یہ فرمائیے کہ ''پنجاب میں اُردو'' حافظ محمود شیرانی صاحب نے اپنے نقطۂ نظر کے استدلال میں حوالوں کے جو مدارج درج کیے ہیں وہ کس حد تک ملحوظ رکھے ہیں؟

رشید حسن خاں : میں شیرانی صاحب کو تحقیق کا معلم اول مانتا ہوں۔ہم نے تحقیق کے آداب ان کی تحریروں سے سیکھے ہیں۔اس لحاظ سے وہ ہمارے معنوی اُستاد ہیں لیکن انھوں نے ہمیں یہ بھی سکھایا ہے کہ کانٹے پر تولی ہوئی بات خواہ کسی کی ہو اس کو تسلیم کیا جائے۔اب اگر ہم شیرانی صاحب سے اختلاف کرتے ہیں تو ہم اُستاد کے بتائے ہوئے سبق کو دہراتے ہیں۔شیرانی صاحب نے اس پر اصرار کیا ہے کہ وہ حوالہ قابل قبول ہے جو شک سے پاک ہو۔اور جس کی سند مل سکے۔ایک طرف تو صورت حال یہ ہے کہ شیرانی صاحب نے امیر خسروؒ کی غزلوں کی نفی کی ہے۔دوسری طرف ''پنجاب میں اُردو'' جوان کی مشہور کتاب ہے اس میں انھوں نے طریق کار اختیار کیا ہے کہ معتبر حوالوں کے ساتھ وہ حوالے قبول کر لیے ہیں۔جوان کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق قابل قبول نہیں ہو سکتے۔مثلاً انھوں نے جگہ جگہ بیاضوں کے حوالے دیے ہیں۔جب کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ بیاضوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ لازماً حوالہ نہیں ہے۔جب تک اس کی تصدیق کسی اور طرح نہ ہو جائے اس بنا پر کہ بیاضیں جو لوگ مرتب کیا کرتے تھے وہ اپنے ذوق کے مطابق اچھا شعر یا اچھا جملہ لیا کرتے تھے۔ان کو اس سے تعلق نہیں ہوتا تھا کہ یہ کس کا ہے۔انھوں نے جس سے پوچھا یہ کس کا ہے اس نے جس کا بتایا لکھ لیا، اس کی کوئی سند نہیں ہے۔اور پھر شیرانی صاحب نے اس میں مختلف رسائل میں چھپے ہوئے مضامین پر اکتفا کر لیا۔صورت حال یہ ہے کہ ہماری کتابوں ،رسالوں اور بیاضوں میں بے شمار باتیں ایسی لکھی ہیں جن کی سند تحقیق کے اصولوں کے مطابق قابل قبول قرار دیا ہے۔میں نے لکھا ہے کہ جب میں یہ بات کہہ رہا ہوں تو میں اُستاد کے پڑھائے ہوئے سبق کو ہی دہرا رہا ہوں جب ہم کوئی چیز طے کر لیتے ہیں اور پھر کام

شروع کرتے ہیں تو ہمیشہ یہی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ شیرانی صاحب نے طے کرلیا تھا کہ اس بات کو ثابت کرنا ہے اور اس بات کو ثابت کرنے میں بھی کو حوالہ ملا۔ اس کو انھوں نے بلا تکلف قبول کرلیا۔ تحقیق کے لیے یہ بات زہر قاتل ہے کہ پہلے کوئی بات طے کرلی جائے اور پھر اس پر کام ہو۔

تحسین فراقی: رشید حسن خاں صاحب اسی ذیل میں ایک ضمنی سوال ہے کہ تحقیقی خلفسار کی ذمہ داری آپ یونی ورسٹی کے اساتذہ پر کس حد تک عائد کریں گے؟

رشید حسن خاں: حالات نے ادبی تحقیق کو یونی ورسٹیوں میں شرنارتھیوں کی طرح پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ کیوں کہ پہلے جو کام ہوتے تھے وہ اب نہیں ہو رہے ہیں۔ بدنصیبی یہ ہے کہ ہماری یونی ورسٹیوں میں زبان کا علم اور اس کا معیار بہت ہی پست ہوتا جا رہا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کو کلاسیکی ادب سے ناواقفیت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ فارسی جانتے ہوں۔ اب فارسی کا چلن ختم ہوتا جا رہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تحقیق ہمہ وقتی کام ہے۔ ایک صاحب جو پانچ کمیٹیوں کے ممبر ہوں۔ سات جگہ ممتحن ہوں مختلف پراجیکٹ پر کام کر رہے ہوں۔ ایک میگزین کے اڈیٹر بھی ہوں وہ بھلا تحقیق کیا کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کی دانش گاہوں میں اس وقت ادبی تحقیق کا معیار انتہائی پست ہے۔ اب تک جو کام یونی ورسٹیوں سے آئے ہیں ان میں کم و بیش چالیس فی صد اس قابل ہیں کہ ان کو تعزیرات کے تحت مجرم سمجھا جائے، طالب علم کو نہیں۔ کیوں کہ وہ بچہ تھا... اس پر جو نگراں تھے اور جنھوں نے اس کام کا امتحان لیا وہ قابل سزا ہیں۔

معین الرحمٰن: اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا سوال اور ہے کہ آپ تدوین کو تحقیق سے آگے کی منزل کہا کرتے ہیں، یعنی جو شخص شرائط تحقیق کو پورا کرتا ہو وہ اصول تدوین سے پوری طرح واقف ہو تقسیم کے بعد پاکستان اور بھارت میں تدوین کے جو کام ہوئے ہیں وہ آپ کی نظر میں کیا ہیں؟ ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

رشید حسن خاں: اُردو میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ ہم نے اصطلاحوں کو الگ الگ نہیں کیا۔ ہم تحقیق اور تنقید کو ایک سمجھتے ہیں۔ اس طرح تدوین اور تحقیق کو ایک کر دیتے ہیں۔ حالاں کہ یہ الگ ہیں۔ جو آدمی تحقیق سے مزاجاً مناسبت رکھتا ہو زبان اور قواعد کا عالم ہو اور جس عہد کی کتاب ہو، اسے جانتا ہو، تدوین کا حق ادا کرسکتا ہے۔ گویا تدوین، تحقیق سے آگے کی منزل ہے۔ پاکستان میں

پچھلے بیس سال میں جو کام ہوا ہے ہے میں اس سے پوری طرح واقف نہیں ہوں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اِدھر کی کتابیں اُدھر نہیں آتیں اور اُدھر کی اِدھر نہیں آتیں۔اس بارے میں کچھ صحیح بات نہیں کہہ سکتا۔البتہ ہندوستان کے بارے میں بتا سکتا ہوں کہ پچھلے تیس سال میں میری نظر میں صرف تین کتابیں ہیں جو تدوین کے معیار پر پوری اُترتی ہیں،میری نظر میں وہ ہیں...دیوانِ غالب نسخۂ عرشی،مکاتیبِ غالب مرتبہ عرشی،اور تذکرۂ دستورالفصاحت مرتبہ عرشی صاحب۔اس کے بعد میری نظر میں ایسا کوئی کام نہیں ہے جو تحقیق کے معیار پر اس طرح پورا اترتا ہو،جس کی ہم توقع کرتے ہیں...البتہ مسعود حسین رضوی نے دیوان فائز دہلوی مرتب کیا ہے وہ بھی بڑی حد تک اس دائرے میں آتا ہے۔

رفیع الدین ہاشمی:آپ نے اس میں کوئی کام کیا؟

رشید حسن خاں : مجھے تدوین کا کوئی بڑا کام نہیں ملا۔شیرانی صاحب نے ''مجموعہ نعت''،مرتب کیا تھا لیکن وہ تدوین کا اچھا نمونہ نہیں ہے۔یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ہمارے وہ محقق یعنی قاضی عبدالودود صاحب اور حافظ محمود شیرانی صاحب تدوین کوئی بڑی چیز نہ دے سکے۔تدوین کو اگر کسی نے فن اور موضوع کی حیثیت سے اختیار کیا تو صرف امتیاز علی خاں عرشی نے۔

محمد طفیل :آپ نے فرمایا کہ تحقیق ہمہ وقتی کام ہے اور جیسا کہ ابھی ذکر آیا کہ ہماری یونی ورسٹیوں کا کام بڑے مایوس کن ہیں۔آپ نے فارسی کا بھی ذکر کیا فارسی سے معمولی شدبد کافی نہیں ہے۔اس صورت حال کے پیش نظر کیا۔ہمیں ہندوستان اور پاکستان میں تحقیق اور تدوین کے مستقبل سے مایوس ہو جانا چاہیے؟

رشید حسن خاں : جی نہیں!مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔میرا مطالبہ یہ ہے کہ آپ اس کام کی ذمہ داری نہ لیں جس کو پورا نہ کرسکیں...اگر آپ اٹھارویں یا اُنیس ویں صدی کو منتخب کرتے ہیں تو لازمی ہے کہ آپ فارسی جانتے ہوں۔

تحسین فراقی: اس ضمن میں ایک اور سوال ہے کہ ہندوستان کی یونی ورسٹیوں میں جو عام طور پر تحقیق کا کام ہو رہا ہے،ان میں زندہ شخصیات پر بھی کام ہوتا ہے۔لیکن زندہ شخصیات پر جو کام وہاں ہو رہا ہے ظاہر ہے اس میں بہت سے خدشات ہیں،بہت سے خطرات ہیں اور تحقیق کلی طور پر ممکن ہی نہیں ہے...اس کے مقابلے پاکستان میں ایسی صورت حال نہیں ہے...میرا سوال یہ ہے کہ کیا زیادہ بہتر

نہیں ہوگا کہ زندہ شخصیات پر کام کرنے والے کے بجائے زندہ موضوعات کا انتخاب کیا جائے؟

رشید حسن خاں : آپ نے بہت اچھا سوال کیا۔ مجھے پاکستان کے کام کے متعلق نہیں معلوم کہ یہاں کے موضوعات کیا ہیں۔ میں اصولاً بات کر سکتا ہوں۔ میری یہ قطعی طور پر رائے ہے کہ کسی زندہ شخصیت کو تحقیق کا موضوع نہیں بنانا چاہیے۔ جب تک آخری سانس ہے تبدیلی اور تغیر کی گنجائش ہے۔ آدمی کا نقطۂ نظر بدلتا ہے۔ واقعات بدلتے ہیں، پھر ایک بات اور کہ سچائیاں اور حقیقتیں اپنے آپ کو ایک دم نمایاں نہیں کرتیں، بالترتیب سامنے آتی ہیں...اصل میں ہوا یہ کہ ہم سہل پسندی کے عادی ہو گئے۔ اور خوشامد کو اپنا شیوہ بنالیا۔ زندہ شخصیات پر تحقیق میں یہ دونوں باتیں ہیں۔

محمد طفیل: ڈاکٹر رشید حسن خاں صاحب نے بہت کام کیا وہ اپنی جگہ ہے۔ لیکن جو لوگ کام کر رہے ہیں میں یہ سمجھتا ہوں کہ چلتے کاموں میں یہ روڑہ اٹکاتے ہیں اور وہ چلتے کام رُک جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''تاریخِ ادبِ اُردو'' جو علی گڑھ میں چھپی اس پر تنقید کے بعد دوسری جلد نہیں چھپ سکی۔ اس طرح اور بھی مثالیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم ان کی تحقیق سے فائدہ اٹھا رہے ہیں یا نقصان؟

رشید حسن خاں : آپ نے مجھے موقع دیا کہ میں اس بات کا جواب دوں۔ آپ کا ترقی اُردو بورڈ لغت شائع کر رہا ہے۔ اس ادارے کو جتنا سرمایہ اور وقت ملا اور جتنا بڑا عملہ ہے۔ دوبارہ اُردو والوں کو ان میں سے کوئی چیز شاید ہی ملے۔ اس مرحلے پر اگر ناقص کام ہوا تو ایک طرف وہ طلبہ کو ہمیشہ کے لیے گمراہ کرے گا۔ اور دوسری طرف ایک اچھے کام کی بنیاد ختم ہو جائے گی۔ میں نے جب اس لغت پر تبصرہ کیا تو میرا مقصد اس کتاب سے عیب نکالنا نہیں تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اس کتاب کی دس بارہ جلدیں جو ابھی باقی ہیں ان میں صحیح طریق کار اختیار کیا جائے۔ میں نے جمیل جالبی صاحب کی تاریخ ادب اُردو کی جلد اول پر تبصرہ لکھا، مقصد تبصرہ کرنا نہیں تھا اور نہ یہ کہ جمیل جالبی صاحب پر اعتراض کروں۔ مقصد یہ تھا کہ اس پر تاریخ کی تین جلدیں ابھی باقی ہیں ان میں وہ اغلاط نہ ہوں جو پہلی جلد میں تھیں۔ آپ دیکھیے کہ جمیل جالبی صاحب نے دو سال کے وقفہ کے بعد دوسری جلد مرتب کی.....میرا مقصد یہ کہ ایسا کام نہ ہو کہ جو طلبہ گمراہ کرے... میں ہر کتاب کو تبصرے کا حق دار نہیں سمجھتا اور تبصرہ کرتے وقت کسی شخصیت کو سامنے نہیں رکھتا جب میں دیکھتا ہوں کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے سے طلبہ کو نقصان پہنچے گا تو میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس کتاب پر تبصرہ کروں۔

اکرام چغتائی: آپ کی آخری کتاب 1978 میں طبع ہوئی۔ بہت سے ایسے علمی منصوبے ہوں گے۔کیا آپ ایسے زیرِ کار مضمون کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟

رشید حسن خاں: اُردو کی بعض ایسی کتابیں ہیں جو ہر نصاب میں شامل ہوتی ہیں، وہ متعدد بار طبع ہوئی ہیں۔لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک ان کا کوئی تنقیدی متن شائع نہیں ہوا۔ایسی کتب میں ،میں اس وقت تین کتابوں کے جدید اصولوں کی روشنی میں تنقیدی متن تیار کر رہا ہوں۔یہ تین کتابیں ہیں''نوطرزِ مرصع''،''باغ و بہار''اور''فسانۂ عجائب''۔ان میں اس وقت ''فسانۂ عجائب'' کے متن کی کتابت ہوگئی ہے۔اور بقیہ دونوں کتابوں کے متن کو آخری شکل دے رہا ہوں۔ان متون کی تدوین میں، میں نے مستند قلمی نسخوں اور طباعتوں کو سامنے رکھا ہے۔اس کے بعد ہر کتاب کے ساتھ اس کے تنقیدی تحقیقی اور متنی پہلوؤں پر علاحدہ جلد شائع ہوگی۔اور اس کے لیے پاکستان اور ہندوستان کے اہلِ قلم سے مقالات لکھوائے جائیں گے۔

عطاء الحق قاسمی: آپ پہلی بار پاکستان آئے ہیں،آپ کو یہ ملک کیسا لگا؟

رشید حسن خاں: مجھے تو بھئی یہ ملک بہت پسند آیا۔صرف کراچی اور لاہور دیکھ سکا ہوں۔لاہور سے تو میری بڑی یادیں وابستہ ہیں۔میری تصنیفی زندگی کا آغاز تو یہیں سے ہوا تھا۔تقسیم کے فوراً بعد میرے اکثر مضامین یہاں کے رسالے''الحمرا''میں شائع ہوئے۔سچ پوچھیے ،یہاں کی زندگی میں تصنع اور دولت کی نمائش کم ہے۔لوگ خلوص اور محبت سے ملتے ہیں جو یہاں کی پرانی تہذیبی روایات کا اثر ہے۔

(ماہ نامہ خبر نامہ،اُتر پردیش اُردو اکادمی،لکھنؤ،نگراں رام لعل،مئی،1985،صفحہ 39 تا 53)

☆☆☆

اُردو تحقیق اور املا کے مسائل سے متعلق، رشید حسن خاں سے ایک انٹرویو

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

(یہ بات چیت 25 جنوری 1989 کو خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں ہوئی تھی، جہاں جناب رشید حسن خاں، ادارۂ تحقیقاتِ اُردو کی جانب سے منعقد تیسری اُردو ریسرچ کانگریس میں شرکت کے لیے دہلی سے تشریف لائے تھے۔ م ا خ)

ممتاز: جناب رشید حسن خاں! آپ کی حیثیت اُردو تحقیق میں ستون کی ہے، آپ پر ہماری نظر اُن بزرگ محققوں کے بعد ٹھہرتی ہے جو ہم سے رُخصت ہو گئے، یعنی قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم۔ ان بزرگوں کے بعد اُردو تحقیق کے میدان میں ایک خلا سا ہو گیا ہے۔ ایسے میں غنیمت ہے کہ آپ کی ذات گرامی ہمارے درمیان موجود ہے اور ہم مختلف تحقیقی اور لسانی مسئلوں میں جب ضرورت محسوس کرتے ہیں تو آپ سے رجوع کرتے ہیں اور آپ بھی نہایت ہی خندہ جبینی سے ہمارے مسئلوں کو حل کرتے اور سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ اس نشست میں چاہتا ہوں کہ آپ سے اُردو تحقیق اور املا وغیرہ سے متعلق کچھ سوالات کروں۔ میرا سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ آپ نے تحقیق کا کام کس کس میدان میں کیا ہے؟ میری مراد شاعری کی تحقیق، تلفظ و املا اور محاورات کی تحقیق اور تحقیقی غلطیوں کی تحقیق وغیرہ سے ہے؟

رشید: آپ نے تو میری تعریف اتنے لفظ کہہ دیے اور ایسا پیرایہ اختیار کیا کہ جیسے شاعری میں اختیار کیا جاتا ہے جس میں مبالغہ بہت ہوتا ہے۔ میں اتنی تعریف کا مستحق ہرگز نہیں ہوں۔ بہت ہی چھوٹا سا کام کیا ہے میں نے۔ اتنا کام نہیں کیا ہے جتنا مجھے کرنا چاہیے تھا۔ بہر حال آپ کی عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ادبی سوال کا جواب دینا میرے لیے خوش آئین بات رہی ہے۔ اس طرح بہت سی باتیں جو

تحریر میں نہیں آتیں وہ بیان میں آجاتی ہیں۔ جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے، میں عرض کروں کہ میری توجہ زیادہ تر ادبی تحقیق پر رہی ہے۔ ادبی تحقیق ایک جامع لفظ ہے، اس میں سب کچھ شامل ہے ،ادب کی ساری اصناف اوران سے متعلق حقائق۔ جیسا کہ آپ معلوم ہے تحقیق دراصل گم شدہ حقیقتوں کی بازیافت کا دوسرا نام ہے، یعنی وہ حقیقتیں جوموجود تھیں لیکن اب ہم کو صحیح طور پر معلوم نہیں۔ ان کو دوبارہ دریافت کرنا تاکہ علم میں صحیح طور پر اضافہ ہوسکے اور واقعات کو صحیح طور پر ترتیب دیا جاسکے۔ تحقیق کا یہی مقصد ہوتا ہے۔ یہاں پر ضمنی طور پر میں ایک بات کہہ دوں، میں نے یہ بات پہلے بھی کئی بار کہی ہے اور لکھی ہے کہ زندہ لوگوں کو جو تحقیق کا موضوع بنایا جاتا ہے میں اس کو تحقیق کے لیے زہرِ قاتل سمجھتا ہوں اور اسے نہایت درجہ غیر تحقیقی کام قرار دیتا ہوں یا یہ کہ ایسے عنوانات جو تحقیق کے ذیل میں دراصل نہیں آتے ان کو اختیار کیا جاتا ہے مثلاً ''پریم چند کے ناولوں میں عورت کا کردار'' ''کرشن چندر کے ناولوں میں سماجی حقیقت نگاری'' ایسے کام کو ہم تحقیق کے ذیل میں نہیں لاسکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اور ایسے سب موضوعات تعبیرات پر مبنی ہوتے ہیں۔ تحقیق حقائق کی بازیافت ہے۔ محقق حقائق کی تشکیل نہیں کرتا حقائق کا سراغ لگاتا ہے اس لیے کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ہمیں پوری طرح یا صحیح طور پر معلوم نہیں۔ چوں کہ میں عربی اور فارسی کا ذوق ساتھ لے کر اس میدان میں آیا تھا، ان زبانوں میں ان چیزوں پر بہت کم زور دیا جاتا ہے اس لیے مجھے اس کا خاص خیال رہتا تھا کہ جب کوئی لفظ میری زبان سے ادا ہو یا میرے قلم سے نکلے تو مجھ کو یہ بات معلوم ہو کہ اس لفظ کا تلفظ کیا ہے؟ اس کا املا کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ اور اس کا محلِ استعمال کیا ہے۔ تو مجھے یہ ذوق پیدا ہوا کہ یہ سب باتیں معلوم کروں اور اس میں چیزیں بڑھتی گئیں۔

سب سے زیادہ مجھے املا کے مسئلے میں خلفشار نظر آیا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ ہے جو میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں: 53-1952 کی بات ہے کہ میں درجہ میں کھڑا ہوا پڑھا رہا تھا۔ اُس زمانے میں، میں ایک ہائر سکنڈری اسکول میں اُستاد تھا۔ ایک بچے کی کاپی میرے پاس اصلاح کے لیے آئی۔ میں نے اس میں دو لفظوں پر خط کھینچ دیا اور دو غلطیوں کے دو نمبر کاٹ لیے۔ جب وہ لڑکا کاپی لے کر واپس چلا گیا تو پھر تھوڑی دیر میں آیا میرے پاس اور اُس نے کہا ''سر آپ نے میرا نمبر کیوں کاٹ لیا'' میں کہا کہ تم نے دو لفظوں کا املا غلط لکھا ہے۔ ''بھروسا'' کے آخر میں تم نے ''ہ'' (بھروسہ) لکھا ہے، اس کے آخر میں

''الف'' ہونا چاہیے اور ''گزرنا'' تم نے ''ذ'' (گذرنا) سے لکھا ہے، اس میں ''ز'' ہونا چاہیے۔ وہ نہایت خموشی کے ساتھ اپنی ڈیسک پر گیا اور وہاں سے اپنی کتاب اُٹھا لایا جو نصاب میں شامل تھی۔ اس نے کہا ''دیکھیے سر! اس میں یہ الفاظ اُسی طرح لکھے ہوئے ہیں جس طرح میں نے لکھے ہیں۔'' اس وقت مجھے جو شرمندگی ہوئی اس کا نقش آج تک میرے دل پر ہے کہ لڑکے نے مجھے غلط ثابت کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک ہی لفظ ایک ہی کتاب میں ایک صفحے پر ایک طرح لکھا ہوا ہے اور دوسرے صفحے پر دوسری طرح۔ تب سے املا کا تصور میرے ذہن میں آیا اور مجھے خیال آیا کہ اس میں معیار بندی ہونا چاہیے۔

ممتاز : آپ کا پہلا مقالہ کس موضوع پر تھا اور کس رسالے میں طبع ہوا؟

رشید : بھئی یہ تو مجھے اچھی طرح یاد نہیں، لیکن یہ بات خوب یاد ہے کہ میرے لکھنے کا آغاز شاعری کی تنقید سے ہوا تھا۔ شاعری مجھے آج بھی بہت پسند ہے اور تنہائی کے لمحوں میں میں شعری مجموعہ ضرور پڑھتا ہوں۔ وہ میرا بہترین رفیق ہوتا ہے۔ مجھے اپنا ایک پُرانا مضمون یاد آتا ہے جو غالباً 1950 میں ''نگار'' میں شائع ہوا تھا۔ مضمون کا عنوان تھا ''شبلی کی فارسی شاعری'' اسی زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے یا بعد میں ایک مضمون احمد ندیم قاسمی کی قطعات نگاری پر میں نے لکھا تھا۔ تو میرے لکھنے کا آغاز شاعری کی تنقید سے ہوا اور اس سے مجھے اپنے ذوق کی تربیت میں بہت مدد ملی۔

ممتاز : شروع کے زمانے میں جب آپ نے لکھنا شروع کیا تو آپ کے مقالات کن کن رسالوں میں چھپے؟

رشید : خاص طور سے دو رسالوں میں ''نگار'' اور ''شاعر''۔ اور ان کے بعد ''اُردو ادب'' میں جو علی گڑھ سے نکلتا تھا۔

ممتاز : کیا آپ نے کبھی شعر بھی کہے اور آپ کی شعری تخلیق کہیں شائع بھی ہوئی؟

رشید : جی نہیں۔ میں نے یہ غلطی دوسروں کی طرح کبھی نہیں کی۔ اس زمانے میں جب مشاعرہ ہوتا تھا تو لڑکوں کو غزلیں پڑھنا پڑتی تھیں اور ان کو غزلیں کہاں سے یاد ہوتی تو ان کو بہت سی غزلیں لکھ کر دیا کرتا تھا۔ اس کو میں تفریحی کام سمجھتا تھا۔ مجھے اس بات کا عرفان پہلے ہی ہو گیا تھا کہ میں شعر نہیں کہہ سکتا۔ شعر کہنے اور بنانے میں فرق ہے۔ ہمارے بیش تر حضرات شعر بنایا کرتے ہیں۔ شعر کہنے کی تخلیقی صلاحیت میرے اندر نہیں تھی اور اس کا شعور مجھے شروع میں ہو گیا تھا۔ اس لیے میں اس غلط فہمی میں کبھی

گرفتار نہیں ہوا اور میں اچھے کام کرنے والوں کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ انھیں اس کا عرفان ہونا چاہیے کہ وہ شعر بنا سکتے ہیں۔یا کہہ سکتے ہیں۔اگر شعر بنانے تک کی بات ہو تو انھیں اس پھیر میں نہیں پڑنا چاہیے۔

ممتاز: اب تک آپ کی کتنی کتابیں طبع ہو چکی ہیں؟

رشید: اب میں گنتی تو کرنے سے رہا،لیکن جن کتابوں نے شہرت پائی اور جن کو میں قابلِ ذکر سمجھتا ہوں تو وہ تو آپ کے سامنے ہیں ان میں ایک ''اُردو املا'' ہے جو شاید اُردو میں اب تک اس موضوع پر سب سے مفصل کتاب ہے۔مجھ سے بعض لوگوں نے کہا کہ ہندوستان کی اور زبانیں ہیں ان میں سے بھی کسی زبان میں اس موضوع پر اس طرح کا کام نہیں ہوا ہے۔میری ایک اور کتاب ''زبان اور قواعد'' جس میں تلفظ کے مسائل اور شعری قواعد کے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ایک اور کتاب ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' ہے جس میں جس میں ادبی تحقیق کے اصولوں اور اس کے اطلاقی طریقۂ کار پر گفتگو کی گئی ہے۔،اس کے پہلے حصے میں ادبی تحقیق کے بعض اصولوں پر گفتگو ہے اور دوسرے حصے میں چار کتابوں پر تبصرہ ہے۔لیکن میرا ایک کام مجھے بہت زیادہ عزیز ہے وہ ہے''انتخابِ ناسخ'' کا مقدمہ۔''انتخابِ ناسخ'' کو مکتبہ جامعہ نے شائع کیا تھا۔اس پر میں نے ایک سو بیس صفحے کا مقدمہ لکھا تھا۔اس مقدمے میں، میں نے پہلی بار یہ ثابت کیا ہے کہ آج تک تاریخِ ادب میں اس بات کو غلط طور پر پڑھا جاتا رہا ہے کہ ناسخ نے زبان کی اصلاح کی۔ناسخ نے زبان کی کوئی اصلاح نہیں کی،وہ ایک نئے رنگِ سخن کے بانی تھے۔ان کا ایک انداز ہے۔یہ جو کہتے ہیں کہ انھوں نے فلاں لفظ کا استعمال ترک کیا یا متروکات کی فہرست بنائی۔تو یہ کام ان کے مرنے کے پندرہ بیس سال کے بعد ان کے شاگرد رشک نے کیا اور اس کو ناسخ سے منسوب کر دیا۔میں نے پہلی بار اس بات کو ثابت کیا اور واضح کیا کہ ناسخ کا کلیات جو چھپا ہے اس میں ان کے شاگرد رشک نے بہت سی تحریفیں کر دی ہیں۔یعنی وہ مقامات جہاں ناسخ نے ایسا لفظ یا محاورہ یا اندازِ بیان اختیار کیا تھا جس کو رشک نے بعد کو متروک قرار دیا،تو ایسے سارے مقامات کو انھوں نے بدل دیا ہے۔پھر میں نے ''شبلی کے مضامین'' مرتب کیے اور اس پر مقدمہ لکھا جس میں یہ بحث کی کہ شبلی نقاد تھے؟ کیا انھیں محقق کہہ سکتے ہیں۔پھر میں نے شرر لکھنوی کی کتاب ''گذشتہ لکھنؤ'' مرتب کی۔جس پر مقدمہ لکھا اور جس میں لکھنوی تہذیب کے اس پہلو پر گفتگو کی کہ یہ تہذیب اس قدر جلد ختم کیوں ہو گئی اور یہ ظاہر کیا کہ تہذیب بنتی ہے بنائی نہیں جاتی اور لکھنؤ میں ایک تہذیب بنائی گئی تھی

اور وہ جلد ختم ہوگئی۔ 'اُردو املا' جس کا ذکر ابھی آچکا ہے وہ بہت ضخیم ہے اس کے مباحث بہت وسیع اور مشکل ہیں تو فرمائش کی گئی کہ طلبہ اس سے استفادہ نہیں کر سکتے تو ان کے لیے ایک چھوٹی سی کتاب ''اُردو کیسے لکھیں''، لکھی، جسے مکتبہ جامعہ نے چھاپی۔ یہ اسّی پچاسی صفحے کی کتاب ہے۔ ابھی میرے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ''تلاش و تعبیر'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں فیض کی شاعری اور جوش کی شاعری پر جو مضامین ہیں وہ خاصے مقبول ہوئے ہیں اور ان کو جگہ جگہ نقل کیا گیا ہے۔

ممتاز: ان کتابوں کے علاوہ آپ نے جو کتابیں مرتب کی ہیں ان کتابوں کے نام بھی اگر بتا دیں تو بہتر ہوگا؟

رشید: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے معیاری ادب کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ نصابی ضرورت کے پیشِ نظر فوری سطح پر متن پیش کر دیا جائے اور جس میں دو صفحے کا مقدمہ ہو تو اس تو اس ذیل میں بہت سے کام ہوئے جو قابلِ ذکر نہیں ہیں۔ البتہ اب میں نے جو سلسلہ شروع کیا ہے کہ اُردو کے کلاسیکی متن جن کے پڑھنے اور پڑھانے میں بہت دقتیں پیش آتی ہیں، ان کو اس طرح ایڈٹ کیا جائے کہ لفظوں پر اعراب لگائے جائیں، Punctuation کی پابندی کی جائے اور آوازوں کو مثلاً معدولہ ،غنّہ یا مخلوط آواز اِن سب کو ظاہر کرنے کے لیے علامتوں کا استعمال کیا جائے۔ میں اس سلسلے میں پچھلے آٹھ دس سال بل کہ زیادہ مدت سے ''فسانۂ عجائب'' اور ''باغ و بہار'' کے متن کو مرتب کر رہا تھا، اب وہ کام مکمل ہوگیا ہے اور میرا خیال ہے کہ 'باغ و بہار' کی اشاعت اسی سال کے آخر تک ہو جائے گی۔ اس کے بعد 'فسانۂ عجائب' بھی چھپ کر آ جائے گا، کام مکمل ہو چکا ہے۔

ممتاز: اگلا سوال یہ ہے کہ املا کے مسئلے پر املا کمیٹی کی جانب سے آپ کی خصوصاً اور دیگر حضرات کی عموماً جو سفارشات آئیں ان پر طرح طرح سے ردِّ عمل ہوا۔ ایک اہم ردِّ عمل یہ تھا اور ہے کہ اُردو کی جانی پہچانی اور متعارف صورت کو مسخ کرنے کی ایک کوشش ہے اور عربی اور فارسی سے اُردو کا جو تعلق ہے اسے منقطع کرنے کی ایک سازش ہے، آپ اس پر کیا تبصرہ فرمائیں گے؟

رشید: ہمارا قومی المیہ یہ ہے کہ ہم بہت جذباتی ہیں۔ ہم ہر مسئلے پر خواہ وہ کتنا ہی علمی ہو، کیسا ہی قومی ہو، کیسا ہی اہم ہو، جذبات کی روشنی میں گفتگو کرتے ہیں۔ ہم غور تو کرتے ہی نہیں اس لیے حقائق ہمارے سامنے آتے ہی نہیں۔ املا کے مسئلے کو لیجیے، آپ دیکھیں گے کہ میں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ

میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے جو میری تصنیف ہو، میری کہی ہوئی ہو، تنہا میری ہو۔ اس میں وہ باتیں ہیں جو پہلے کہیں یا لکھی جا چکی ہیں۔ ان کو میں نے یکجا کیا ہے تا کہ ممکن حد تک معیار بندی ہو سکے اور یکسائی آسکے۔ بھئی یکسانی تو کبھی آتی نہیں اور نہ کبھی آسکتی ہے اور نہ اس پر اصرار کرنا چاہیے۔ ہمارے یہاں جن پریس شروع ہوا (اس کو بھی بہت زمانہ نہیں گزرا ہے) تو لیتھو پریس نے رواج پایا۔ ٹائپ نے رواج نہیں پایا لیتھو میں آپ دیکھتے ہیں کہ جو چھپتا ہے وہ مصنف کا لکھا ہوا نہیں ہوتا ہے۔ کاتب کا لکھا ہوا ہوتا ہے اور کاتب صاحبان ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہیں، مختلف علاقوں میں ہوتے ہیں اور مختلف استعداد کے ہوتے ہیں۔ ان کو یہ نہیں سکھایا جاتا کہ فلاں لفظ کا املا کیا ہے۔ ان کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ کسی لفظ کو خطاطی کے اصول کے مطابق کس طرح لکھا جائے۔ کاتبوں کو نستعلیق کے اصول آتے ہیں املا کے اصول نہیں آتے۔ ایک خطاط کے اُستاد 'گزرنا' ذال سے لکھتے تھے تو یہ بھی ذال سے لکھنے لگا یعنی 'گذرنا' اور ایک دوسرے خطاط کا اُستاد اسی لفظ کو 'ز' سے لکھتے تھے تو یہ 'ز' سے لکھنے لگا۔ پھر اس میں اخذ وترک کو دخل نہیں ہے، چوں کہ املا کو ہم نے کوئی موضوع سمجھا ہی نہیں تھا۔ اس لیے حال یہ ہے کہ بھروسا کہ آخر میں الف لکھ کر دیں یا 'ہ' تیار کو 'ط' سے لکھیں یا 'ت' سے، معمّا کے آخر میں 'الف' ہے یا 'ہ'، بحر زخار میں 'ز' ہے یا 'ذ' اس سے ہمیں کوئی مطلب ہی نہیں۔ تو اس طرح املا کے معاملے میں یہ طوائف الملو کی پھیلی، بکھراؤ پھیلا اور ایک ہی لفظ کو غیر ضروری طور پر کئی طرح لکھا جانے لگا۔ سب سے پہلے 1905 میں مولانا احسن مارہروی مرحوم نے اپنے رسالے 'فصیح الملک' میں املا کی طرف توجہ کی پھر ترقی اُردو بورڈ نے 1944 میں ایک کمیٹی مقرر کی، اس کی رپورٹ آئی پھر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے کام کیا۔ یہ سارے کام بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے یہ کیا کہ پچھلے ڈیڑھ سو برسوں میں جو کام ہوا تھا ان کو پڑھ کر اپنے سامنے رکھا اور ان کو ایک سلسلے میں منضبط کر کے یہ بتایا کہ ان کے اصول کیا، طریقے کیا ہیں۔ جو کچھ ہو چکا تھا ان کی علمی بنیادیں فراہم کیں۔ میں نے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہی تو عربی اور فارسی کے لفظوں کو مسخ کرنے کا الزام وہی رکھ سکتا ہے جو خالص جذباتی ہو اور جس نے علمی لحاظ سے چیزوں کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ میں ایک مثال دوں گا۔ ایک لفظ ہے 'مولا' (مولا بخش نام بھی آتا ہے) جب ہم اسے لکھتے ہیں تو اس کے آخر میں 'الف' لکھتے ہیں لیکن عربی میں تو مولیٰ 'ی' کے ساتھ لکھا جاتا ہے، اب کوئی شخص مولا بخش الف سے لکھے گا تو آپ کیا کہیں گے کہ اس نے عربی کے لفظ کی صورت مسخ کر دی

ہے؟ عربی کے وہ لفظ جن کے آخر میں عربی میں 'الف' کی آواز کے لیے 'ی' ہے (مثلاً مصطفیٰ، مرتضیٰ، مصفیٰ، معلیٰ وغیرہ) جب فارسی میں آئے تو فارسی میں ایسا کوئی قاعدہ نہیں تھا کہ 'ی' لکھ کر 'الف' پڑھا جائے تو وہاں یہ ہوا کہ لفظ جو خاص نام کے تھے اپنی شکل پر رہے اور جو لفظ خاص نام کے نہیں تھے ان میں سے کچھ میں تو تبدیلی ہوئی اور کچھ میں نہیں ہوئی۔ اور یہ ہوتا ہے۔ پھر وہاں سے جب یہ اُردو میں آئے تو یہاں بھی ایسا کوئی قاعدہ نہیں تھا۔ یہاں تو ہندی زبان میں الف کی آواز ایک () سے ظاہر ہوتی تھی تو یہاں کچھ اور لفظوں میں بھی یہ عمل ہوا اور اب صورت یہ ہوئی کہ بعض لفظوں کو تو الف سے لکھا جانے لگا اور بعض لفظوں کو پُرانے طریقے کے مطابق لکھتے رہے اور بعض لفظوں کو کبھی الف سے اور کبھی 'ی' سے لکھا گیا۔ آپ کوئی کتاب اُٹھا لیجیے اور دیکھیے۔ ایک لفظ ہے 'دعویٰ' یہ کہیں 'ی' سے لکھا جاتا ہے (دعویٰ) اور کہیں الف سے۔ میں ایک دل چسپ چیز بتاؤں کہ میر امن جدید اُردو نثر کے پہلے بڑے مصنف ہیں، ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کی کتاب 'گنج خوبی' کا مکمل مخطوطہ موجود ہے جس میں یہ جتنے الفاظ آئے ہیں ہر جگہ الف سے لکھے گئے ہیں۔

کہنا یہ ہے کہ یہ چیز رواج میں پہلے آچکی تھیں۔ میں نے صرف یہ کیا کہ ان سب کو یکجا کر دیا اور کہا کہ جو خاص نام ہیں جیسے عیسیٰ، موسیٰ، یحییٰ یا صفاتی نام جو خاص نام کی حیثیت اختیار کرتے جارہے ہیں، جیسے مصطفیٰ، مرتضیٰ، مجتبیٰ ان کو آپ 'ی' سے لکھ سکتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن جو اُردو الفاظ ہیں، جو دونوں طرح لکھے جاتے ہیں مثلاً دعوا وغیرہ جن کے آخر میں کبھی الف لکھا جاتا ہے اور کبھی 'ی' لکھی جاتی ہے۔ میں نے یہ کہا کہ مناسب یہ ہوگا کہ اس کو اور اس جیسے دوسرے لفظوں کو ایک ہی طرح لکھا جائے۔ یعنی ان کے آخر میں الف لکھا جائے۔ ایک لفظ 'منہدی' ہے، کوئی اسے صحیح طور پر 'منہدی' لکھتا ہے تو کوئی 'مہندی' لکھتا ہے۔ پھر چھپی ہوئی کتابوں اور لغت میں بھی یہ آپ کو دونوں طرح سے مل جائے گا۔ اب اگر آپ نصاب کی کتاب مرتب کرنے بیٹھیں تو آپ یہ تو نہیں کر سکتے کی چھٹے کی کتاب میں منہدی لکھیں اور ساتویں کی کتاب میں مہندی۔ کوئی ایک صورت تو متعین کرنا پڑے گی نا آپ کو۔ اس میں غلط صحیح کا سوال نہیں مرجح صورت کا سوال ہے۔ لسانیات میں تو کچھ غلط ہوتا ہی نہیں ہے، ترجیح ہوتی ہے۔ مثلاً ایک لفظ ہے 'مُنہ' اور ایک لفظ ہے 'مینہ' جس کا مخفف ہوتا ہے مِنہ، مینہ کی جب 'ی' نکل گئی تو تخفیف کی حالت میں مِنہ بچا۔ منہدی کا پہلا ٹکڑا وہ آواز ہے جو منہ کا ہے تو ہم اصولی بنیاد پر

اب یہ کہتے ہیں کہ منہدی کی ترجیحی شکل یہ ہے اور منہدی کی قسم کے دوسرے الفاظ مہنگا، لہنگا، وغیرہ، ان سب میں نون کی آواز (غنائت کی آواز) 'ہ' پہلے ہے۔ اس لیے اسے 'ہ' سے پہلے لکھا جائے۔ یہ تو کوئی اضافہ نہیں ہے جو صورتیں پہلے سے موجود تھیں ان میں سے ایک کو ترجیحی طور پر اختیار کرلیا گیا۔ ہمارے یہاں جذبات کے مارے ہوئے لوگ جو علمی مسائل کو بھی جذبات کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور ان پر قدامت کا حال یہ ہے کہ کسی چیز میں ذرا سی بھی علمی، سائنسی تبدیلی کے لیے تیار نہیں تو یہ افترا انھیں لوگوں کی تراشی ہوئی ہے اس لیے اس کو بھی میں نے قابلِ التفات نہیں سمجھا۔

میرے دوسرے اور میرے کرم فرما ابو محمد سحر صاحب نے ایک پوری کتاب اس موضوع پر لکھی ہے علمی مسائل میں کبھی اتفاق نہیں ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ یاد رکھیں اختلاف علمی روایت کا حصہ ہے، یہ رہے گا۔ لیکن ایک بات واضح رہنا چاہیے کہ ایک ہوتی ہے غلطی اور ایک ہوتا ہے اختلاف۔ اختلاف کو غلطی نہیں ماننا چاہیے، مثلاً غالبؔ کے ایک شعر کا ایک شارح ایک مطلب متعین کرتا ہے یہ غلطی نہیں تاویل کا فرق ہے، مثلاً ایک لفظ معما ہو جو 'شمع' میں بہت چھپتا ہے اور اس کے ذریعے سے بہت مقبول ہوا ہے۔ اس لفظ کے آخر میں 'الف' لکھنا چاہیے لیکن ایک صاحب کہتے ہیں کہ 'ہ' لکھنا چاہیے تو یہ اختلاف ہے غلطی نہیں۔ ابو محمد سحر صاحب نے ایک پوری کتاب لکھی جس کو میں نے بہت توجہ سے پڑھا۔ میں ہر چیز کو بہت توجہ سے پڑھتا ہوں۔ میں غلطی کرتا ہوں کرسکتا ہوں آیندہ بھی کروں گا لیکن میں ہر تحریر کو بڑے غور سے پڑھتا ہوں اس میں جو کام کی باتیں دیکھتا ہوں ان کو نوٹ کرلیتا ہوں، اگر وہ میرے لیے قابلِ قبول ہوتی ہیں کہ جب اس کتاب کا دوسرا اڈیشن چھپے تو انھیں کے حوالے سے لکھوں کہ مجھ سے فلاں غلطی ہوئی تھی۔ مثلاً میں نے گلزارِ نسیم کو ایڈٹ کیا تو اس میں ایک شعر کا مصرعہ یہ ہے:

دانا تھی وہ جہل خانے آئی

میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تو ذہن نے کام نہیں کیا، میں نے سوچا یہ کتابت کی غلطی ہے اسے 'جیل خانہ' بنا دیا۔ جب کتاب چھپی تو مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم جن کو میں معنوی اُستاد مانتا ہوں پوری نسل کا، میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ تدوین کا کام تو انھیں سے سیکھا ہے۔ ان کا خط آیا کہ تم نے یہ کیا کیا یہ جہل خانہ ہے، قدیم صورت ہے۔ اب میرے ذہن میں اچانک بات آئی کہ میں کیا غلطی کی۔ گلزارِ نسیم میں تو رعایت لفظی ہی سب کچھ ہے۔ اگر مصرعے کو 'دانا تھی وہ جیل خانے آئی' لکھا

جائے تو دانا اور جہل کی ریاعت ختم ہو جاتی ہے۔ اب جو تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ قدیم لفظ جہل خانہ ہے ۔جب گلزارِ نسیم کا دوسرا اڈیشن چھپا تو تو اس کے مقدمے میں میں نے لکھا کہ پہلے اڈیشن میں مجھ سے یہ غلطی ہوگئی تھی ،مولانا عرشی نے مجھے متنبہ کیا اور اب میں نے جو تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ابو محمد سحر صاحب کی پوری کتاب میں مجھے ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملا جس کو میں قابلِ قبول پاتا۔ کیوں کہ ساری بحث انھوں نے غیر علمی طریقے پر کی ہے اور جذباتی اور شخصی انداز آ گیا ہے۔ یہ تو وہ بات ہوئی کہ ایک صاحب نے لکھا تو اس کی تردید کی جانی چاہیے، علمی بحثوں میں غیر علمی انداز نہیں آنا چاہیے۔ بہر حال میں نے اس سلسلے میں جتنی تحریریں لکھی گئی ہیں ان سب کو بڑی توجہ سے پڑھا ہے۔ میں ہمیشہ نظرِ ثانی کے لیے تیار رہتا ہوں اور ہم پڑھاتے ہی یہی ہیں کہ تحقیق ایک مسلسل عمل ہے اور محقق کو نئی معلومات کی بنا پر اپنے کسی بیان کی تردید یا تصدیق یا توسیع کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا چاہیے اور میں نے خود اس کے لیے ہمہ وقت ذہنی طور سے تیار رہتا ہوں، لیکن مجھے ان تحریروں میں اب تک کوئی ایسی بات نہ ملی جس کو میں علمی سطح پر قابلِ قبول قرار دیتا۔

ممتاز : اُردو تحقیق میں امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود کا کیا کارنامہ ہے؟

رشید : عرشی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تدوین کی پوری روایت قائم کی ،انھوں نے تدوین متن کے آداب بتائے اور اپنے کام کے ذریعے سے ہماری نسل کو تدوین متن سکھائی۔ تدوین، تحقیق کا ایک شعبہ ہے، یہ تحقیق سے آگے کی منزل ہے۔ جو تدوین کا کام کر رہا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ محقق بھی ہو۔ اگر محقق نہیں ہے تو تدوین کا کام نہیں کر سکتا۔ لیکن محقق کے لیے تدوین ضروری نہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پہلی بار تحقیق کو تاریخ سے آشنا کیا۔ قاضی صاحب نے احتساب کی روایت شروع کی اور اسے وسعت بخشی۔ انھوں نے اُردو تحقیق میں یہ بات خاص طور سے اُٹھائی کہ ہر جھوٹ کے پیچھے ایک مقصد ہوتا ہے۔ قاضی صاحب کہتے ہیں کہ فلاں بات غلط لکھی گئی ہے تو وہ صحیح بات بھی پیش کر دیتے ہیں۔ انھوں نے یہ لازم قرار دیا کہ اصل مآخذ کے ہوتے ہوئے کوئی بات قابلِ قبول نہ قرار دی جائے۔ انھوں نے اُردو تحقیق کو منطقی انداز دیا اور تحقیق کی زبان سائنٹفک بنیاد پر تخلیق کی۔ ایسی زبان جس میں ایک لفظ بھی زائد نہ آنے پائے۔ ان کے یہاں ریاضی کا سا انداز ہے۔ امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی صاحب دیو قامت محقق تھے جو سینکڑوں

سال بعد پیدا ہوتے ہیں۔ یہ حضرات روایت ساز تھے اور انھوں نے اپنے عہد کو متاثر کیا۔

ممتاز : قاضی عبدالودود اور امتیاز علی خاں عرشی مرحوم کے بعد اُردو تحقیق میں اب کن لوگوں پر نظر ٹھہرتی ہے؟

رشید : شخصیتیں ایک طویل زمانہ گزرنے کے بعد بنتی ہیں۔ پچھلے پندرہ بیس سال میں جو تحقیقی کام ہمارے سامنے آئے ہیں اس کو دیکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قاضی صاحب اور عرشی صاحب کی قد و قامت کا کوئی محقق ہمارے سامنے نہیں آیا۔ ایسی کتابیں ضرور سامنے آئی ہیں جنھوں نے معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ کیا ہے۔ لیکن ایسے کام بہت کم، افسوس ناک حد تک کم ہیں جس نے علم و آگہی میں اضافہ کیا ہو اور تحقیقی روایت کو آگے بڑھایا ہو۔ اس لیے اس وقت اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ دوسرا قاضی عبدالودود یا عرشی مرحوم میری نظر کے سامنے کوئی ہے تو میں کہوں گا کہ میری نظر کے سامنے نہیں ہے۔ عرشی صاحب اور قاضی صاحب ہمیشہ گوشہ گیر رہے، دُنیا کی وہ نسبتیں جو انسان کو اپنے میں اُلجھا لیتی ہیں ان سے آزاد تھے اور آج کا عالم و محقق ان چھوٹی چھوٹی نسبتوں اور منفعتوں میں اُلجھ جاتا ہے۔

ممتاز : اُردو سمٹ کر صرف اُردو کے اُستادوں، ادیبوں اور طالب علموں کی زبان بنتی جا رہی ہے تو کیا اس سے یہ خطرہ پیدا نہیں ہو گیا کہ ہندوستان میں اُردو کا مستقبل محفوظ نہیں؟

رشید : میں یہ تو نہیں کہتا کہ اُردو معدوم یا ختم ہو جائے گی لیکن ایک زندہ زبان جس وسعت کے ساتھ زندہ رہتی ہے شاید اس پر حرف آ جائے گا۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ نچلی سطح پر اُردو سمٹ رہی ہے، لیکن یونی ورسٹیوں میں یو جی سی کی گرانٹ کی مدد سے اُردو کے شعبے چل رہے ہیں، تحقیق کے لیے اسکالرشپ مل رہے ہیں اور ہم مبتلائے غلط فہمی میں ہیں کہ اُردو ترقی کر رہی ہے۔ حقیقتاً اُردو کا دائرہ بے انتہا سمٹ رہا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اُردو ختم ہو جائے گی لیکن زندہ زبان کی جو وسعت و ہمہ گیری ہوتی ہے وہ ختم ہوتی جا رہی ہے، بہت تیزی کے ساتھ ختم ہوتی جا رہی ہے۔

ممتاز : کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کسی نظریے کے بغیر اعلا ادب تخلیق ہو سکتا ہے۔؟

رشید : میں تخلیقِ ادب کو انفرادی ادب مانتا ہوں۔ ایک زمانے میں ترقی پسند تحریک زور شور سے اُٹھی لیکن اس تحریک کے زیرِ اثر سارا ادب بعض نظریات کو تبلیغ اور ان کو بڑا ثابت کرنے کا ذریعہ بن گیا۔ نظریے کی پابندی ادب کے لیے سب سے بڑی تباہی یہ لاتی ہے کہ وہ بعض خیالات و نظریات کا

اسیر ہو جاتا ہے۔نظریے میں آزادی تو ہے لیکن اتنی ہی جتنی وسعت زنجیر میں ہوتی ہے کہ ایک آدمی کے پیر میں زنجیر پڑی ہوئی ہے اور وہ پچاس گز لمبی ہے تو وہ شخص پچاس گز کے دائرے میں گھوم سکتا ہے۔ جب ہم کسی نظریے کو مانتے ہیں تو ہم مجبور ہیں کہ ہر چیز کو اس نظریے کی روشنی میں دیکھیں۔فن کار کے لیے سب سے بڑی چیز آزادی ہے، نظریے کی پابندی اس آزادی کی دشمن ہے نظریہ خواہ کوئی بھی ہو اس کی پابندی تخلیق کار اور فن کار کی نظر، اس کے فکر، اس کے ذہن کی وسعت و گیرائی کو کم کر دیتی ہے۔یہ فن کار سے ذہن کی آزادی، نظریات کی وسعت اور فکر کی پروا چھین لیا کرتی ہے اور انھیں محدود و مقید بنا دیا کرتی ہے۔

(بہار اُردو اکادمی کا خبر نامہ، مئی 1989)

('ہماری زبان' انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، یکم تا 28 ستمبر 2006، شمارہ نمبر 33,34,35,36 جلد نمبر: 65، صفحہ 20 تا 22)

☆☆☆

چند اہم سوالات

شبنم رومانی، مدیر'اقدار'(کراچی)

اُردو زبان وادب کے ایک نہایت معتبر محقق رشید حسن خاں گذشتہ دنوں نیاز و نگار، کی سالانہ تقریب میں شرکت کے لیے دلّی سے کراچی تشریف لائے تو مدیر اقدار نے اُن سے چند اہم موضوعات پر گفتگو کی، جس کا متن قارئینِ اقدار کے استفادے کے لیے پیش کیا جارہا ہے۔

شبنم رومانی : رشید حسن خاں صاحب: سہ ماہی ''اقدار'' کی جانب سے میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ کے اِس مختصر قیام کے دوران تشنگانِ علم وادب آپ سے بہت کچھ استفادہ کرسکیں گے۔ ادبی تحقیق سے چوں کہ آپ کو نسبتِ خاص ہے اِس لیے ایک سوال خاص طور پر کرنا چاہوں گا کہ زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانا آپ کی نظر میں کہاں تک درست ہے؟

رشید حسن خاں : آپ نے اچھا سوال کیا ہے۔ یہ سوال اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ یہ اصولِ تحقیق ہی کا نہیں، بل کہ تحقیق کی عزّت وآبرو کا بھی مسئلہ ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ پاکستان کی دانش گاہوں کے اس سلسلے میں ضابطے کیا ہیں اور وہاں احوال کیا ہے لیکن یہ میں خوب جانتا ہوں کہ ہندوستان کی دانش گاہوں میں اس غیر تحقیقی کاروبار کی بڑی گرم بازاری ہے۔ اس وقت جو ایک لہر چلی ہے آسان پسندی کی اور اُس کے تحت یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ وہ لوگ جو ابھی زندہ ہیں اُن کو موضوعِ تحقیق بنایا جائے۔ آپ نے ایک ٹیپ ریکارڈر لیا، ایک سوال نامہ مرتب کیا، کچھ گفتگوئیں ٹیپ کر لیں، کچھ سوالوں کے جواب لکھوا لیے اور مقالہ تیار ہو گیا۔ کئی لحاظ سے یہ نہایت درجہ غلط طریقۂ کار ہے۔ اُس کی زندگی مکمل نہیں ہوئی، آدمی کے خیالات میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ سو آپ ایک ناتمام اور نامکمل زندگی کے متعلق جو کچھ کر رہے ہیں، چند روز کے بعد اس کی کیا حیثیت ہوگی؟

اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں۔ اُس میں سچ بولنا بہت مشکل ہے۔ جو شخص زندہ ہے، وہ صاحبِ حیثیت اور صاحبِ اقتدار بھی ہے، یا کسی بھی حیثیت سے وہ

شہرت رکھتا ہے، اُس کے متعلق آپ صحیح بات معلوم کر سکیں۔ یا معلوم ہو جائے تو اس کو کہہ بھی سکیں یہ مشکل ہے۔ اگر تحقیق حقیقت کی بازیافت کا کام ہے جیسا کہ ہے، تو بازیافت کا عمل مکمل اُسی وقت ہوتا ہے جب آپ اُس کو پیش کریں لیکن اگر آپ اظہار پر قادر نہیں، تو ساری بازیافت بے کار ہو جائے گی۔ ایک بات اور: ہم جب اصولِ تحقیق پڑھاتے ہیں تو اپنے طالب علم کو ایک یہ بات بھی بتاتے ہیں کہ عام طور پر آدمی سب سے زیادہ جھوٹ بولتا ہے اپنے متعلق یا اپنے خاندان کے متعلق۔ جن لوگوں نے ایسے بیانات دیے ہیں، اِسی لیے ہم اُنھیں بلقطعہ اور بجنسہٖ قبول نہیں کرتے۔ ہم تحقیق کرتے ہیں کہ جو کچھ کہا گیا ہے، صحیح بھی ہے کہ نہیں۔

اس سے زیادہ اندوہ ناک بات یہ ہے کہ جس طالبِ علم نے کسی زندہ شخص کو موضوعِ تحقیق بنایا ہے تو وہ ہمیشہ کے لیے آسان پسندی کا خوگر ہو جاتا ہے۔ وہ اس کا بھی اعلان کرتا ہے کہ وہ اصولِ تحقیق سے باخبر نہیں اور دوسرا اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی فخر کے ساتھ اپنی اس کاوش کو پیش نہیں کر سکتا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہوتا ہے کہ اکثر صورتوں میں اُس غریب کی محنت اور کاوش کا فائدہ پہنچتا ہے اُس کے نگراں کو، یا اُس صدر شعبہ کو جس نے وہ موضوع تجویز کیا ہے۔ اِس وقت اِس طرح کی تحقیق یعنی زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانا، یہ ایک طرح سے "منجملہ سامانِ تجارت" بن گیا ہے۔ طالب علم غریب کے حصے میں کچھ نہیں آتا، لیکن جس شخص کو موضوعِ تحقیق بنایا گیا ہے اس سے وہ نگراں یا اُستادِ اعلا مختلف سطحوں پر یا مختلف نسبتوں اور واسطوں سے دنیاوی فائدے اٹھاتا ہے اور اُس کی اُس طالبِ علم کو تو خبر بھی نہیں ہوتی۔

پھر ایک بات اور: آپ ایک فہرست بنایئے ایسے لوگوں کی جن کو اب تک موضوعِ تحقیق بنایا گیا ہے اور ابھی تک زندہ ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اُن میں اکثریت ایسے ایسے بے تہہ اور کم رُتبہ لوگوں کی ہے جن کی کسی موضوع میں کوئی حیثیت نہیں۔ ہاں اِس دُنیا کے اقتدار کے لحاظ سے، یا شہرت کے لحاظ سے، یا کسی اور نسبت سے، ان کی ایک حیثیت ہے۔ تو یہ بات بجائے خود اس الزام کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ دیکھیے ہم تحقیق کی تعریف پڑھاتے ہیں کہ تحقیق حقائق کی بازیافت کا نام ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک واقعہ جو کبھی ظہور پذیر ہوا تھا لیکن جس کے متعلق ہماری معلومات یا تو نہیں ہیں یا نا تمام اور ناقص ہیں، اُس کو صحیح صورت میں دریافت کیا جائے۔ یہ بڑا صبر آزما کام ہے۔ یہ کیسی عجیب صورتِ حال ہے کہ آپ چند آدمیوں سے یا کسی ایک ایک شخص سے چند بیانات

لے کر سمجھیں کہ آپ نے حقائق کی بازیافت کا حق ادا کر دیا! یہ ہو نہیں سکتا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں آپ اُن لوگوں کی ایک فہرست بنایئے جو بہت مشہور ہیں۔اقبال سے لے کر ابوالکلام آزاد تک۔ یہ بہت مشکل ہے کہ دونوں معاشروں میں آپ ایسے لوگوں کے متعلق صحیح حقائق کو بلا تکلف اور بلا تامّل پیش کر سکیں۔زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانا یہ ایک ایسا عمل ہے، جو ایک طرف تو طالب علم کو تحقیق کے حقیقی مقاصد سے بے خبر کر کے اُسے آسان پسندی کا خوگر بناتا ہے اور ہمیشہ کے لیے اُس کو اعلا نقطۂ نظر سے محروم کر دیتا ہے۔اس غیر تحقیقی عمل سے خود تحقیق بے آبرو ہو کر رہ جاتی ہے۔ایک بات اور: اب میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ بعض موجودہ اور سابق صدور شعبہ کی ذاتِ والا صفات پر اُن کے طالب علم بے طرح توجہ مبذول فرما رہے ہیں اور موصوف بہ خوشی اس کی اجازت دے دیتے ہیں کہ اُن کو موضوعِ تحقیق بنایا جائے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بعض حضرات پر تو بیک وقت دو دو طالب علم جو معاشی طور پر پریشان حال ہے اور مستقبل میں کسی سہارے کا خواہاں ہے، وہ سمجھتا ہے کہ شاید اسی طرح پتھر پگھل جائے اور اُسے آیندہ اس توسط سے ملازمت مل سکے۔

شبنم رومانی: کیا کسی زندہ شخصیت سے خود اُسی کے بارے میں زیادہ مدد اور رہنمائی نہیں مل سکتی؟

رشید حسن خاں: وہی تو گم راہی کا پہلا درجہ ہے۔ دیکھیے جس شخص کو آپ موضوعِ تحقیق بنا رہے ہیں اگر اُس کی رہنمائی حاصل ہے تو تحقیق کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔اس کی وجہ وہی ہے کہ کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ بہت سے حقائق بالکل صحیح شکل میں سامنے آسکیں۔ یہی نہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ طالبِ علم اپنے نگراں یا صدر شعبہ کو سچ بول کر ناراض کرنے کا خطرہ مول لے سکے؟ عملی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ اِس سے قطعِ نظر، اصولاً جب زندہ شخص کو موضوعِ تحقیق بنانا بجائے خود غیر تحقیقی عمل ہے تو پھر ایسی تفصیلات کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ پھر ایک بات اور یاد رکھیے اور میں اس پر ہمیشہ زور دیتا ہوں اور اپنے طالب علموں سے خاص طور پر کہتا ہوں کہ آدمی کے مرنے کے بعد بھی ایک ایسے وقفے کی ضرورت ہے جس وقفے میں عقیدت، شہرت یا دوسری نسبتوں کا پھیلایا ہوا غبار دب جائے۔ جب تک وہ وقفہ نہ گزر جائے، تب تک مرحوم لوگوں کو بھی موضوعِ تحقیق نہیں بنانا چاہیے۔

شبنم رومانی: لیکن اِس طرح بہت سے شواہد ضائع ہونے کا بھی تو امکان ہے؟

رشید حسن خاں: جی نہیں! جب میر کے زمانے کے شواہد معلوم کر لیتے ہیں تو اس زمانے میں اِس کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا جب کہ آج کل ایک ایک چیز کو کراماً کاتبین کے نامۂ اعمال کی طرح

درج ہوتی رہتی ہے مختلف مقامات پر، مختلف لوگوں کے ذہنوں میں۔اب میں ایک بڑے نقصان کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ بہت سے اچھے طلبہ کو بھی اس ''غیر تحقیقی خفیف الحرکاتی'' میں جو بتلا کر دیا گیا ہے اور اس طرح اُن کی صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں، تو اس سے نقصان یہ پہنچا ہے کہ قدیم اساتذہ اور ان کی تصنیفات سے متعلق تحقیق کا کام اس قدر کم ہو گیا ہے کہ گویا نہیں ہو رہا، جب کہ اس کی بہت ضرورت ہے۔ بیش تر کام تحقیق کرنے والوں کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ دیکھیے کیسی عجیب بات ہے کہ ہم کہتے ہیں میرؔ غزل کے امام ہیں، ہم کہتے ہیں سوداؔ اُردو کے سب سے بڑے قصیدہ نگار ہیں۔ہم کہتے ہیں کہ خواجہ میر درد سب سے بڑے صوفی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ مثنوی میر حسن، میر حسن کا شاہ کار ہے، لیکن ان میں سے کسی شاعر کی مثنوی، دیوان یا کلیات کا تنقیدی اڈیشن تیار ہوا ہے؟ غالبؔ کے علاوہ جتنے شعرا کے دواوین کے متداول اڈیشن ہیں، ان میں یا الحاقی کلام ہے یا غلط متن ہے۔تو ایک طرف صورتِ حال یہ ہے کہ سارے دواوین ساری نثری کتابیں پڑی ہوئی ہیں اور تدوین کی راہ دیکھ رہی ہیں کہ کوئی اچھا طالب علم اُٹھے اور اور مختلف نسخوں کی مدد سے ان کے متن کو صحیح کر سکے۔لیکن یہ کام دقّت طلب ہے ،صبر آزما ہے اور علم کا بھی طلب گار ہے، سو ہم یہ کام نہیں کرتے۔ہم زندہ آدمی کو موضوعِ تحقیق اس لیے بناتے ہیں کہ اُس میں کچھ کرنا دھرنا نہیں۔ یوں دُہرا نقصان ہوتا ہے کہ ایک طرف تو تحقیق کے اصولوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور دوسری طرف کلاسیکی لٹریچر جو تحقیق کا اصل موضوع بن سکتا تھا، وہ ویسے ہی پڑا ہوا ہے جیسے آج سے پچاس سال پہلے تھا۔آپ غور کیجیے کہ میرؔ جنھیں خدائے سخن آپ کہتے ہیں، ان کے کلیات کا کوئی ایسا اڈیشن آج تک تیار نہیں ہو سکا جسے آپ تنقیدی اڈیشن کہہ سکیں، جدید تدوین کے اصولوں کی روشنی میں۔

شبنم رومانی: کیا آپ کے نزدیک زندہ لوگوں کے بارے میں تحقیق کا کوئی بھی جواز نہیں؟

رشید حسن خاں : نہیں !اس لیے کہ وہ ابھی زندہ ہیں، ان کی زندگی مکمل نہیں ہوئی۔ان کے افکار ابھی تکمیل کے نقطۂ آخر پر نہیں پہنچے، زندگی کا سارا عمل تسلسل کی حالت میں ہے اور اُن کی شخصیت مکمل نہیں ہو سکی ہے۔

شبنم رومانی: کوئی کرائی ٹیریا تو ہو سکتا ہے؟

رشید حسن خاں : جی نہیں! یہ چور دروازہ بنے گا۔ممکن ہے بعض لوگوں کے نزدیک ایک

دو مثالیں مستثنیات کے ذیل میں آ جائیں لیکن پھر اُن پر قیاس کر کے دوسرے لوگوں کا راستہ نکلے گا۔اس بنا پر کہ ہم کہتے ہیں یہ شخص مستحق ہے لیکن اپنی جگہ پر تو ہر آدمی سمجھتا ہے کہ وہ افلاطون اور ارسطو کا جانشین ہے۔یہ تو ایک چور دروازہ کھل جائے گا برائیوں کے پھیلاؤ کا۔سختی کے ساتھ اس کی ہمت شکنی کی جانا چاہیے۔عبرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ وہ لوگ جن کی شاعری میں کوئی حیثیت نہیں ،جن کی نثر میں بھی کوئی حیثیت نہیں ،معلوم ہوا کہ یونی ورسٹیوں میں اُن پر تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔اس لیے کہ ایک تو اُن کے اثرات ہیں اور دوسرے یہ کہ یہ کام آسان بہت ہے۔طالب علم آیا ٹیپ ریکارڈر لے کے،اُس نے سب کچھ پوچھ لیا مقالہ لکھ دیا،اُستاد نے دستخط کر دیے اُس پر۔نہ اُستاد کو آنکھوں کا تیل ٹپکانا پڑا اور نہ شاگرد کو لائبریریوں کی خاک چھاننا ،پُرانی کتابوں کے ورق لوٹنا اور کئی سال چھان بین میں گزارنا پڑے۔یہ تو بڑا صبر آزما عمل ہے۔اس طرح کا کوئی کام ہو تو نگرانِ محترم کو بھی تو پڑھنا پڑے گا، دیکھنا پڑے گا،وقت صرف کرنا پڑے گا۔یہ بات نہیں کہ وقت نہیں ہوتا۔وقت بہت ہوتا ہے مگر پبلک ریلیشن اُس کا صحیح مصرف ہے۔کمیٹیوں کے ممبر بننے اور ترقی کے ہتّے کرنے کے لیے اُس کی زیادہ ضرورت ہے۔ہم آسان پسندی اور شارٹ کٹ کے خوگر ہوتے جا رہے ہیں۔یہ تباہی کی نشانی ہے ادب میں۔آسان پسندی اور تحقیق،ان میں تضاد کی نسبت ہے۔

شبنم رومانی: اصل میں شخص اور شخصیت کے فرق کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے؟

رشید حسن خاں: جی نہیں! پھر جھگڑے کا سامان کر رہے ہیں آپ۔شخص کتنا ہی بڑا ہو اور اُس کی شخصیت کیسی ہی کیوں نہ ہو لیکن جب تک وہ زندہ ہے اُس کا تشخص مکمل ہوا ہی نہیں،اُس کی شخصیت تکمیل کے درجے پر پہنچی ہی نہیں۔دیکھیے جتنا بڑا شخص ہوگا،اُس کے اردگرد عقیدت کا ہالا اور اُس کو ماننے والوں کو ہجوم اُتنا ہی گہرا اور زیادہ ہوگا۔یہ جو شخصیت کی بات آپ کر رہے ہیں یہ تو بہت پریشان کُن اِس لحاظ سے ہے کہ جو بہت زیادہ مشہور لوگ ہوتے ہیں اُن کے چاروں طرف گہری کھائیاں کھدی ہوتی ہیں،گہرے ہالے چھائے ہوتے ہیں جن کو آپ پار نہیں کر سکتے۔اگر پار کر بھی لیں تو اُن کے نتائج کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔

شبنم رومانی: کم از کم ان کی زندگی میں تو پیش کرنا بہت مشکل ہے؟

رشید حسن خاں: بلکہ بہت سی صورتوں میں تو زندگی کے بعد بھی ایک وقفہ ایسا ہوتا ہے کہ

آپ اُن کو پیش نہیں کر سکتے۔ میں آپ سے ایک سوال پوچھتا ہوں، کیا یہ ممکن ہے کہ آپ پاکستان میں اقبال کی زندگی سے متعلق بالکل صحیح حقائق پیش کر سکیں۔

شبنم رومانی: بہت مشکل ہے!

رشید حسن خاں: جی ہاں مشکل اور بہت مشکل ہے۔آپ یورپ کے معاشرے پر ہمارے معاشرے کو قیاس نہ کیجیے، دونوں میں بہت فرق ہے۔اگر وہاں ایک کام ہوتا ہے تو لازم نہیں کہ وہ کام یہاں بھی ہو۔بڑے مختلف معاشروں میں ہم رہتے ہیں۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں جب کوئی حکومت بدلتی ہے،تو ہمارا اندازِ بیان بدل جاتا ہے۔ ہمارا اندازِ تحریر بدل جاتا ہے۔تو جہاں صورتِ حال یہ ہو، جہاں یہ کہا جاتا ہو کہ ادیب اور اخبار نویس جو قوم کے ضمیر ہوتے ہیں ہم اُن کو بڑی آسانی سے خرید سکتے ہیں اور خرید سکتے ہیں اور خرید کے دکھا دیا جاتا ہے۔جس معاشرے کا احوال یہ ہو وہاں آپ کیا توقع کر سکتے ہیں۔

شبنم رومانی: خیر یہ تو تحقیق کے مسائل ہیں، ان سے ہٹ کر ایک سوال: شعرا یا نئی نسل کے شعرا کا کلام بھی آپ کی نظر سے گزرتا ہوگا، تو اُس کے بارے میں آپ کا مجموعی تاثر کیا ہے؟

رشید حسن خاں: یہ بھی اچھا سوال آپ نے پوچھا کیوں کہ اس سلسلے میں میرے بعض خیالات ہیں جن کو میں واقعی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شاعری کو پڑھنا میرا محبوب ترین مشغلہ ہے لیکن تنہائی میں...اور میں شعر کو کبھی اتنی اونچی آواز سے نہیں پڑھتا کہ اس کا سحر ٹوٹ جائے، اس کا تاثر مجروح ہو جائے۔ نئے شاعروں کو میں بہت شوق سے پڑھتا ہوں واقعہ یہ ہے کہ بعض دفعہ ایسے ایسے شعر سامنے آتے ہیں کہ کچھ دیر کے لیے اور سب کچھ فراموش ہو جاتا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ میں کلاسیکی ادب کا آدمی ہوں، اور ہوں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نئے نئے شاعروں کے کلام کو میں بہت دل چسپی اور توجہ کے ساتھ پڑھتا ہوں۔اس کی ایک وجہ ہے۔دیکھیے شبنم صاحب! تاج محل خوب صورت عمارت ہے، حسین ترین لیکن میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ تاج محل بننے سے پہلے جو طویل زمانہ گزرا ہے، جس میں بہت سے نقش جھونپڑیوں کے تھے، اگر وہ سب نہ بنتے اور اس طرح فنِ تعمیر ترقی نہ کرتا تو کیا تاج محل ترقی کر سکتا تھا؟ اور تاج محل کے بعد بھی اگر طرح کی چھوٹی بڑی عمارتوں کے بننے کا سلسلہ بند ہو جائے تو کیا فنِ تعمیر ترقی کر سکتا ہے؟ یہ بڑی غلط فہمی ہمارے یہاں ہے۔ہم کہتے

ہیں کہ صاحب! یہ شعر تو بہت ہی کم درجہ ہے اور اُس وقت ہمارے ذہن میں تصور ہوتا ہے میرؔ کی غزل یا غالبؔ کی غزل کا۔ تو میرؔ اور غالبؔ تو کسی بھی زبان میں ایک دو ہی پیدا ہوتے ہیں اور وہ بھی صدیوں میں۔ یاد رکھیے کہ جس روایت کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے وہ روایت مر جاتی ہے اور روایت کا تسلسل اوپر کی سطح پر قائم نہیں ہوتا، نیچے کی سطح پر قائم ہوتا ہے، تو لازم ہے کہ شاعری کی روایت کا تسلسل جو نچلی سطح پر اس وقت ہے، وہ قائم رہے، کارفرما رہے، رواں دواں رہے۔ ہاں! جب تنقید قدر و قیمت کے تعین پر گفتگو کرتی ہے تو مسئلہ دوسرا ہوتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس کی حیثیت یہ ہے لیکن وہ بالکل دوسری چیز ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جن لوگوں کا درجہ میرؔ اور غالبؔ کے برابر نہیں، ان کو شعر کہنے کا حق نہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ جبر کا معاشرہ کمیونسٹ معاشرہ تھا، جہاں یہ پابندی تھی کہ آپ کو یہ کہنا ہے، مگر یہ پابندی نہیں تھی کہ آپ لکھ ہی نہیں سکتے۔ کسی شخص کو اس کائنات میں اِس کا حق حاصل نہیں کہ وہ نئے شاعروں کو اس حق سے محروم کر سکے کہ چوں کہ وہ میر و غالبؔ جیسے شعر نہیں کہہ سکتے اس لیے اُن کو شعر کہنے کا حق حاصل نہیں۔

یہاں میں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں جو بہت اہمیت رکھتی ہے۔ فنونِ لطیفہ انسان کی ذہنی تسکین کا واحد ذریعہ ہیں اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ تسکین کے اس ذریعے سے کسی کو محروم کر سکے۔ ایک شخص جو معمولی شعر کہتا ہے اور اُردو میں جو شعری سطح ہے معیار کا جو تصور ہے اس کے لحاظ سے وہ معیاری نہیں ہوتے لیکن یہ تنقید کا نقطۂ نظر ہے نا! مگر وہ شعر جن کو ہم اور آپ کم رتبہ کہہ رہے ہیں یا ناقد کم رتبہ کہہ رہا ہے مگر اُس شخص کے لیے اس کا نفسیاتی اور ذہنی تسکین کا واحد ذریعہ ہیں۔ اگر وہ شاعر شعر نہیں کہے گا تو اس تسکین سے محروم رہے گا جو اُس کو اُن شعروں کے کہنے کے بعد حاصل ہوتی ہے اور جو کسی دوسری طرح حاصل نہیں ہو سکتی۔ کسی معاشرے کو، یا تنقید کے کسی دبستان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ فرد کو اس ذریعۂ تسکین سے محروم کر سکے۔

شبنم رومانی: میں ادبی معیارات کی بات کر رہا ہوں!

رشید حسن خاں : وہ تنقید کا مسئلہ ہے، وہ ہمیشہ برقرار رہیں گے۔ ہزاروں مجموعے چھپیں گے اور انھیں چھپتے رہنا چاہیے۔ ہزاروں لوگ شعر کہیں گے، ان میں کم درجہ بھی ہوں گے، کم رتبہ بھی ہوں گے، اچھے بُرے بھی ہوں گے، صحیح یا غلط بھی ہوں گے، اس عمل کو اسی طرح کارفرما رہنا چاہیے۔ جس طرح تخلیق کار اس کا حق نہیں کہ وہ یہ کہے کہ تنقید کو معیار پر اصرار نہیں کرنا چاہیے، اُسی طرح

ناقد کو یہ حق حاصل نہیں کہ کہ وہ یہ کہے کہ اُس کے پسندیدہ دو چار شاعروں کے سوا اور کسی کو شعر کہنے کا حق حاصل نہیں۔ ہر معاشرے میں افراد کی مختلف سطحیں ہوا کرتی ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ چند دانشوروں کے علاوہ باقی سب لوگوں کو عالمِ وجود میں آنے سے روک دیا جائے؟ کیا ایسا کوئی معاشرہ ہوسکتا ہے جس میں مجدور، محنت کش، دکان دار، تاجر، مختلف پیشہ ور اور مختلف سطحوں کے لوگ نہ ہوں، صرف اعلا سطح کے کچھ افراد وہاں رہنے کا حق حاصل ہو اور وہ معاشرہ زندہ لوگوں کا معاشرہ کہلانے کا حق دار ہو اور اُس میں ارتقا کا عمل جاری رہ سکے؟

شبنم رومانی: کیا آپ کو اس میں کوئی پرامز بھی نظر آرہا ہے؟

رشید حسن خاں: مسئلہ یہ نہیں، ایک نوجوان شاعر ہے، اس کا مجموعہ ہم پڑھتے ہیں اور ماننا پڑتا ہے کہ اُس شخص کے اندر ایسی صلاحیت ہے کہ آگے چل کر اس کا امکان ہے کہ اس کی صلاحیتیں نکھر کر خاص سطح پر پہنچ جائیں گی۔ ایک اور مجموعہ آپ پڑھتے ہیں، اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر صلاحیت کچھ زیادہ نہیں، بس شعر ہیں لیکن دونوں کو شعر کہنے کا حق حاصل ہے یکساں سطح پر۔ اگر ہر طرح کے مجموعے نہیں چھپتے رہیں گے تو اس روایت کا وہ تسلسل ختم ہو جائے گا جو بہت ضروری ہے فنونِ لطیفہ کے ارتقا کے لیے لیکن تنقید کا منصب الگ ہے اور وہ وہی رہے گا، معیار بندی کا، درجہ بندی کا، قدر و قیمت کے تعین کا۔ وہاں مفاہمت نہیں ہوگی لیکن یہ جو مسئلہ ہے ایک معمولی درجے کے شاعر کا، تو اس کی شاعری اس کی ذہنی تسکین کا واحد ذریعہ ہے اور اس سے اُسے محروم کرنے کا ہمیں آپ کو کوئی حق نہیں۔ اب یہ بات کہ اس کی شاعری کم رتبہ ہے تو یہ تو سارے فنون کا مسئلہ ہے۔ آپ موسیقی میں آیئے، آپ مصوری میں آیئے، آپ فنِ تعمیر میں آیئے، کیا سب عمارتیں اعلا درجے کی ہوتی ہیں؟ ہو بھی نہیں سکتیں، لیکن وہ چھوٹی بڑی، اچھی بُری، کبڑی کانی عمارتیں نہ بنتیں تو اعلا درجے کی عمارتیں بھی نہیں بن سکتی تھیں۔

دیکھیے شبنم صاحب! تنقید کو تو حق حاصل ہے اور اُس کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ معیار کے تصور کو دُہراتی رہے تاکہ ذہنوں میں معیار کا تصور روشن رہے، اور قدر و قیمت کا تعین اس کی روشنی میں کرتی ہے۔ یہ جو ہمارے بعض بزرگوں میں، بڑے لوگوں میں ایک رجحان ہے حقارت کی نظر سے دیکھنے کا نئی شاعری اور نئے شاعروں کو، چھوٹے مجموعوں اور کم درجہ شاعروں کو، یہ بہت ہی منفی ہے۔ جب سے

یہ کائنات بنی ہے اور جب تک یہ کائنات قائم رہے گی۔ ہاں مجھے ایک شکایت ضرور ہے کہ جو ہماری نئی نسل ہے اس کو شعر تو کہتے رہنا چاہیے، اس کے مجموعے بھی چھپنا چاہیے، لیکن یہ ایک چیز سے بے خبر ہو گئی ہے (اور اس میں ترقی پسند تحریک اور اُس کے بعد جدیدیت کی ادب آشوبی کا بڑا عمل دخل ہے) کہ لفظ ''ریاض'' کے معنی سے یہ بے گانہ ہوتی جا رہی ہے اور لفظوں کی جو معنوی نسبتیں ہیں اُن کے عرفان سے بھی۔ تو یہ چیز توجہ طلب ہے۔ میں جب یہ کہتا ہوں کہ شعر میں یہ عیب ہے، تو میرا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اُس شخص کو شعر کہنا چاہیے، مقصد یہ ہوتا ہے کہ شعر کہنے کے لیے جن چیزوں پر نظر رہنا چاہیے، اُن کی نشان دہی کر دی جائے۔

شبنم رومانی: زبان و بیان کو اہمیت نہ دینا بھی ایک قسم کی انارکی ہے؟

رشید حسن خاں: ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اب بہت کم ایسے اساتذہ رہ گئے ہیں جو زبان و بیان کے نکات کے ماہر ہوں، جو فارسی زبان ضروری حد تک جانتے ہوں اور اُردو زبان کے مزاج آشنا ہوں، تو اس میں اُس طالب علم کا قصور کم ہے، اُن کا قصور زیادہ ہے جو اُس کی تربیت کے ذمّے دار ہیں۔ اگر اُستاد بتائے گا نہیں تو طالب علم سمجھے گا کیا؟ ایک اُستاد نے میرے سامنے ''پسِ منظر'' کہا۔ میں نے ٹوک دیا یہ صحیح نہیں۔ صحیح ''پس منظر'' کہنے لگے کیوں؟ میں نے کہا اس میں ترکیبِ مقلوب ہے۔ تو وہ صاحب چوبیس برس سے اُستاد تھے ترکیبِ مقلوب کے معنی نہیں جانتے تھے۔ ایک کتاب رکھی ہوئی تھی۔ ایک صاحب نے کہا اس کا ''سرِ ورق'' بہت خوب صورت ہے۔ میں نے کہا آپ نے غلط لفظ استعمال کیا۔ ''سرورق'' صحیح ہے کیوں کہ ''سرِ ورق'' کے معنی ہوئے وہ تحریر جو صفحے پر سب سے اوپر لکھی ہوتی ہے، جیسے سرِ فہرست۔ اس بات کو سمجھانے میں مجھے پندرہ بیس منٹ لگے۔ تو جب سینیر اساتذہ کا احوال یہ ہے تو ہم اُن کے شاگردوں پر الزام کیا رکھیں۔ ہاں یہ ضرور چاہتے ہیں کہ شاعر جب شاعری شروع کرے تو وہ یہ ضرور سمجھ لے، جو ہمارے یہاں عربی کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ خیال روح ہے اور بیان جسم ہے۔ روح کے بغیر جسم بے کار ہے لیکن ہم روح تک پہنچتے ہیں جسم کے واسطے سے۔ اسی لیے علم بلاغت میں ساری بحثیں زبان و بیان کی ہوتی ہے۔ اس طرف ضرور توجہ رکھیں۔

پاکستانی شعری مجموعوں میں جب کبھی کوئی مل جاتا ہے حسنِ اتفاق سے، تو دل کو چھو لینے والے شعر بھی مل جاتے ہیں۔ اُردو میں غزل کے ایسے ایسے شعر کہے جا چکے ہیں کہ اب اگر کسی مجموعے

میں دس بارہ اچھے شعر بھی مل جائیں تو سمجھنا چاہیے کہ اس شخص کو شعر کہنا آتا ہے۔ہاں افسوس تب ہوتا ہے جب سینیر شاعروں بعض مشہور شاعروں کے یہاں مشقِ سخن کے بل پر شعر بنانے کا کاروبار نظر آتا ہے۔اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔بہت کہنا، اس نے بھی شاعروں کو بگاڑا ہے اور شاعری کو کم رتبہ بنایا ہے۔مثال کے طور پر اس وقت ایک نام ذہن میں آتا ہے۔میں پروین شاکر کے اشعار بہت شوق سے پڑھتا ہوں، ایسے ایسے شعر اس خاتون نے کہے ہیں کہ واہ واہ اور سبحان اللہ! لیکن شعر گوئی کی کثرت نے اب سطحیت کو بُری طرح نمایاں کرنا شروع کر دیا ہے۔فطرت ایسی فیاضی شاید ہی کبھی کرتی ہو کہ بہ قدرِ ظرف سے زیادہ نوازے۔صلاحیت بہ ہر طور محدود ہوتی ہے، اُسے اگر بے دردی کے ساتھ خرچ کیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ ایک منزل پر اُس کی کمی اپنا اثر دکھائے گی۔کوئی شخص جوانی کو بے طرح لُٹانے پر اُتر آئے تو اس ''اصراف'' کے اثرات تو شامل ہوں گے ایک منزل پر۔

شبنم رومانی: آج کل کلیات چھپوانے کی لہر آئی ہوئی ہے۔ہمارے یہاں بہت سے مشہور شاعر ہیں اور ان کی شہرت کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں تو ان کے کلام کو ''کلیات'' کی حیثیت دینا کہاں تک مناسب ہے؟

رشید حسن خاں: اگر آپ کو دشمنی کرنا ہے اس بیسویں صدی کے کسی ایسے شاعر کے ساتھ جو مرحوم ہو چکا ہے یا جو زندہ ہے ابھی، تو آپ اُس کا کلیات چھاپ دیجیے، پھر وہ واقعی مرحوم ہو جائے گا۔اس کی ایک مثال، مائل دہلوی نے اپنے زمانے کے خوش گو شاعر تھے، زبان کے شعر کہا کرتے تھے۔جے پور میں رہتے تھے۔ان دو شعروں سے آپ کو ان کے رنگِ سخن کا اندازہ ہوگا:

گھبرا دیا ہے آمدِ فصلِ بہار نے
مشکل ہوئے ہیں طاق سے شیشے اُتارنے

یہ کہہ کے چھیڑتے ہیں جوانانِ بادہ خوار
مائل! تمھیں سلام کہا ہے بہار نے

انتقال ہو گیا اُن کا۔اُن کے شاگردوں نے اُستاد کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے ان کا نہایت ضخیم کلیات راجستھان اُردو اکیڈمی کی طرف سے چھاپا اور اس کے بعد وہ واقعی مرحوم ہو گئے کیوں کہ کسی نے نہ اس کلیات کو خریدا اور نہ کوئی اتنا ضخیم کلیات پڑھ سکتا تھا۔اگر سو دو سو ڈھائی سو منتخب اشعار کا مجموعہ ہوتا تو آج

مائل کو بہت سے لوگ جانتے ہوتے۔ یہ تو ہے ان لوگوں کا احوال جن کا انتقال ہو چکا ہے۔

شبنم رومانی: غالبؔ کا انتخاب نہ کیا گیا ہوتا تو آج غالبؔ، غالبؔ نہ ہوتا؟

رشید حسن خاں: یہ اپنے اوپر اعتماد کا مسئلہ ہے۔ اصغر گونڈوی کے دو مجموعے ملا کر کتنے شعر ہیں، یعنی کیا حیثیت ہے ان کی؟ اور میرؔ کا کلیات کتنا ضخیم ہے، اگر مولوی عبدالحق کا انتخاب نہ ہوتا تو ''میر شناسی'' کی روایت توسیع پا سکتی تھی؟ کون ہے جو آج میرؔ کا کلیات پورا پڑھ سکے۔ وہ سارے اچھے شعر اس کے اندر دب جاتے، وہ لوگ جو ابھی زندہ ہیں اور ان کے تین تین چار چار مجموعے چھپ چکے ہیں۔

شبنم رومانی: لیکن وہ اُن کا کُل کلام تو نہیں؟

رشید حسن خاں: دیکھیے صاحب! آدمی دن بھر جتنی باتیں کرتا ہے وہ سب درج رجسٹر ہونے کے قابل نہیں ہوتیں۔ شاعر جتنے شعر کہتا ہے، ہر شعر اس لمحۂ تخلیق کی پیداوار نہیں ہوتا جو لمحۂ بے خودی ہوتا ہے۔ اس لیے عام طور پر کسی شاعر کا سارا کلام اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ سامنے آ سکے (مستثنیات سے بحث نہیں) اور وجوہ کے سوا سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اُس شخص کو مرحوم کرنے میں وہ کلیات بہت معاون ثابت ہوگا۔ اگر کسی شخص کے ساتھ آپ دشمنی کرنا چاہتے ہیں تو کلیات چھاپ دیجیے اس کا، کوئی نہیں پڑھے گا، کسی کے پاس اتنی فرصت ہے اور کیوں پڑھے؟ دیکھیے شبنم صاحب! اُردو میں اچھے شعرا اتنے کہے جا چکے ہیں کہ اب ضرورت ہی نہیں رہی ہے کہ ہم کسی کا کلیات پڑھیں۔ اُس کا انتخاب ہوگا تو ضرور پڑھیں گے۔ اور دیکھیے کیسے بڑے پُرانے شاعر ہیں، ان کے ہاں کیسے اچھے اچھے شعر ہیں اور دبے ہوئے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا ان کو آج۔ تو ایک شخص جو اپنے چار مجموعے چھپوا چکا ہے اور اس کے معتقد اور شاگرد چاہتے ہیں کہ ایک کلیات بھی مرتب کیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ چاہتے ہیں کہ اس شاعر کا کلام، کم سے کم لوگ پڑھیں۔

شبنم رومانی: نہیں میں ایک تکنیکی بات کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ کلیات کے بعد مزید کلام کہنے یا اس کو چھاپنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا! کیا کلیات کے بعد آپ نیا کلیات چھا میں گیا ور یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہے گا؟ بھئی کلیات تو اس کُل کلام کا نام ہے جو شاعر نے زندگی بھر کہا ہے۔

رشید حسن خاں: ہاں ایک بات کی وضاحت بہت ضروری ہے۔ ہم میرؔ کا کلیات چھاپنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم جب کہتے ہیں کہ میرؔ کا کلیات ایڈٹ ہونا چاہیے، سودا کا کلیات ایڈٹ ہونا چاہیے تو اس کی وجہ

دوسری ہوتی ہے۔ آج اگر آپ کو کوئی مکمل لغت اُردو کا تیار کرنا ہے تو ان شاعروں کے مکمل کلام کی از بس ضرورت ہے، لفظیات کے لحاظ سے سند کے لیے لیکن آج کا وہ شاعر جس کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں ان کو تو معقول آدمی پڑھنے والے میسر نہیں، مگر اس نے جو چند اچھے شعر کہے ہیں، آپ ان کو بھی مرحوم کر کے منوں مٹی ڈال دینا چاہتے ہیں کلیات چھاپ کے؟ اس لیے ہونا یہ چاہیے کہ جب آدمی عمر کی ایک خاص بل کہ آخری منزل پر پہنچے تو وہ خود نہیں (شاعر اپنے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا) کسی خوش ذوق شخص سے اپنے سارے کلام کا ایسا انتخاب تیار کرائے جس میں اس کے وہ شعر آ جائیں جن کو پڑھا جا سکتا ہے اور ان میں سے بعض کو یاد بھی رکھا جا سکتا ہے۔ شاد عارفی کا کلیات چھپا معلوم ہی نہیں ہوا کسی کو کیا چھپا ہے، سارے شعر دب کے رہ گئے۔ اب شاد کا ذکر آ گیا ہے تو آپ نے ان کی غزل کا وہ مشہور شعر سنا ہوگا:

چاپ سُن کر جو ہٹا دی تھی، اُٹھا لا ساقی
شیخ صاحب ہیں، میں سمجھا تھا مسلمان ہے کوئی

اسی غزل میں یہ شعر بھی ہے:

زرد چہروں کو تبسم نے کیا ہے رُسوا
ورنہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پریشاں ہے کوئی

کیسا اچھا شعر ہے، اور یہ شعر دب گیا۔

شبنم رومانی: کیا ہندوستان اور پاکستان کی شاعری میں کوئی تفریق یا حدِ فاصل نظر آتی ہے؟

رشید حسن خاں: میں شعر و شاعری کا رسیا ہوں اور مجھے صحیح معنی میں تسکین ملتی ہے اچھے شعر پڑھ کر۔ میں منتظر رہتا ہوں پاکستان سے آنے والے شعری مجموعوں کا، افسوس کہ کم پہنچتے ہیں لیکن جب بھی کوئی مجموعہ یہاں سے جاتا ہے اور میں اسے پڑھتا ہوں تو جو اس مجموعے کے منتخب شعر ہوتے ہیں ان میں اور ہندوستانی مجموعوں کے منتخب اشعار میں مجھے تو کوئی علاقائی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ اب رہی عمومی سطح تو اس کا تو امکان ہے کہ بعض شاعروں کے یہاں بعض اشعار میں کچھ علاقائی الفاظ یا طرزِ بیان کی پرچھائیں پڑ گئی ہو جس سے ایک رنگ اُبھر آیا ہو، اس کے علاوہ جہاں تک خیال اور پیرایۂ اظہار کا تعلق ہے یا اندازِ بیان کا، مجھے تو ایسا کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔

شبنم رومانی: مسائلِ زندگی کا فرق تو ہوسکتا ہے، تجربات کا فرق ہوسکتا ہے؟

رشید حسن خاں: آپ نے دو مختلف چیزوں کو ملا دیا۔ تجربات شخصی چیز ہوئے اور مسائلِ زندگی اجتماعی چیز ہوئے۔ دونوں ملک اسی زمین اور اسی آسمان کے نیچے ہیں اور کم و بیش ایک طرح کے مسائل سے اس وقت دو چار ہیں، خواہ وہ مالی مسائل ہوں، تجارتی مسائل ہوں، صنعتی مسائل ہوں یا تہذیبی مسائل ہوں۔ ذرا سے زاویے الگ ہیں لیکن مسائل بنیادی طور پر ایک ہی نوعیت کے ہیں۔ اب ان کا اظہار اگر مختلف طرح سے ہوا ہے تو یہ شخصی مسئلہ ہے، ذاتی تجربے کا مسئلہ ہے جو ہمیشہ رہے گا۔ میر کے زمانے میں سوداؔ بھی تھے، دونوں نے غزلیں کہیں ہیں۔ اُن کے ہم مفہوم اشعار لے لیجیے، دونوں کا انداز مختلف ہوگا۔ کیوں کہ شخصیت کا فرق ہے تو مجھے دونوں ملکوں کی شاعری میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ مثلاً ان اشعار کو دیکھیے:

اس نسل کا ذہن کٹ رہا ہے
اگلوں نے کٹائے تھے فقط سر

پیڑ کو دعا دے کر، کٹ گئے بہاروں سے
پھول اتنے بڑھ آئے، کھڑکیاں نہیں کھلتیں

جو مجھے چھوڑ گیا ہے تنہا
شاید اب وہ بھی اکیلا ہوگا

آج اس نئے گھر کے بھی مکیں آ گئے اور اب
اِس گھر کا اُجالا بھی مرے گھر پہ ہنسے گا

کچھ سہل نہیں ہے عشق کرنا
یہ زندگی بھر کا رت جگا ہے

اگر شاعر کا نام نہ بتایا جائے اور مجھ سے پوچھا جائے کہ یہ شعر پاکستانی شاعر کا ہے یا ہندوستانی شاعر کا ہے، تو میں کوئی بیان نہیں دے پاؤں گا۔ غزل کی شعریات اب تک دونوں ملکوں میں ایک ہے اور غالباً یہی صورت رہے گی۔

شبنم رومانی: آپ کی ایڈٹ کی ہوئی ''فسانۂ عجائب'' جو پچھلے دنوں شائع اس کے بعد متنی تنقید کا بہت چرچا ہوا ہے تو متنی تنقید کے بارے میں بھی کچھ ارشاد فرمائیے؟

رشید حسن خاں: یہ سب سے اہم مگر سب سے مشکل شعبہ ہے ادب کا۔ تدوین یا

اڈیٹنگ یا جسے آپ ترتیب و تصحیح متن کہتے ہیں، وہ آدمی کرسکتا ہے جو تحقیق کے آداب سے پوری طرح با خبر ہو اور اُسے تحقیق سے مزاجی مناسبت بھی ہو۔ دیکھیے شبنم صاحب! یہ بہت اہم بات ہے ہمارے یہاں عالم تو بہت گزرے ہیں مگر تحقیق کے لیے علم کافی ہوتا تو محقق سو دو سو ہوتے، مگر محقق تو چار پانچ ہیں صرف۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم، تحقیق میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ یاد رکھیے کہ مزاجی مناسبت اولین حیثیت رکھتی ہے۔ شبلی کتنے بڑے عالم تھے، ہم اُن کے سامنے عقیدت سے سر جھکاتے ہیں۔ بے مثال سخن فہم، بے مثال سخن سنج، بے مثال انشا پرداز، لیکن اُن کے یہاں انشا پردازی کا جو ہمہمہ تھا، جو جذباتیت تھی، جو ہیرو شپ تھی، اُس نے انھیں محقق نہیں بننے دیا وہ بہت بڑے آدمی تھے مگر محقق نہیں تھے۔ محمد حسین آزاد سب کچھ تھے، محقق نہیں تھے کیوں کہ مزاجی مناسبت ہے۔ ہاں مزاجی مناسبت کے ساتھ علم جزو لازم کی حیثیت رکھتا ہے تحقیق میں، اور جب سے یونی ورسٹی میں ہمارے ہاں اور آپ کے ہاں بھی یہ شرط لگا دی گئی ہے کہ لکچر شپ کے لیے پی ایچ ڈی کی ڈگری ضروری ہے یا یہ کہ اُس سے ترجیح کا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے یا یہ کہ پرموشن کے لیے اُس کی ضرورت ہے، تب سے تحقیق جو ہے وہ پرموشن یا نوکری پانے کا ذریعہ بن گئی ہے جب کہ تحقیق ہے حقائق کی بازیافت کا نام۔ تو جو چیز منجملۂ سامانِ ملازمت بن جاتی ہے، وہ اپنے معیار کو کھو دیتی ہے۔ اب ہر شخص تحقیق کر رہا ہے، خواہ اُس کو تحقیق سے ذہنی مناسبت ہو کہ نہ ہو۔ جس کو تحقیق سے ذہنی مناسبت ہے، جس کو تحقیق کے اصول و آداب کا علم ہے، اُس کے بعد وہ زبان، قواعدِ زبان، علومِ بلاغت، عروض ان سب کو بھی اچھی طرح سے جانتا ہے اور تدوین کے اصولوں کا بھی علم ہے اور اس سے طبعی مناسبت بھی ہے وہ آدمی کسی متن کو ایڈٹ کرسکتا ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا کہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم میر کو خدائے سخن کہتے ہیں لیکن میر کے کلیات کا کوئی معتبر نسخہ اس وقت تک ہمارے پاس نہیں ہے، اس لیے تدوین کی بہت ضرورت ہے اور متنی مسائل پر گفتگو کرنے کی بہت ضرورت ہے۔

''فسانۂ عجائب'' جو نصاب میں شامل ہے، میری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ آج تک یہ کتاب پڑھائی کیسے گئی۔ میری عمر کا بڑا حصہ قواعد اور زبان کے مسائل پر غور کرنے اور گفتگو کرتے گزر گیا ہے، تقریباً چالیس سال میں نے اس میدان میں گزارے ہیں۔ مجھے کئی لگ گئے ہیں اس کے پورے متن کو مرتب کرنے میں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ آدمی غیر ادبی کاموں میں اتنا مصروف ہے کہ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ پانچ سال یا سات سال یا آٹھ سال کسی ایک موضوع کی نذر کرسکے۔ اس

لیے تدوین کا کوئی بڑا کام نہیں ہو رہا ہے۔آپ یہ دیکھیے کہ ''فسانۂ عجائب'' کے بعد دوسرا کام میں نے لیا ''باغ و بہار'' کا۔1964 میں اس کا خاکہ بنایا۔معلوم ہوا کہ ایک کتاب ہے ''ہندی مینوئل'' جس میں باغ و بہار کے 102 صفحے پہلی بار چھپے تھے،مکمل کتاب چھپنے سے پہلے۔اس کا سب کو علم تھا کہ ایسا ہوا ہے لیکن ''ہندی مینوئل'' ہے کہاں، یہ بات ہم میں سے کسی کو نہیں معلوم تھی۔1964 سے 1984 تک بیس سال اسی تگ و دو میں لگا رہا کہ معلوم کیا جائے یہ مینوئل کہاں ہے؟ جب معلوم ہوا کہ لندن میں فلاں جگہ ہے اور اس کا عکس آیا تب وہ کام شروع کیا اور اس پر ''فسانۂ عجائب'' سے زیادہ وقت صرف کرنا پڑا۔اس کی ضخامت بھی ''فسانۂ عجائب'' سے زیادہ ہوگئی ہے۔اگلے مہینے تک غالباً چھپ کر کتاب آجائے گی۔

شبنم رومانی: اس کا متن تو غالباً ''فسانۂ عجائب'' سے کم ہے؟

رشید حسن خاں : جی ہاں!اس کا متن ہے 250 صفحے کا،مگر کتاب کی ضخامت 848 صفحے کی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بہت سے مسائل ہیں:لفظوں پر میں نے زبر زیر لگائے ہیں،اب چوں کہ بہت سے لفظوں کے اعراب بدل چکے ہیں،تو ہر لفظ کے متعلق یہ لکھنا پڑتا ہے کہ اس پر یہ اعراب کیوں لگائے گئے۔یہی حال ہے ترکیب اضافی و توصیفی کا کہ ہم اضافت کے زیر تو لگائے ہیں اور ضرورت کے مطابق اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ یہ زیر کیوں لگایا ہے اور جہاں نہیں لگایا، وہاں یہ نوٹ لکھا ہے کہ یہاں کیوں نہیں لگایا۔اب وہ کتاب یہاں پاکستان میں ادارۂ نقوش (لاہور) چھاپے گا۔

اس وقت کورس میں جو نصاب آپ پڑھا رہے ہیں آٹھویں درجے سے لے کر بی۔اے تک (ہمارے ہاں بھی یہ حال ہے آپ کے ہاں بھی یہ حال ہے) کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ اُن میں سے کون سا حصہ معتبر ہے اور کون سا حصہ غیر معتبر ہے۔اس لیے کہ ہمارا اُستاد جو نصاب تیار کرتا ہے، اُس نے ایک بڑا سستا نسخہ تلاش کر لیا ہے کہ پچھلے نصاب کی کتابیں سامنے رکھ لیں اور اس کو کم و بیش کر کے نیا نصاب تیار کر لیا۔اپنے ہاتھ سے لکھتا بھی نہیں، وہ کاتب کے حوالے کر دیتا ہے، سارا کام کاتب کرتا ہے یا اُس کے بدنصیب شاگرد کرتے ہیں، جو اُس کا کام کرنے پر مجبور ہیں۔قاضی عبدالودود صاحب نے مجھے نصیحت کی تھی کہ دیکھو اگر کبھی کوئی ٹیکسٹ ایڈٹ کرنا تو کبھی اسے ٹائپ نہ کرانا یا کسی سے نقل مت کرانا ورنہ لفظوں کی جو صورت نگاری ہے وہ تباہ ہو جائے گی، اپنے ہاتھ سے نقل کرنا۔تو میں نے ''فسانۂ عجائب'' اور ''باغ و بہار'' دونوں کے متن کو اپنے قلم سے نقل کیا، اُس میں مجھے ایک سال کا عرصہ لگا، کیوں

کہ اس کے اعراب بھی لگانا ہیں۔ پھر لغت بھی دیکھنا ہے کہ اس لفظ کی اس زمانے میں کیا صورتِ حال تھی۔ اگر ہم اپنے طالبِ علم کو صحیح متن پڑھانا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ جتنی نصابی کتابیں ہیں ان کو اصولِ تدوین کے مطابق پہلے مرتب کیا جائے تب پڑھا جائے۔ آپ غور تو کیجیے کہ آپ میرؔ کا شعر اس طرح پڑھاتے ہیں:

ابتداے عشق ہے، روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

حالاں کہ شعر یوں ہے:

راہِ دورِ عشق سے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

جتنے نصاب ہم پڑھا رہے ہیں اُن کو ہم نے ایڈٹ نہیں کیا یہ بڑا مجرمانہ طرزِ عمل ہے۔ یہ ہائی اسکول بورڈ اور یونی ورسٹی اسٹڈی بورڈ کی بھی ذمے داری ہے کہ وہ نصاب جو پڑھائے جا رہے ہیں پہلے اُن میں سے ہر نصاب کے متن کو، اصل مآخذ سے مقابلہ کر کے اصولِ تدوین کے مطابق مرتب کرائیں، تب پڑھائیں۔

آپ مجھے یہ بتائیے کہ پنجاب ٹیکسٹ بورڈ نے جو نصابی کتابیں مرتب کرائی تھیں، اُن میں اعراب، علامات اور رموزِ اوقاف کا بھی اہتمام ملحوظ رکھا گیا تھا، ہم نے کتنی جلدی بھلا دیا اُس کو۔ ہم ساری سائنٹفک چیزیں بھلا دیتے ہیں۔ ہم قوالی بہت شوق سے سنتے ہیں، مشاعرے بہت شوق سے پڑھتے ہیں، شاعری خوب کرتے ہیں اور تعویذ گنڈے سے بھی خوب کام لیتے ہیں اور کرامتوں کے قصے بھی خوب دُہراتے ہیں مگر جس کام میں سائنٹفک طرزِ عمل اور اندازِ نظر کی ضرورت ہے وہ کام نہیں کرتے۔ تو کتنا بڑا تجربہ لاہور میں ہوا تھا نصابی کتابوں کو اس طرح تیار نہیں کرائیں گے، جس طرح گل کرسٹ نے فورٹ ولیم کالج کے طلبہ کے لیے مرتب کرائیں تھیں، یا جس طرح لاہور میں چھاپی گئی تھیں، اُس وقت تک آپ طالب علم کی حق تلفی کرتے رہیں گے۔ مجھے طالب علم سے کوئی شکایت نہیں، وہ کیا کرے؟ اصل میں ہم بے ضمیر ہو گئے ہیں، مجھے آپ بتائیے کہ جب آپ نوکر ہو گئے تو روزی روٹی تو مل گئی لیکن ہمارے ایک سردار جی نے کہا ''اجی دال روٹی کیا، ہم تو مرغ روٹی کھانا چاہتے ہیں۔'' تو ہم نوکر

ہوتے ہی بجائے اس کے کہ اپنے علم میں اضافہ کریں، دوسرے فائدہ مند دھندوں میں لگ جاتے ہیں، لکھنا پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ مجھے طالب علم سے کوئی شکایت نہیں، مجھے اس نوجوان شاعر سے بھی کوئی شکایت نہیں جو یونی ورسٹی سے بی۔اے، ایم۔اے کر کے آیا ہے اُس کا کیا قصور ہے، اُسے پڑھایا کیا گیا ہے۔

شبنم رومانی: بہت۔ بہت شکریہ! کیا اچھی گفتگو کی ہے آپ نے، دوٹوک بھی اور تیکھی بھی۔

(کتاب نما، رشید حسن خاں حیات وادبی خدمات، مرتب اطہر فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، جولائی 2002، صفحہ 138 تا 151)

☆☆☆

رشید حسن خاں

ڈاکٹر اطہر فاروقی

س: گفتگو کا آغاز ہندوستان میں اُردو کی حالات پر آپ کے تبصرہ سے کرتے ہیں۔حکومت ہند نے گذشتہ دس بارہ برسوں میں اُردو کی بقاو ترقی کے لیے جو ادارے قائم کیے ہیں مثلاً ترقی اُردو بیورو وغیرہ ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: آپ نے ترقی اُردو بورڈ کا نام خاص طور پر لیا ہے۔میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر اسی ادارے کی کارکردگی کے متعلق ہم گفتگو کریں تو اس ادارے کے احوال کا اور ایسے دوسرے اداروں کے کام کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو بیورو کا پیش رو ادارہ ترقی اُردو بورڈ جب قائم کیا گیا تھا تو اس کے جو اغراض و مقاصد بیان کیے گئے تھے وہ تو واقعتاً بہت اچھے تھے۔اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اُردو بیورو نے کافی کتابیں چھاپی ہیں۔اس نے بہت سی اہم کتابیں دوبارہ بھی شائع کی ہیں۔ان کتابوں کو اگر بورڈ نہ چھاپتا تو کوئی تجارتی ادارہ ان کو شائع کرنے کی ہمت نہ کر سکتا تھا کیوں کہ وہ زیادہ بکنے والی کتابیں نہیں، بیورو نے بہت سی اصطلاحیں بنوائیں، قدیم اساتذہ کے ان دواوین کو اور نثری تصانیف کو جدید طریقے سے مرتب کر کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا، جو نئے انداز سے مرتب نہیں ہو پاتیں تھیں۔انگریزی اور فارسی کی بہت سی کتابوں کے ترجمے شائع کیے۔اگر ان سب کاموں کی کاغذ پر فہرست بنائیں تو یہ بہت مرعوب کن ہوگی۔لیکن اگر آپ ایک بار ان کتابوں کو پڑھ جائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کاغذ پر کارکردگی کا انداز بالکل دوسرا ہے اور ادبی سطح پر اور تحقیقی سطح پر کام کا انداز بالکل جدا گانہ۔دونوں میں کوئی نسبت نہیں اور اگر ہے بھی تو محض تضاد کی نسبت ہے۔میں کوشش کرتا ہوں کہ بیورو کی شائع کی ہوئی زیادہ سے زیادہ کتابیں پڑھوں، خاص طور سے فارسی کے تراجم وہ کتب جو مرتب کرائی گئی ہیں، جیسے کلیاتِ قلی قطب شاہ۔میری حیرت کی ہر بار کوئی انتہا نہیں رہتی کہ میں جس کتاب کو اُٹھاتا ہوں وہ معیار کے لحاظ سے کم تر درجے کی نظر آتی ہے۔ایک مثال لیجیے۔ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ مرحوم

نے قلی قطب شاہ کا کلیات بڑے اہتمام سے چھاپا تھا، اسی کلیات کو بیورو نے اب دوبارہ مرتب کرایا ہے۔ظاہر ہے کہ نقشِ ثانی کو نقشِ اوّل سے بہتر ہونا چاہیے۔میں نے بہت شوق کے ساتھ اور توجہ کے ساتھ اسی لیے کلیات کا مطالعہ کیا۔میں زورؔ صاحب ہی کے کام سے مطمئن نہیں تھا اور مجھے اس میں بہت سی غلطیاں معلوم ہوتی تھیں مگر جب بیورو کا مرتب کردہ کلیات دیکھا تو معلوم ہوا کہ زورؔ صاحب کا کام تو گویا لاکھ درجے بہتر تھا۔زورؔ صاحب نے جس خطی نسخے پر اپنے کلیات کی بنیاد رکھی ہے اس کا ایک ہی نسخہ ہے سالار جنگ میوزم میں۔اسی کو نئے مرتب نے بھی بنیاد بنایا ہے۔اس اصل نسخے میں مختلف نظموں پر ایسا کوئی عنوان نہیں ہے۔مگر مطبوعہ کلیات میں یہ عنوان نظر آتے ہیں۔زورؔ صاحب کے یہاں بھی اور نئے نسخے میں بھی مثلاً بارہ پیاریاں اور بسنت وغیرہ۔سوال یہ ہے کہ عنوانات کس نے لکھے اور کس نے حق دیا کسی مرتب کو کہ وہ مصنف کے متن میں ان چیزوں کا اضافہ کر سکے جو اصل نسخے میں موجود نہیں۔دونوں مرتبین یہ نہیں بتاتے ہیں کہ یہ اضافے ہم نے کیے ہیں اور اصل نسخے میں یہ چیز نہیں ہیں۔یہی نہیں،اس جدید نسخے میں بلا مبالغہ بیسیوں شعر ساقط الوزن ہیں۔فارسی کی بعض کتابوں کے خاص کر تاریخی کتابوں کے جو ترجمے ہوئے ہیں وہ اس قدر ناقص ہیں کہ ان کو اس سلسلے میں بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔بات یہ ہے کہ تحقیق اور تدوین یہ دو کام ایسے ہیں جو تھوک میں نہیں ہوتے، کثرت ان کاموں کو راس ہی نہیں آتی ہے۔آپ ڈھائی روپے صفحہ نہیں بیس روپے صفحہ دے کر تدوین کا کام بڑے پیمانے پر کرا سکتے ہیں۔لیکن وہ اعلا درجے کا نہیں ہو سکتا۔اعلا درجے کا کام کرنے والے بہت سے لوگ نہیں ہوا کرتے۔ہمارے سارے اداروں کے سامنے ایک بڑا مسئلہ 31 مارچ کا ہوتا ہے کہ 31 مارچ تک ایک خاص رقم کو ختم ہونا چاہیے۔جس طرح پی ڈبلو ڈی کے ٹھیکے دار سرکاری عمارتوں کو بناتے ہیں، اسی طرح ترقی اُردو بیورو نے کتابیں مرتب کرائیں ہیں۔کتابوں کی فہرست بہت لمبی ہے، بڑی مرعوب کرنے والی ہے لیکن علمی اور تحقیقی اور تنقیدی نگاہوں سے دیکھا جائے تو بیش تر کتابیں حد درجہ ناقص ہیں۔ایک اور پہلو لیجیے، بورڈ نے بہت پہلے منصوبہ بنایا تھا کہ اُردو کا مکمل لغت چار پانچ جلدوں میں مرتب کر دیا جائے گا۔اس کے لیے ہندوستان کے نہایت مشہور لوگوں کا انتخاب کیا گیا اور ان کو ایک ایک جلد ترتیب دینے کے لیے دے دی گئی۔برسوں تک ان لوگوں کو با قاعدہ معاوضہ بھی ادا کیا جاتا رہا ان کو ایک ایک معاون بھی دیا گیا تھا، برسوں کے بعد معلوم ہوا کہ لغت مکمل نہیں ہوا۔جب حساب طلبی کا

وقت آیا تو ان سب مخدومین اور محترمین نے، جو مشہور بل کہ اشتہاری ادیب تھے، کام ویسے کا ویسا ہی واپس کر دیا اس کے بعد وہ کام ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کے سپرد کیا گیا کہ آپ اس مجوزہ اُردو لغت کی تدوین فرمائیں۔ میں نے ان سے ایک بار کام کی کیفیت پوچھی تو کہنے لگے ارے کیا کہتے ہو بوریوں میں بھری کچھ چیزیں آئی تھیں۔ جن کو صحیح طور پر رکھنا مشکل تھا اور نہایت درجہ ناقص طور پر اس کام کو کیا گیا تھا۔ غضب یہ ہے کہ سال ڈیڑھ سال کے بعد وہ کام بھی ختم ہو گیا اب وہ کام بھی نہیں ہو رہا ہے۔ ایک مستند اُردو لغت آج اُردو دُنیا کی بہت بڑی ضرورت ہے، لیکن دس سال کی پیہم کوشش کے بعد بھی ترقی اُردو بیورو آج تک یہ لغت مرتب نہیں کرا سکا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ادارہ منصوبہ بندی کے ساتھ اعلا درجے کا کوئی علمی کام کرا ہی نہیں سکتا۔ ایک مختصر لغت ابھی ضرور چھپا ہے۔ میں نے اس کو اسی طرح پڑھا ہے جیسے میں اور کتابیں پڑھتا ہوں۔ مجھے تو اس کا ایک صفحہ ایسا نہیں ملا جس پر ایک یا دو تین مختلف قسم کی غلطیاں نہ ہوں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ مختصر لغت طلبہ کے لیے اور عام آدمی کے لیے چھاپا گیا ہے اور اگر اس میں اس طرح کی غلطیاں ہوں گی تو ان لوگوں کا احوال کیا ہوگا جو ان سے استفادہ کریں گے۔ پروف ریڈنگ کا احوال تو اتنا بدتر کہ اس کی بد تری کی کوئی انتہا نہیں۔ عرض یہ کرنا ہے کہ حکومت نے یہ ادارہ تو قائم کر دیا ہے لیکن اس کی کارکردگی کو اگر معیار سے جانچا جائے تو بہت مایوسی ہوگی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ایک خاص مدت کے بعد ایک ریویو (Review) کمیٹی مقرر ہوتی جو اب تک کے سارے کام کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ دیتی اور خوبیوں کا اعتراف کرتی اور خامیوں کا تعین کرتی تا کہ خوبیوں میں مزید اضافہ ہو اور خامیوں سے بچا جائے۔ ایسی Review کمیٹی آج تک قائم نہیں ہوئی۔ یہ صورتِ حال بہت ہی پریشان کن اور تشویش ناک ہے۔

س: مگر یہاں عرض کرنا چاہوں گا کہ اب جدید علوم اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ ہماری پُرانی مشرقی روایت کے مطابق کوئی فردِ واحد ایسے کاموں کو انجام دے سکتا۔ مغرب میں تو ماہرین کی مختلف جماعتیں ایسے کاموں کو انجام دیتی ہیں کیا ہمارے یہاں علمی منصوبہ بندی کے ساتھ ایسے بڑے کام نہیں کیے جا سکتے؟

ج: جی نہیں! ہمارے یہاں ایسا کوئی کام اس وقت نہیں کیا جا رہا ہے۔ بعض کاموں کے منصوبے ضرور بنائے گئے تھے۔ جب تک وہ منصوبے کاغذ پر رہے تو بہت اچھے معلوم ہوئے، لیکن جب ان کا نمونہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ ان کاموں کو گناہ گاروں کا نامۂ اعمال کا مجموعہ سمجھنا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں سب سے بڑی کمی اس وقت یہ ہے کہ اخلاقیاتِ تحقیق کا وجود گویا نہیں ہے۔ جس کی ہر

بڑے اور اچھے کام کے لیے بنیادی حیثیت ہوتی ہے۔ اول تو ہمارے پاس ایسے کام کرنے والے کم ہیں اور جو ہیں وہ دُنیا کے دوسرے کام دھندوں میں اس قدر اُلجھے ہوئے ہیں، ایسے لگے ہوئے ہیں کہ علمی کام جس یکسوئی، جس ڈوب جانے والے انداز کا مطالبہ کرتے ہیں اس کی نوبت نہیں آپاتی۔ ہر آدمی بہت سی کمیٹیوں کا رُکن ہوتا ہے اور ممبر بننے اور ترقی کرنے میں لگا رہتا ہے۔ بہت سے سمینار، بہت سی سلیکشن کمیٹیاں، بہت سے منصوبے بنانا ہوتے ہیں۔ اپنا گروپ تیار کرنا ہوتا ہے۔ اِس کی ٹانگ کھینچنا ہوتا ہے، اُس کو آگے بڑھانا ہے تو جب ذہن میں ہر وقت ایسی غیر علمی وغیر ایماندارانہ باتیں رہیں گی تو وہ کام کیسے عمل میں آسکتا ہے جس کے لیے ایمان داری اور یکسوئی شرطِ اوّل ہے۔ کوئی گرہ کٹ، کوئی اسمگلر اگر تقویٰ کا درس دے تو کیا آپ کی رائے میں اس میں تاثیر ہوگی؟ کوئی مانے گا اسے؟ اب اس بحث کو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس دو بڑی اچھی مثالیں موجود ہیں جن سے پوری صورت حال سامنے آجائے گی۔ پہلی اچھی مثال ہے علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کی، آپ نے سُنا ہوگا کہ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ چار ضخیم جلدوں میں اُردو ادب کی تاریخ مرتب کی جائے۔ اس کے لیے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کو مناسب رقم دی گئی۔ یونی ورسٹی نے شروع میں بہت اچھا منصوبہ بنایا۔ کاغذ پر جو تفصیلات سامنے آئیں وہ اتنی اچھی تھیں کہ ہم سب کو یقین ہو گیا کہ اب یہ جو تاریخِ ادبِ اُردو لکھی جائے گی وہ واقعی اعلا درجے کی ہوگی۔ اُردو کے نو (9) بہت مشہور اور ذی قوت اہلِ علم کو اس میں شامل کیا گیا۔ پہلی جلد کے مقالات لکھنے کے لیے 1200 سے 1700 تک کے زمانے کا تعین کیا گیا۔ اس کی پہلی جلد جب چھپ کر آئی اور میں نے اس کو پڑھا تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے ہیں کہ میری حیرت کا کیا عالم تھا۔ احوال یہ تھا کہ اگر ایک مقالہ نگار نے ایک بات کو اپنے مضمون میں ایک زمانے کا واقعہ بتایا ہے تو اسی واقعے کو دوسرے مقالہ نگار نے اپنے مضمون میں دوسرے زمانے کا واقعہ بتایا ہے اور اغلاط کا عالم یہ کہ اس کے کسی حوالے کو اعتماد کے ساتھ نقل کیا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی ہو سکتا ہے۔ جتنے اقتباسات دیے گئے ہیں ان میں سے بیش تر کی عبارت قابلِ اعتماد نہیں، میں نے اسی زمانے میں اس پر ایک مفصل تبصرہ لکھا تھا، جس زمانے میں یہ تبصرہ شائع ہوا، اس زمانے میں بدرالدین طیب جی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اس تبصرے نے بہت شہرت پائی۔ یہ تبصرہ پہلی بار رسالہ ''تحریک'' میں چھپا تھا اور اس رسالے سے کئی جگہ نقل کیا گیا۔ بہت چرچے رہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ پہلی جلد با

ضابطہ بازار سے اُٹھالی گئی اور یونی ورسٹی لے جاکر اس کا ڈھیر لگا دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ اب اسے تصحیح کے بعد بازار میں بھیجا جائے گا۔ آج تک نہ تو اس کی پہلی جلد کی تصحیح ہوئی اور نہ باقی جلدیں شائع ہوسکیں۔ اور وہ پورا منصوبہ ختم ہوگیا۔ اب آپ مجھے بتائیے کہ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن نے اُتنا ہی روپیہ دے دیا جتنا آپ نے مانگا۔ ہندوستان کے مشہور ترین پڑھے لکھے لوگوں کو اس پہلی جلد کے مضمون نگاروں میں شامل کیا گیا۔ روپیہ آپ کے پاس، پھر اعلا درجے کا کام کیوں نہیں ہوا؟ اس کی وجہ وہی ہے کہ جو بنیادی شرط ہوتی ہے وہی پوری نہیں ہوئی۔ بات یہ ہے کہ اعمال کا تعلق نیت سے ہوتا ہے تو یہاں وہی مسئلہ تھا کہ ایمان داری کا تصور اور اخلاقیاتِ تحقیق کی پابندی جو بنیادی چیزیں ہیں، ان کا فقدان رہا۔ تحقیق شرک کو گوارہ نہیں کرتی۔ علی گڑھ تاریخِ ادب میں تو بڑی عجیب عجیب باتیں تھیں۔ اس میں پہلا مضمون تھا تاریخی پس منظر سے متعلق پروفیسر محمد مجیب مرحوم کا۔ آپ حیرت کریں گے اس مضمون کا احوال یہ کہ ہمارے عظیم المرتبہ صوفیا کے لیے لکھا تھا کہ یہ لوگ خیرات کھایا کرتے تھے اور قوسین میں لفظ ''فتوح'' لکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ لکھنے والا نہ خیرات کے معنی جانتا ہے اور نہ فتوح کے معنی سے واقف ہے اور نہ ان بلند پایہ صوفیا کے حالات سے واقف ہے۔ ہوا یہ کہ بعض مضمون نگاروں نے اپنے سیاسی اور مذہبی یا غیر مذہبی خیالات کو ادب کی تاریخ میں پس منظر کے طور پر سمونا چاہا اور کسی شخص نے یعنی ڈائریکٹر یا اسسٹنٹ ڈائریکٹر جو دو مشہور لوگ تھے کسی نے بھی یہ نہیں دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ان حالات میں یہ سوچنا پڑے گا کہ آخر اس قسم کے غیر علمی رویوں کی وجہ کیا ہے؟ وجہ وہی ہے کہ ہمارے جو اعلا درجے کے کام کرنے والے ہیں یعنی ہمارے جو زبان و ادب کے نمائندے ہیں، وہ بوالہوسی اور بے ضمیری کے جال میں بے طرح گرفتار ہو چکے ہیں۔ ان کے یہاں ایمان داری کا تصور تو تقریباً مر چکا ہے اور اخلاقیات تحقیق سے۔ تو ان کو ذرا بھی دل چسپی نہیں۔ جب کسی زبان اور کسی اقلیت میں یہ صورت حال پیدا ہو جائے کہ اس کے مشہور اہلِ قلم اور اہلِ نظر اس حد تک بے ضمیر، اس حد تک دنیا دار، اس حد تک جاہ طلب اور اس حد تک گھٹیا گروپ بازی میں گرفتار ہو جائیں تو پھر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس زبان میں کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ کام صرف ہمارے یہاں تک محدود نہیں دوسری طرف بھی احوال یہی ہے۔ آپ یہ دیکھیے کہ پاکستان میں بہت پہلے 1952-1953 کے قریب بہت بڑا منصوبہ تیار کیا گیا تھا کہ چودہ جلدوں میں اُردو کا مکمل لغت مرتب کیا جائے گا۔ اس کے لیے ضروری رقم فراخ دلی کے ساتھ مختص کی گئی، ضروری عملہ

رکھا گیا۔ جب اس لغت کی پہلی جلد چھپ کر آئی اور میں نے اس جلد کو دیکھا تو میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ میں کیا کہوں۔ اُردو میں لکھی گئی غلط سے غلط کتاب کو سامنے رکھ لیجیے تو غلطیوں میں اس لغت کا مقابلہ وہ کتاب نہیں کر سکے گی۔ عالم یہ ہے کہ اس لغت کے اندراج کو آپ اس اعتماد سے پیش ہی نہیں کر سکتے کہ وہ صحیح ہے۔ جو حوالے دیے گئے ہیں ان میں سے بیش تر غلط ہیں۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ مرتبِ لغت نے جو مقدمہ لکھا ہے اس میں خود ہی یہ بات لکھی ہے اس لغت کے بنیادی کارڈ جن لوگوں نے بنائے وہ اس قدر کم سواد تھے کہ لفظوں کو صحیح طور پر پڑھ ہی نہیں سکتے تھے۔ لیکن اس کمی کا اندازہ اس وقت ہوا جب یہ لغت چھپنے جا رہا تھا۔ ذرا غور تو کیجیے کہ لاکھوں روپے صرف کرنے کا منصوبہ بنایا جاتا ہے اس میں بہت سے آدمی رکھے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے بنیادی کارڈ جو اصل کام ہے وہ لوگ بناتے ہیں جو کم سواد ہیں۔ میں اس لغت پر مفصل تبصرہ لکھا تھا جو شائع ہوا اور بہت مقبول بھی ہوا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اس لغت کے جو مرتبِ اعلا تھے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ان غریب کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا، اس کا مجھے افسوس ہوا، لیکن یہ تو الگ بات ہے۔ کیا یہ چیز بہت زیادہ پریشان کن نہیں ہے کہ ہندوستان میں ترقی اُردو بیورو کا لغت لمبے عرصے اور بہت سے خرچ کے باوجود مکمل نہیں ہو سکا۔ پہلی جلد کیا، پہلے دس صفحے بھی مکمل نہیں ہوئے اور پاکستان میں جو لغت مرتب ہوا، تو وہ بھی مجموعۂ اغلاط ثابت ہوا۔ ان سب باتوں سے اندازہ یہی تو ہوتا ہے کہ ہندوستان ہو یا پاکستان اُردو کے اربابِ نظر اور اربابِ قلم علمی کاموں کے بجائے غیر علمی کاموں میں اس قدر مصروف ہو چکے ہیں بل کہ گلے گلے پھنس چکے ہیں کہ علمی کاموں کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں رہا ہے۔ میں یہاں ایک اور بات کہنا چاہوں گا۔ اُردو میں دانشوری کی روایت بڑی طاقت ور رہی ہے ۔پچھلی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے۔ اٹھارویں، انیسویں صدی پر نظر ڈالیے۔ خود بیسویں صدی کے نصف کو دیکھئے ۔کیسے کیسے دیو قامت لوگ نظر آ رہے ہیں۔ لیکن اب ہم ایک اور خلفشار سے دو چار ہو رہے ہیں کہ دانشوری کی وہ روایت جو ملک کی تقسیم کے بعد ٹوٹنے لگی تھی اب تقریباً ختم ہو گئی ہے۔ اب آپ اعتماد کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں شخص دانشور ہے۔ اس سے سب سے بڑا نقصان یہ پہنچا ہے کہ اب ذہنی اور فکری سطح پر ذہنوں کو روشنی دینے والا کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس یہ بڑے پیمانے پر ہوا ہے کہ ہمارا معاشرہ بے ضمیروں کا معاشرہ بنتا جا رہا ہے۔ مگر اس سلسلے میں یہ عجیب بات ہے کہ جنھیں ہم عوام کہتے ہیں، نچلے طبقے کے لوگ، دُکان دار، کارخانے دار، مزدور، دفتروں میں کام کرنے والے، صنعتی کام کرنے والے، غرض کہ کم پڑھے لکھے لوگ اور

اوسط درجے کے بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کی طرح بے ضمیر نہیں ہو پائے ہیں۔ کیوں کہ جب ایسا کوئی معاملہ ہوتا ہے، جس میں کوئی قومی مسئلہ زیرِ بحث آیا ہو تو یہی لوگ سرکوں پر نکل آتے ہیں، بغیر یہ سوچے ہوئے کہ ان کا کیا انجام ہوگا۔ اگر بے ضمیری ہوتی تو کبھی وہ گھر سے باہر نہ نکلتے۔ مشکل یہ ہے کہ وہ طبقہ جو تعداد میں کم ہوتا ہے لیکن پوری قوم کی رہنمائی اس کے حصے میں ہوتی ہے، جسے ہم دانش ور کہتے تھے اور اب سیاسی رہ نما کے نام سے پکارتے ہیں، جو مستقبل کے خطوط کی تشکیل کرتا ہے۔ جو ذہنی سطح پر خاکہ اور نقش بناتا ہے جو رہنمائی کے لیے طریقۂ کار فراہم کرتا ہے اور جس کے یہاں پیش بینی کی صلاحیت ہوتی ہے، اظہار کی جرأت ہوتی ہے وہ طبقہ ختم ہے چکا ہے، یہ بڑی پریشان کُن بات ہے عوام اور متوسط طبقہ اور نچلہ طبقہ یہ سب لوگ کتنے ہی مخلص ہوں ، کیسے ہی جان پر کھیل جانے والے ہوں، لیکن اگر کسی فرقے میں وہ دانش ور طبقہ موجود نہیں جو فکری رہنمائی کر سکے تو پھر قومیں صرف زوال کی طرف جاتی ہیں۔ مستقبل کے عکس تیار کرتا ہے، نقش بناتا ہے، تو بڑی پریشان کُن بات پیدا ہو جائے گی۔ جس طرح اُردو میں مجھے یورپ کے معیار کے مطابق منصوبہ بندی کے ساتھ اعلا علمیت کے کاموں کے لیے کوئی گنجایش نظر نہیں آ رہی ہے اتنی ہی بل کہ اس سے بہت زیادہ پریشان کُن بات یہ ہے کہ دانش وری کی روایت ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی ہے۔ اس المیے کا دوسرا اندوہناک پہلو یہ ہے کہ جو مبینہ دانش ور باقی رہ گئے ہیں، انھوں نے ایک نئے طرزِ عمل کو فروغ دیا ہے اور وہ ہے بک جانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے اچھے سے اچھے اہلِ قلم کو حکومت بہت آسانی سے خرید سکتی ہے۔ قیمتوں میں فرق ہوتا ہے۔ مختلف ادارے ہیں جو مختلف سطحوں پر اور مختلف طریقوں سے لوگوں کو اپنے اپنے جال میں الجھائے ہوئے ہیں تو ایک طرف تو دانش وری کی روایت گویا ٹوٹ رہی ہے اور دوسری طرف بے ضمیری اور فروخت ہو جانے کی روایت فروغ پا رہی ہے۔ اصل پریشان کُن صورتِ حال یہ ہے کہ اُردو چاروں طرف سے جن غیر موافق حالات میں گھری ہوئی ہے وہ بھی ہمیں تعجب میں ڈال دیتے ہیں مگر اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ کچھ نہ دینے کے معاملے میں اس کے ساتھ سب کا سلوک ایک جیسا ہے۔ آپ ایک بات سے اندازہ کیجیے۔ سال بھر سے کچھ ہی زیادہ عرصہ ہوا ہے کہ میں کلکتے گیا تھا، مولانا آزاد کالج کلکتے کا بہت مشہور کالج ہے جہاں اُردو بھی پڑھائی جاتی ہے۔ یہ بہت پُرانا کالج ہے اس کی لائبریری میں اُردو کے نہایت ہی بیش قیمت مخطوطات اور مطبوعات ہیں۔ مجھے ایک مخطوطے کی تلاش تھی اور یہ بات معلوم تھی کہ وہ اس لائبریری میں ہے۔ میں وہاں گیا تو دیکھا کہ رجسٹر میں اس کا اندراج ہے

مگر وہ مخطوطہ نہیں ملا۔ کہا گیا یہاں تو کوئی نہیں ہے آپ خود تلاش کر لیجیے۔ اب جو میں اندر گیا تو میری حیرت اور تکلیف کی کوئی انتہا نہیں تھی کہ سیکڑوں اُردو فارسی کے قیمتی قلمی نسخے اور نایاب مطبوعہ کتب ایسے پڑی ہوئی تھیں جیسے کباڑی کی دُکان میں پُرانے اخبار پڑے ہوتے ہیں اور ان کا ایسا بُرا حال تھا کہ میرے بیان سے باہر ہے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ بس دو چار سال میں تمام ذخیرہ تباہ ہو جائے۔

س: آج یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ دانش گاہوں میں تحقیق کا معیار پست ہو گیا ہے۔ کیا آپ بھی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں اور یہ بات واقعی سچ ہے کہ دانش گاہوں میں تحقیق کا معیار پست ہوا ہے تو آپ کے خیال میں اس کے اسباب کیا ہیں؟

ج: آپ نے بہت دل چسپ سوال پوچھا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ عام طور پر ہماری دانش گاہوں میں جو تحقیقی کام ہو رہا ہے اس کا معیار بلند نہیں ہے۔ اکثر مقالوں کے متعلق یہ بات کہی جا سکتی ہے اور شاذ و نادر ہی کوئی مقالہ ایسا بھی دیکھنے میں آ جاتا ہے جس کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں لیکن مجموعی طور پر تحقیق کے نام پر جو کام ہو رہا ہے، پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے جو مقالے لکھے جا رہے ہیں ان کا معیار بہت پست ہے۔ اس کے بھی کئی سبب ہیں پہلی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ جس چیز کو آپ تحقیق کہتے ہیں وہ ہے کیا؟ تحقیق کا مقصد گم شدہ حقائق کی بازیافت، ان کی تلاش اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حقائق کا صحیح طور پر تعین کر کے دوسرے متعلقات کو صحیح طور پر ترتیب دے سکیں۔ اس میں اہم بات یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے مزاج کو تحقیق سے مناسبت نہیں تو وہ اچھا کام نہیں کر سکتا۔ تحقیق گویا طبیعت کا تقاضہ ہے مگر حقائق کی بازیافت کا عمل اب مداوے مرض بیکاری بن گیا ہے۔ روزگار کا ایک حصہ بن کر اس نے بہت تباہی پھیلائی ہے۔ اُردو میں ایم۔ اے کرنے کے بعد طالب علم کو کہیں نوکری نہیں ملتی۔ اب وہ کیا کرے۔ اس کے سامنے ایک سہارا ہوتا ہے کہ اگر وہ تحقیق میں (ایم۔ فل، یا پی۔ ایچ۔ ڈی میں) داخلہ لے لے گا تو اسے یو۔جی۔سی کا اسکالرشپ (وظیفہ) مل سکتا ہے۔ بعض اور اداروں سے بھی اسکالرشپ مل سکتا ہے۔ اس توقع پر وہ پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لے لیتا ہے اور یونی ورسٹیوں میں اسے داخلہ دے بھی دیا جاتا ہے۔ اس طرح بسم اللہ ہی غلط ہوتی ہے، یعنی تحقیق اس لیے کہ جاتی ہے کہ اسکالرشپ حاصل کیا جائے۔ تحقیق اس لیے نہیں کی جاتی کہ مزاج کا تقاضہ ہے اور ایک ادبی عمل ہے۔ ظاہر ہے جب مقصود بدل جاتا ہے تو انداز کو بھی بدل ہی جانا چاہیے۔ ایک بات اور، یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ جو اہم تحقیقی مآخذ

ہیں یعنی وہ بنیادی چیزیں جہاں سے تحقیق کو مواد ملتا ہے وہ تمام ہی تقریباً فارسی میں ہیں۔ شاگرد یعنی کام کرنے والا اگر بہت اچھی کلاسیکی فارسی نہیں جانتا تو وہ نہ تو تذکروں سے صحیح معنوں میں استفادہ کرسکتا ہے اور نہ تاریخ کی کتابوں سے، پُرانے روز نامچے پڑھ سکتا ہے اور نہ ہی پُرانے دستاویزات کے مندرجات تک اس کی رسائی ہوسکتی ہے۔ غضب یہ ہوا کہ اب ہمارے بیش تر اساتذہ فارسی سے ناواقفِ محض ہیں۔ جب صورتِ حال یہ ہو کہ اُستاد اور شاگرد دونوں ہی فارسی سے ناواقف ہوں تو کلاسیکی اُردو کے متعلق تحقیق ہوگی کیسے؟ اس ضمن میں ایک اور بات بھی اہم ہے کہ ملازمت کے لیے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کو یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے ضروری کردیا گیا ہے۔ یو۔جی سی کے اس ضابطے نے خصوصاً اُردو تحقیق کے ذیل میں اس نے بہت تباہی پھیلائی ہے۔ جب یہ طے ہو کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کی بنیاد پر ہی ملازمت مل سکتی ہے تو اب پی۔ ایچ۔ ڈی کی جائے گی ملازمت حاصل کرنے کے لیے۔ یہاں وہ بنیادی شرط ختم ہو جائے گی کہ طبیعت کا تقاضہ ہے یا نہیں، طبیعت کو مناسبت ہے کہ نہیں۔ ہماری دانش گاہوں میں اس نظام پر بھی زور نہیں ہے کہ اساتذہ کی کارکردگی کس سطح کی ہے، وہ کلاس میں پڑھاتے کیا ہیں؟ وہ خود پڑھ کر آتے ہیں یا نہیں؟ اس کا بھی حساب کبھی نہیں ہوتا۔ ان کے طالب علم کو ادب اور زبان دونوں چیزیں آتی ہیں کہ نہیں۔ اس کا بھی حساب نہیں ہوتا۔ کارکردگی کا حساب اس سے ہوتا ہے کہ انھوں نے کتنی کتابیں لکھیں اور ان کی نگرانی میں کتنے لڑکوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جب کارکردگی کا تعلق اس سے ہو کہ کتنے زیادہ سے زیادہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لڑکوں کی نگرانی کی گئی، رہنمائی کی گئی ہو تو اس طرح یہ ہوگا ہی کہ معیار تو خود بہ خود ختم ہو جائے گا۔ پھر ان حالات کے تحت معیار رہتا ہی نہیں ہے، جب مقصود بدل جائے تو معیار بدل جایا کرتا ہے۔ اس میں بُرائی کا ایک بڑا اضافہ اور طرح کا ہوتا ہے جیسا میں نے ابھی کہا کہ پی۔ ایچ۔ ڈی طالبِ علم کا نگراں بننا بڑے اعزاز اور امتیاز کی بات ہے، یہ کارکردگی کی پہچان ہے اس لیے ہوتا یہ ہے کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے والے طلبہ کی باضابطہ تقسیم ہوتی اور چوں کہ اب لائق اساتذہ کا فقدان ہے یوں طالبِ علم کسی کے بھی حصے میں آئے ،تحقیق تو وہ گھٹیا درجے کی کرے گا۔ حالاں کہ ہونا یہ چاہیے کہ طالبِ علم کو موضوع وہ دیا جائے جو اس کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہو اور پھر اس طالب علم کو ایسے نگراں کے حوالے کیا جائے کہ جو اس موضوع سے کما حقہ واقف ہو لیکن اب یہ ممکن ہی نہیں کیوں کہ تمام اساتذہ کی عملی سطح تقریباً ایک جیسی ہے یعنی سب کی علمی

استعداد صفر ہے۔ اکثر صورتوں میں یہی دیکھا گیا ہے کہ جس موضوع پر طالبِ علم کام کر رہا ہے اس کا نگراں اس موضوع سے بہت کم واقف ہے یا بالکل واقف نہیں اور طالبِ علم اپنے نگراں سے ہدایت کے نام پر کوئی مدد حاصل نہیں کر پاتا۔ وہ تو اس کا بس فارم فارورڈ کر دیا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک مصیبت اور آتی ہے اور وہ ہم سب کے لیے توجہ طلب ہے۔ ہندوستان میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے، کوئی لائبریری، کوئی ٹھکانہ نہیں کہ جہاں سارے مآخذ یکجا ہوں۔ اب اسے معلوم نہیں کہ کون سی چیزیں کہاں ہیں اگر معلوم بھی ہو جائے تو ایک مخطوطہ پیرس میں ہے، ایک لندن میں ہے، ایک پاکستان میں، ایک پٹنہ میں ہے اور ایک پٹیالہ میں۔ اب طالبِ علم کے لیے بالعلوم ممکن ہی نہیں ہوتا کہ وہ کہ وہ ان سب سے استفادہ کر سکے۔ آج تک ہم نے ایسا نہیں کیا کہ ایسا ایک مرکز بنائیں جہاں سارے بنیادی مآخذ کو جمع کر ہی دیں یا کم سے کم ان کی فوٹو اسٹیٹ کرا کر رکھ دیں۔ ایک مسئلہ اور بھی ہے اور وہ ہے ایمان داری کا، صبر کا اور یہ بھی کم اہم نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک تحقیقی مقالہ لکھا گیا، ایک اس مقالے کا نگراں ہے اور دو اس مقالے کے ممتحن ہیں، ان تینوں نے جب یہ تصدیق کر دی کہ یہ مقالہ معیار کے مطابق ہے تب اس پر ڈگری دی جاتی ہے۔ چلئے یہ آپ کو معلوم ہے، ہم سب کو معلوم ہے کہ بیش تر مقالے کم رُتبہ ہوتے ہیں تو سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ نگراں اور وہ ممتحن حضرات آخر کیا کرتے ہیں؟ ان کے سرٹیفکیٹ کے بغیر تو ڈگری مل ہی نہیں سکتی۔ اکثر صورتوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ مقالے کو پڑھنے کی زحمت بہت کم لوگ گوارہ کرتے ہیں یا گوارہ کرتے ہیں تو مختلف اور دوسری چیزیں ان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ سچ نہ بولے اور طالبِ علم کو ڈگری بہر حال دے دی جائے۔ حالاں کہ ممتحن میں علمی اعتبار سے اپنے ہم پیشہ نگراں اساتذہ کی طرح ہی کم علم ہوتے ہیں یوں عافیت کی کوئی راہ نہیں۔ یہاں میں ایک مغالطہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ بُرائی اپنے جواز کے لیے بہت سے حیلے تلاش کر لیا کرتی ہے۔ ویسا ہی ایک بہانہ اس صورتِ حال کے لیے بھی تراشا گیا۔ اب یہ کہا جا رہا ہے کہ دیکھیے صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تحقیق کے سفر میں سنگِ میل نہیں ہے بل کہ یہ تو طالبِ علم کا آغاز ہے۔ پہلے اسے ڈگری مل جائے تو نوکری مل جائے گی اور تحقیق اس کے بعد ہوگی۔ دیکھئے یہ بڑی تباہی پھیلانے والی چیز ہے۔ اگر بسم اللہ ہی غلط ہو، اگر دو سال یا تین سال طالبِ علم نے کام کیا ہے وہ سارا سفر اور وہ تمام کام غیر تحقیقی انداز میں ہو تو کیسے توقع کی جا سکتی ہے۔ اگر ہم طالبِ علم کی تربیت صحیح طور پر نہیں کر سکتے تو وہ طالبِ علم اُستاد بن کر تباہی پھیلائے گا۔

س: تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس پست معیار کے لیے علم زیادہ ذمہ دار ہے یا اُستاد؟

ج: اس سلسلے میں میرا ذہن بہت صاف ہے۔ میں کسی تکلف کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ اس کی تمام ذمہ داری اساتذہ پر عائد ہوتی ہے۔ طالبِ علم تو بے چارہ مصیبت کا مارا ہوتا ہے۔ ایم اے کرنے کے بعد اسے نہیں معلوم ہوتا کہ میں کیا کروں۔ اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقصود کیا ہے ،اسے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ تحقیق کا راستہ کتنی مشکلوں سے بھرا ہوا ہے، وہ تو مصیبت کا مارا ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اسے کوئی چیز مل جائے جس کے سہارے وہ نوکری ملنے تک اپنا وقت گزار سکے۔ نوکری حاصل کرنے کے لیے ڈگری لے سکے، لیکن وہ اساتذہ جو ان سب باتوں کو جانتے ہیں اور جن کو معلوم ہے کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقصد کیا ہے، تحقیق کی مشکلیں کیا ہیں، دراصل ذمہ دار وہی ہیں بل کہ میں تو کہوں گا صحیح معنوں میں اصل مجرم وہ ہیں۔ وہ ایسے موضوعات ایسے طلبہ کو کیوں دیتے ہیں جن کا حق وہ خود ادا نہیں کر سکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کم معیاری میں اساتذہ کا رول فیصلہ کُن ہے

س: ہماری دانش گاہوں میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے موجودہ نظام نے تنقید اور تخلیق کو خلط ملط کر دیا ہے۔ خود میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ تنقید اور تحقیق کے دائرے کہاں کہاں ملتے ہیں؟

ج: تنقید اور تحقیق کے رشتوں کے خلطِ مبحث کی وجہ سے اُردو کے طالب علموں کے ذہنوں میں بڑا خلفسار رہے۔ تحقیق کے تمام موضوع الگ الگ ہیں یعنی تحقیق، تنقید اور تدوین۔ تحقیق نام ہے سچائیوں کی تلاش کا، حقائق کی بازیافت کا اور تنقید ادبی شہ پارے کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے۔ یہ بالکل دوسری چیز ہے اور تدوین جسے اڈیٹنگ کہتے ہیں کسی پُرانے متن کو اصول اور آداب کے ساتھ مرتب کرنا۔ یہ تو سب الگ- الگ چیزیں ہیں۔ ہمارے یہاں جو زندگی کے دیگر شعبوں میں غلط مبحث ہے وہی یہاں بھی ہے۔ تحقیق لفظ استعمال کر کے ہم کبھی تدوین مراد لیتے ہیں اور کبھی اس سے تنقید مراد لیتے ہیں۔ یہ بات بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ اب ہمارے یہاں جتنے بھی موضوعات دانش گاہوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالوں کے لیے اختیار کیا گیا کہ ''کرشن چندر کے افسانوں میں سماجی حالات'' تو اس موضوع کا تحقیق سے کچھ تعلق نہیں۔ ایک اور بات یاد رکھیئے کہ تنقید میں اختلاف رائے ہمیشہ رہے گا کیوں کہ تنقید تعبیرات کا نتیجہ ہوتی ہے جس میں نقاد کی ذاتی پسند ناپسند اور اس کی مزاجی کیفیات بڑا اہم رول ادا کرتی ہیں۔ ایک مصنف کی ایک کتاب سے ایک نقاد جو نتیجہ اُخذ کرتا ہے ضروری نہیں کہ دوسرا بھی وہی نتیجہ اُخذ کرے۔ ایک افسانہ ایک نقاد کی نظر میں بہت اچھا ہے مگر وہی دوسرے کی نظر میں بہت معمولی ہے۔ لیکن تحقیق میں یہ اختلاف ممکن ہی نہیں

ہے کیوں کہ اس میں صرف حقائق ہوتے ہیں۔ مرزا غالب کس تاریخ کس سن میں پیدا ہوئے وہ یا تو غلط ہوگا یا صحیح، اس میں تعبیر کی گنجایش ہیں۔ یوں تحقیق تو حقائق سے بحث کرتی ہے، تنقید صرف تعبیرات پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ بات ضرور یاد رکھیے کہ تنقید کو تحقیق کی ضرورت ہے کیوں کہ اگر تحقیق سارے حقائق کا پہلے سے تعین نہیں کر دے گی تو تنقید اپنے کام کو انجام دے نہیں سکتی اور اگر اس کے بغیر انجام دے گی تو بڑے مغالطے پھیلیں گے۔ مرحوم مجنوں گورکھپوری نے اس شعر کی روشنی میں میرؔ پر ایک مضمون لکھا تھا:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اور اس شعر کے حوالے سے میرؔ کے ذہن کا تجزیہ کیا گیا تھا، جب بتایا گیا کہ یہ میرؔ کا شعر ہی نہیں ہے بل کہ ایک دوسرے شاعر کا ہے تو تجزیے کی ساری عبارت زمیں بوس ہوگئی۔ تو ہمارے یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ حقائق کا تعین کیے بغیر ہماری تنقید ہوا میں گرہ لگاتی ہے۔ تحقیق پہلے حقائق کا تعین کرے گی اور تنقید حقائق کی ان بنیاد پر نتیجہ نکالے گی۔ تنقید، تحقیق کی ہر حال میں محتاج ہے، یوں جب کہ تحقیق تنقید کی نہیں ہے۔ مثلاً آپ یہ کہیں کہ قلی قطب شاہ کے کلام کا جائزہ لیں، اس کے شعری محاسن کا تعین کریں، اس کے یہاں جو اجزا پائے جاتے ہیں: مثلاً رسموں کا بیان اور روایتوں کا بیان اور موسموں کا بیان اور جتنی چیزیں ہیں یہ سب تنقیدی حصہ ہیں، تحقیق سے اسے کوئی واسطہ نہیں تو یہ غلط ہے۔ یہ تعین تو تحقیق ہی کرے گی کہ وہ تمام چیزیں قلی قطب شاہ کہ ہیں بھی ی نہیں۔ ہمارے یہاں اُستاد اور طالب علم دونوں کو نہیں معلوم ہوتا کہ تنقید اور تحقیق کے دائرے کہاں ملتے ہیں اور کہاں سے الگ ہو جاتے ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ادب کے طالب علموں کے ذہن میں یہ واضح ہو کہ تحقیق ایک الگ چیز ہے، تنقید بالکل دوسری اور تدوین یعنی Editing یہ بالکل مختلف فن ہے۔

(ہفت روزہ ’اخبارِ نَو‘ دہلی، 11 تا 17 نومبر، اور 2 تا 8 دسمبر، 1988، مشمولہ ’گفتگو‘ اُن کی‘ انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، اطہر فاروقی، 2006 صفحہ 79 تا 91)

☆☆☆

ہم اُردو والے ہی اس زبان کا دائرہ چھوٹا کرتے جا رہے ہیں: رشید حسن خاں

(رشید حسن خاں سے ڈاکٹر صاحب علی کا انٹرویو)

س: خاں صاحب عام طور سے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ تحقیق و تدوین ایک خشک موضوع ہے، تو اس طرف آپ کس طرح مائل ہوئے؟

ج: اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ تحقیق ہو یا تدوین، ذہنی مناسبت بنیادی چیز ہے۔ میرے مزاج کو ان دونوں موضوعات سے مناسبت تھی۔ اسی لیے میں نے تحقیق و تدوین کا کام اختیار کیا۔ میں چوں کہ مدرسہ کا طالب علم رہا ہوں اس لیے عربی، فارسی اور اُردو میں جو اعلا درجے کے کام ہوئے ہیں ان کو پڑھنے کے بعد میرے دل میں یہ شدید احساس پیدا ہوا کہ مجھے بھی اسی انداز کا کام کرنا چاہیے۔

س: تحقیق و تنقید کے علاوہ آپ کے اور کیا مشاغل ہیں؟

ج: مشاغل تو میرے پڑھنے لکھنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں کیوں کہ میں یہ بات مانتا ہوں کہ جو لوگ دنیا کے دوسرے دھندوں میں لگے رہتے ہیں وہ اچھے علمی کام انجام نہیں دے سکتے۔ ہاں! اگر مجھ سے یہ پوچھیں کہ میری دل چسپیاں اور کیا ہیں؟ تو مجھے اسپورٹس سے بہت دل چسپی ہے۔ میں نے پندرہ سال تک ہاکی کھیلا اور باسکیٹ بال اور فٹ بال میرے پسندیدہ کھیل ہیں۔ جب تک میں دہلی میں رہا تو ان تینوں کھیلوں کے اچھے ٹورنامنٹ ہوتے تو میں پابندی کے ساتھ شروع سے آخر تک دیکھتا تھا اور میرا یہ شوق اب بھی برقرار ہے۔

س: یہ بتائیے کہ آپ نے زندگی میں کون سا کارنامہ انجام دیا ہے؟

ج: ایسے سوال کا جواب دینا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن آپ نے یہ بات پوچھی ہے تو کچھ نہ کچھ کہنا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں نے ایسے وہ کام ضرور کیے ہیں جن کے بہت اثرات پڑے ہیں اور شاید

اُن کو بہت دنوں تک یاد رکھا جائے۔ایک تو صحتِ املا سے متعلق میرا کام ہے۔میری کتاب ''اُردو املا'' ہے،1974 میں چھپی تھی۔اس کے بعد دوسری چھوٹی سی کتاب ''اُردو کیسے لکھیں'' شائع ہوئی۔میں نے ہندوستان کی مختلف یونی ورسٹیوں میں اُردو املا کے موضوع پر بہت سے لیکچرز دیے اور متعدد ورک شاپس میں حصہ لیا۔اس طرح میں سمجھتا ہوں یہ موضوع ایسا ہے کہ میں نے اس سلسلے میں کچھ اہم کام کیا ہے۔

میرا دوسرا موضوع کلاسیکی متن کی تدوین یعنی پرانے متون کو تحقیق کے لیے اصولوں کے مطابق مرتب کرنا۔اس سلسلے میں فسانۂ عجائب،باغ و بہار،مثنوی گلزار نسیم اور مثنویاتِ شوق شائع ہو چکی ہیں۔جب کہ مثنوی سحرالبیان زیرِ کتابت ہے۔

س: آپ کی کتاب ''مثنویاتِ شوق'' آئی ہے تو حال ہی میں اس کتاب پر جو تبصرے یا تنقیدیں ہوئی ہیں،ان سے متعلق اپنے تاثرات بیان فرمائیں۔

ج: میں ایسے سارے مضامین کو بہت احتیاط اور شوق سے پڑھتا ہوں۔یہ میری عادت ہے کہ ایسے مضامین میں کوئی قابلِ قبول بات ہوتی ہے تو اسے ضرور قبول کر لیتا ہوں لیکن مثنویاتِ شوق کے سلسلے میں جو ایک آدھ تحریریں سامنے آئیں ہیں مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اُن کا انداز غیر علمی،غیر تحقیقی اور غیر ادبی ہے۔کیوں کہ میرے پیش کیے ہوئے کسی اہم مسئلے کو غلط ثابت نہیں کیا گیا بل کہ اُس مسئلے کو پیش کرنے پر بُرا کہا گیا۔اگر کسی ایسی بات کی طرف توجہ دلائی جاتی جو واقعتاً غلط ہوتی تو میں فراخ دلی کے ساتھ اسے قبول کر لیتا۔میں صرف علمی بحثوں میں حصہ لے سکتا ہوں لیکن بُرا بھلا کہنے کے مقابلے میں حصہ نہیں لے سکتا۔

س: تو کیا یہ صحیح ہے کہ اُردو ادب کا معیار پست ہوتا جا رہا ہے؟

ج: مجموعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے۔کیوں کہ اچھی چیزیں بھی سامنے آ رہی ہیں اور کم درجے کی چیزیں بھی۔ماضی میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے اور مستقبل میں بھی ایسا ہوتا رہے گا۔لہٰذا میں نہیں کہہ سکتا ادب کا معیار پست ہے۔

س: موجودہ دور کے کن اُردو محققین کو آپ اہم تصور کرتے ہیں؟

ج: میری نظر میں ڈاکٹر گیان چند جین،ڈاکٹر حنیف نقوی اور کالی داس گپتا رضا ہمارے زمانے کے اچھے محققین ہیں۔بہت غور کرنے کے بعد بھی اس سلسلے میں کوئی اور نام میرے ذہن میں نہیں آتا۔

س: یہ الیکٹرانک میڈیا کا عہد ہے۔آپ یہ بتائیے کہ آپ کے نزدیک الیکٹرانک میڈیا کے پھیلاؤ سے ادب کو فائدہ ہوا یا نقصان؟

ج: چوں کہ الیکٹرانک میڈیا سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں رہا۔اس لیے میں اس سوال کا مفصل جواب دے نہیں سکتا۔ہاں یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ ادیبوں کو فائدہ پہنچا ہے اور ادب کی بعض اصناف کو فروغ ملا ہے۔مثلاً ریڈیو ڈراما اور مکالمہ نگاری کا انداز،صحافت کی زبان،سیاسی مسائل کو بیان کرنے کا مختلف انداز وغیرہ۔

س: ہندوستان کے موجودہ اُردو اخبارات ادب کے فروغ میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟

ج: میں سمجھتا ہوں کہ اُردو زبان کے فروغ میں اُردو اخبارات اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔دیکھئے! ہمارا اولین مقصد ہے زبان کا تحفظ اور زبان کا فروغ۔اور اس کام کو اُردو اخبارات سب سے بہتر انجام دے سکتے ہیں اور دے رہے ہیں۔اس اعتبار سے اُردو اخبارات کی بڑی اہمیت ہے۔یاد رکھیے کہ زبان کا تلفظ اولین چیز ہے اور ادب اس کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

س: اُردو زبان کے آپ ایک بڑے اسکالر ہیں۔اس کا آپ کے نزدیک ہندوستان میں مستقبل کیا ہے؟

ج: یہ بڑی عجیب صورت حال پیدا ہوگئی ہے جبکہ جو اُردو کے پُرانے مراکز رہے ہیں ،مثلاً شمالی ہندوستان میں وہاں اُردو سمٹ رہی ہے اور اس کا دائرہ چھوٹا ہوتا جا رہا ہے اور جو زبان کے غیر روایتی مرکز ہیں جیسے ممبئی، گجرات اور کرناٹک وغیرہ، یہاں اُردو زبان کو فروغ مل رہا ہے اور ہاں بہار میں بھی یہ باقی رہے گی اور فروغ پائے گی۔کیوں کہ بہار کے لوگوں بڑی جدوجہد کی ہے اور سیاسی ذریعوں کو استعمال کیا ہے۔اس زبان کی حفاظت اور فروغ کے لیے اور اس میں وہ کامیاب رہے ہیں۔

س: خاں صاحب! ایک اہم سوال یہ کہ آج کے الیکٹرانک دور میں اُردو زبان ہماری زندگی کو کس طرح کامیاب بنا سکتی ہے؟

ج: اس سلسلے میں، میں سمجھتا ہوں کہ ہماری یونی ورسٹیوں میں یا اُردو کے بڑے اداروں میں ایک سالہ دو سالہ ایسے ڈپلومہ اور ڈگری کورسیز شروع کیے جانا چاہئیں جو جدید ٹکنالوجی کے تقاضوں کے مطابق ہوں۔اعلا ادب پڑھنے سے سب کا بھلا نہیں ہوگا۔ہمیں اس پر زور نہیں دینا چاہیے کہ سب طالب علموں کو میر اور غالب ہی پڑھائیں۔ضرورت اس کی ہے کہ زیادہ طالب علموں کو جدید ٹکنیکل موضوعات سے آشنا کیا جائے اور ایسے نصاب تیار کیے جائیں جو ان کے لیے نئے مشینی تقاضوں کو سمجھنے میں معاون ہو سکیں۔اس سے بہتری حاصل ہوگی۔نوکریاں تو ویسے بھی کم ہیں اور اُردو والوں کے لیے کم سے کم ہیں۔

س: ہندوپاک کے مابین امن اور دوستی قائم کرنے کے لیے اُردو زبان کیا کردار ادا کر سکتی ہے؟

ج: دو ملکوں میں امن زبان کی بنیاد پر قائم نہیں ہوتا۔آج کل سیاسی تعلقات کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ہمیں جذباتی نعروں کی بجائے کڑوی سچائیوں سے آنکھیں چار کرنا چاہیے اور حقیقی صورتِ حال کو سمجھنا چاہیے۔

س: نئی نسل کو اُردو زبان کی طرف کیسے راغب کیا جا سکتا ہے؟

ج: بیش تر اُردو والے اپنے بچوں کو اُردو پڑھانا ضروری نہیں سمجھتے۔اس سلسلے میں سب سے اندوہ ناک صورتِ حال یہ ہے کہ اُردو کے جو بڑے اور مشہور لکھنے والے ہیں ،ادیب ہیں،شاعر ہیں اور اُستاد ہیں،ان میں سے بیش تر کے بچے اُردو سے ناواقف ہیں۔اسی طرح ہم اُردو والے ہی زبان کا دائرہ چھوٹا کرتے جا رہے ہیں۔نئی نسل ،اُردو زبان کی طرف راغب ہو سکتی ہے بہ شرط یہ کہ نئی نسل کے والدین اور اساتذہ اپنی-اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔

س: آپ کے نزدیک کیا اُردو رسم الخط کو تبدیل کرنا مفید ہوگا؟

ج: زبان ختم ہو جائے گی ،اس دن ،جس دن اس کا رسم الخط بدلا جائے گا۔جو لوگ رسم الخط بدلنے کی بات کرتے ہیں وہ اُردو زبان کے دشمن ہیں خواہ اپنے آپ کو دوست کہتے ہوں۔آخر ہندوستان کی کسی اور زبان سے کیوں نہیں کہا جاتا کہ وہ اپنا رسم الخط بدل لے۔اگر آپ کسی دوسری زبان والے سے کہو کہ آپ اپنا رسم الخط بدل لو تو وہ یہ سمجھے گا کہ آپ نے اسے گالی دی ہے۔رسم الخط زبان کی پہچان ہوتا ہے۔پہچان جب ختم ہو جاتی ہے تو وجود ختم ہو جاتا ہے۔

س: دیگر زبانوں کے ادب کے تراجم سے اُردو زبان و ادب کو فائدہ پہنچ رہا ہے؟ کس زبان کے تراجم آپ کے نزدیک زیادہ اہم ہیں؟

ج: اس میں ایک زبان کی خصوصیت نہیں ہے۔ہر زبان کے ترجمے دوسری زبانوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔اُردو میں مختلف زبانوں کے اچھے مضامین اور کتابوں کا ترجمہ ہوتے رہنا چاہیے۔اس سے زبان اور ادب دونوں کو روشنی ملتی ہے اور معلومات حاصل ہوتی ہیں اور ذہنی طور پر ایک دوسرے سے قربت کا احساس جاگ اٹھتا ہے نیز نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

س: ہندوستان کی اُردو اکادمیوں کی کارکردگی سے متعلق آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ج: یہ سوال بہت وضاحت کا طلب گار ہے۔اس پر تو ایک لمبا چوڑا مضمون لکھا جا سکتا ہے۔اس لیے میں

یہاں تفصیل کے ساتھ کوئی رائے ظاہر نہیں کر سکتا۔ البتہ یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ہر صوبے کی اُردو اکادمی پر اس صوبے کی سیاست کا بڑا گہرا اثر پڑ رہا ہے اور اس طرح اُردو اکادمیوں میں جو اعلا عہدے دار آتے ہیں، ان کا زبان دوست اور ادب دوست ہونا ضروری نہیں رہا۔ ضروری یہ ہو گیا ہے کہ وہ حکمراں جماعت سے قریب ہوں۔ اور اس کے Idealogy کو مانتے ہوں۔ اس طرح جو اکادمیوں کا اصل مقصد ہے زبان کا فروغ، وہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ وہاں ادیبوں کی مالی امداد کے وسیلے بڑھتے جا رہے ہیں۔

س: گجرال کمیٹی اور علی سردار جعفری کمیٹی کی سفارشات سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: میں تجاویز سے متعلق کیا رائے دوں۔ ان کمیٹیوں کی تجاویز کو نافذ کرنا حکومت کا نہ پہلے ارادہ تھا اور نہ اب ہے۔ آپ چار کمیٹیاں اور بنا دیجیے کیا ہوگا؟ حکومت جس کام کو نہیں کرنا چاہتی اس کے لیے ایک بڑی کمیٹی بنا دیتی ہے جب حکومت کچھ کرنا نہیں چاہتی تو میں کمیٹیوں کو بُرا کیوں کہوں؟

س: خاں صاحب! آخر میں ایک سوال کہ اُتر پردیش اُردو اکادمی نے اپنا سب سے بڑا اعزاز ''مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ'' آپ کی خدمت میں پیش کیا، اس موقع پر آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

س: دیکھئے صاحب! میں نے اس اس ایوارڈ کو کوئی اعزاز سمجھ کر قبول نہیں کیا۔ یہ سمجھ کر قبول کیا کہ اچھی رقم ملے گی جو میرے کام آئے گی۔ پیسوں کی ضرورت سب کو ہوتی ہے مجھے بھی ہے۔ میرے ایک دوست نے کہا کہ اچھا تمھیں انعام ملا ہے جو تم سے پہلے فلاں صاحب کو مل چکا ہے۔ میں نے کہا، ہاں بھئی! وہی انعام ملا ہے لیکن میں نے اسے اعزاز سمجھ کر نہیں قبول کیا ہے بل کہ یہ سمجھ کر قبول کیا ہے کہ اس کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کا نام وابستہ ہے جو دانش ور تھے اور ادیب تھے اور یہ بھی کہ اس کے ساتھ ایک بڑی رقم ہے۔ صرف اعزاز کا معاملہ ہوتا تب مجھ پر آپ کے طنز کا کوئی اثر ہوتا۔ البتہ مجھے اس پر تعجب ہوا تھا کہ میرا نام کیسے آ گیا۔ میں تو کسی گروپ میں شامل نہیں Public Relation کا آدمی بھی نہیں ہوں۔ تعلقات بیش تر لوگوں سے خراب ہیں۔ جن سے تعلقات خراب نہیں ہیں خوش وہ بھی نہیں رہتے۔ اس کے باوجود میرے نام پر غور کیا گیا اس کے لیے میں ایوارڈ کمیٹی کے سبھی ممبروں کا شکر گزار ہوں۔

(روزنامہ 'انقلاب' بمبئی ایڈیشن، 13 اکتوبر 1998)

نوٹ: اس انٹرویو کے تراشہ کو ڈاکٹر ٹی. آر. رینا نے 16 اگست 2017 کو جموں سے احقر کے لیے بہ ذریعہ ڈاک روانہ کیا۔

☆☆☆

تحقیق اپنا معیار کھوتی جارہی ہے

(رشید حسن خاں صاحب (مرحوم) سے بات چیت)

عارف ہندی/جاوید انور

رشید حسن خاں صاحب (مرحوم) سے جناب عارف ہندی اور جاوید انور صاحب کی یہ گفتگو اُن کے دولت کدے پر بہ تاریخ 27/نومبر، 2004 کو بروز اتوار ریکارڈ کی گئی۔ (ادارہ)

غیر مطبوعہ

س: خاں صاحب! گفتگو کا آغاز کیوں نہ اس سوال سے کیا جائے کہ آپ کی وہ کون سی تحریر تھی جو سب سے زیادہ زیرِ بحث رہی یا جسے بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی؟ جہاں تک میرا قیاس کام کرتا ہے، آپ کا وہ تبصرہ جو آپ نے علی گڑھ تاریخ ادب اُردو پر لکھا تھا، سب سے زیادہ زیرِ بحث رہا۔ اس کے علاوہ کوئی اور تحریر ہے؟

ج: آپ کا قیاس بالکل دُرست ہے اور یہ ہندوستان کی کسی بھی زبان میں پہلا واقعہ تھا جب کسی ایک تبصرے کی بنیاد پر اتنی بڑی کتاب آفشیلی واپس لے لی جائے۔ اسے بند کر دیا جائے، جو آج کل سرد خانے میں بند ہے۔ اور یو جی سی کو اس پورے پروجیکٹ کو ختم کر دینا پڑا۔ ظاہر ہے اس کا ردِ عمل بڑا شدید ہونا تھا، ہوا۔ اس سلسلے میں بعض دل چسپ باتیں سامنے آئیں۔ مثلاً یہ کتنا اچھا کام ہو رہا تھا، خواہ اس میں غلطیاں تھیں ہو جانے دیا ہوتا۔ کام تو وہ ہو جاتا۔

یہ نقطۂ نظر اُن لوگوں کا ہوتا ہے جو آسان پسند ہوتے ہیں اور برائیوں سے ہر سطح پر خواہ وہ علم ہو، ادب ہو، یا شخصی زندگی ہو، وہ نکتہ چیں صلاحیت رکھتے ہیں۔ جو عام پولیٹیشین میں ہوتی ہے جو ایک ادیب میں ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ اس سے ایک سوال اور پیدا ہوا۔ اس میں ہمارے کئی بزرگ شریک

تھے کہ تحقیق دو طرح کی ہوتی ہے اور مثبت، ایک منفی، اصل میں تاریخ ادب اُردو کے تبصرے پر کوئی جواب تو تھا نہیں۔ اس میں جتنی کوتاہیاں اور اخلاقی غیر ذمہ داریاں ہمارے درجۂ اول کے لوگوں نے برتیں تھیں، اس کا کوئی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا اس کو ہلکا کرنے کے لیے اس کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے بہت سے سوالات تراشے گئے تاکہ لوگ اصل موضوع سے ہٹ جائیں۔

اس بات سے بہت لوگوں نے اتفاق کیا کہ تحقیق صرف تحقیق ہوتی ہے، نہ مثبت ہوتی ہے نہ منفی۔ جو بات کہی گئی ہے وہ یا تو سچ ہے یا جھوٹ ہے۔ اور اگر کوئی اس کے بیچ کا راستہ نکالتا ہے تو وہ شخص ادیب نہیں ہے، پالیٹیشین ہے، کیوں کہ یہ کام اسی کا ہے۔ میں نے ایک لکچر میں کہا تھا کہ جس شخص سے بہت زیادہ لوگ خوش ہوں، یقین کیجیے کہ اُس نے سچ کبھی نہیں بولا، بہت کم بولا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ایک تو شبد منفی تحقیق کا تھا اور ایک یہ تھا کہ بھائی جو کام ہو رہا ہے اُسے ہونے دیجیے اور یہ دونوں ہی سوالات ہمارے اخلاقیات کش زوال اور ہمارے عملی اندازِ نظر کے زوال کی علامت ہیں۔

س: مثبت اور منفی تحقیق کی جو بات آپ نے کی ہے تو یہ اصطلاح بھی تو تحقیق کے لیے ایک محقق نے گڑھی؟

ج: ایک نہیں دو دو محققین نے اس اصطلاح کو فروغ دیا اور اس کا بھی ایک دل چسپ واقعہ میں آپ لوگوں کو سُناؤں کہ جب تبصرہ شائع ہوا تو ہمارے اس محقق دوست نے خط لکھا مجھے کہ کیسا اچھا تبصرہ لکھا ہے آپ نے۔ یہ ایک بڑا کام ہوا اور اسی تاریخ میں ان صاحب نے آل احمد سرور صاحب کو خط لکھا کہ رشید حسن خاں بھی خوب آدمی ہیں۔ بھلا یہ کوئی بات ہوئی کہ تبصرہ لکھ ڈالا۔ اتنا بڑا کام رُک گیا۔ تو ایسے لوگوں نے ان اصطلاحوں کو عام کیا ہے جن کے مفاد وابستہ ہیں اُن لوگوں سے جو موضوعِ تنقید بنے یا جنھیں میں نے موضوعِ اعتراض بنایا۔ یہ علمی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ خالص مصلحت پسندی کو ایک نئے علمی انداز سے پیش کرنے کی غیر پیشہ ورانہ کوشش تھی۔

س: آپ کے تبصرے کے بعد آپ کے جو مضامین آئے یا آپ کی کتابیں جو منظرِ عام پر آئیں، ان پر عموماً کس طرح کے تبصرے کیے گئے؟

ج: یہ تبصرہ اگر میری یادداشت غلطی نہیں کرتی تو 1963 میں چھپا تھا یا 1964 اور میری پہلی کتاب اس کے دس گیارہ بارہ سال کے بعد آتی ہے۔ جب بہت سی چیزیں دب چکیں تھیں۔ تو یہ مسئلہ تھا ہی نہیں

۔میری ایک کتاب آئی، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ۔ جس میں وہ تبصرہ بھی شامل تھا اور ایسے کئی اور تبصرے بھی تھے۔ اس پر بہت اچھے تبصرے ہوئے۔ لوگوں نے بہت پسند کیا اور حق گوئی اور بے باکی سے کام لیا۔ یعنی مختصراً کہا جائے تو یہ کہ اس کی تعریف کی گئی۔

س: آج تحقیق اُردو نے غالباً ایک صدی مکمل کر لی ہے۔ لہٰذا ہم لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا تحقیق اُردو میں پورے طور پر قائم ہو چکی ہے یا کچھ تشنگی باقی رہ گئی ہے جیسے کہ تنقید ہمارے ادب پر پوری طرح حاوی ہے؟

ج: علم ہو یا فن، تکمیل کا اس میں کوئی درجہ نہیں ہوتا۔ آپ جتنی منزلیں طے کر لیں گے، اتنی ہی نئی منزلیں راستہ دیکھ رہی ہوں گی آپ کا۔ تو یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہاں ایک بات کہنے کی ہے کہ اُردو میں با ضابطہ تحقیق کا آغاز کم وبیش 1920 سے ہوتا ہے حافظ محمود خاں شیرانی کے مضامین سے۔ میں اُن کو اُردو میں تحقیق کا معلمِ اوّل کہتا ہوں اور انھیں اپنا معنوی اُستاد بھی مانتا ہوں۔ ان کے بعد کم و بیش 70۔1960 تک تحقیق کا ایک انداز اور آہنگ اس لیے قائم رہا کہ اس میں معیار اور حق گوئی دونوں اپنی سطح پر قائم تھیں۔ اس کے بعد قاضی عبدالودود، مولانا عرشی کے اُٹھ جانے کے بعد سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ تحقیق اپنا معیار کھوتی جا رہی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اب عام طور سے لوگ فارسی سے کم واقف ہیں تو اس فارسی سے جسے تہرانی فارسی کہتے ہیں؟ جو بول چال کی زبان ہے ہم تحقیق کے کام کرنے والوں کو جن ماخذ سے سابقہ پڑتا ہے وہ صرف کلاسک فارسی میں ہے۔ اس لیے کلاسک اور تہرانی دو زبانیں ہو چکی ہیں۔

س: خاں صاحب! ابھی آپ نے...

ج: قطع کلام، مثلاً آپ میر تقی میرؔ پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ میر کا پورا عہد ان تذکروں میں محفوظ ہے جو فارسی میں یا اُن تاریخوں کی کتابوں میں محفوظ ہے جو فارسی میں محفوظ ہیں۔ لہٰذا جو طالب علم فارسی نہیں جانتا اور اچھی فارسی نہیں جانتا، جسے ہم کلاسیکی فارسی کہتے ہیں تو وہ بے چارہ کلاسک پر کس طرح سے کام کرے گا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارا یونی ورسٹی کا طالب علم جو اُردو تو جانتا ہے لیکن اچھی فارسی نہیں جانتا وہ کلاسک میں دل چسپی رکھتے ہوئے بھی کوئی معتبر کام نہیں کر سکتا۔

س: خاں صاحب ابھی آپ کلاسکل فارسی کا ذکر کر رہے تھے۔ اس پر تھوڑی دیر بعد تفصیل سے گفتگو کی

جائے گی۔ فی الحال یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ادب میں جس طرح تنقید حاوی ہے ہمارے اذہان پر، اس طرح تحقیق حاوی نہیں ہو سکی اور محققین کی تعداد بھی ناقدین سے ہمیشہ کم رہی، اس کے کیا اسباب ہیں؟

ج: اس کی وجہ یہ ہے کہ تحقیق تنقید کے مُقابلے میں اتنا مختلف عمل ہے کہ اس کو سمجھنے کے لیے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک خاص طرح کی مزاجی مناسبت درکار ہوتی ہے۔ آدمی کتنا ہی پڑھا لکھا ہو اگر مزاجی مناسبت نہیں ہے تو وہ تحقیق نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ہمارے جتنے بڑے عالم ہوئے اتنے بڑے محقق ہوتے، ہم تو مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حالی کو بھی محقق نہیں مانتے۔ یہ دونوں ناقد تھے۔ تو یہ مزاجی مناسبت نہیں ہے۔ تو یہ تو پہلے ہی دن سے کمیاب رہی ہے اور اب تو کمیاب تر ہوتی جارہی ہے۔ سارا مسئلہ یہی ہے۔ اسی لیے تحقیق کی طرف کم لوگ رُجوع ہوتے ہیں۔ صرف وہ لوگ رُجوع ہوتے ہیں، جن کی مزاجوں کی تحقیق سے کسی طرح کی کسی سطح پر مناسبت ہو۔ ہاں ایک مشکل یہ ہے کہ اب تحقیق مالِ تجارت یوں ضرورت کی چیز بن گئی ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نہیں تو آپ کو نوکری نہیں ملے گی۔ لہٰذا جب کوئی چیز تجارت کے زمرے میں آجاتی ہے تو اپنا معیار، وقار اور حیثیت بدلنے لگتی ہے۔ اس صورتِ حال میں یہ ممکن ہی نہیں کہ اس عُجلت پسند معاشرے میں تحقیق کی طرف زیادہ لوگ راغب ہوں۔

س: کیا آپ کے نزدیک تحقیق و تنقید کے مابین کوئی تضاد ہے۔ آپ تنقید و تحقیق کے رشتے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: تضاد قطعاً نہیں ہے۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ اہم بات جو ہے وہ یہ ہے کہ تحقیق کا کام حقائق کا تعین کرنا ہے۔ جب تک تحقیق بنیادی حقائق کا، بنیادی سچائیوں کا، بنیادی واقعات کا صحیح صحیح نقطۂ نظر سے تعین نہیں کر دیتی اُس وقت تک تنقید اپنا کام شروع نہیں کر سکتی اس لیے تنقید اور تحقیق میں کوئی تضاد جو بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہو۔ ایسی کوئی صورت حال نہیں ہے۔ ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں کی ذمہ داریاں الگ الگ ہیں، اس لیے تحقیق اور تنقید بالکل ایک چیز بھی نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ دونوں کی بنیادوں میں فرق ہے۔ تنقید میں ہم رائے ظاہر کرتے ہیں۔ تحقیق میں سب سے بڑا جُرم ہے رائے کا ظاہر کرنا ہم تحقیق میں ان سارے حقائق کو کیوں پیش کرتے ہیں۔ جو گویا وابستہ ہیں ادیب، شاعر یا متن سے، خواہ وہ حقائق ہمیں پسند ہوں یا ناپسند ہوں۔ تنقید میں ان حقائق کی تعبیر کرتے ہیں۔ اگر تعبیر کی صلاحیت نہیں ہے نقاد میں تو وہ اچھی تنقید نہیں کر سکتا۔ جب کہ تحقیق میں تعبیر کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اس طرح

تحقیق اور تنقید کے راستے الگ ہو جاتے ہیں لیکن باہمی تعلق برقرار رہتا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کیوں کہ تحقیق کے بغیر کلاسک ادب کی حد تک تنقید اپنا کام شروع نہیں کر سکتی۔

آپ ماڈرن ادب پر تنقید کرنا چاہیں، بے شک کریں۔ اس کام کا مسئلہ الگ ہے لیکن اگر آپ اُردو زبان، اُردو ادب اور اُس کی تین صدیوں پر مشتمل کسی بھی موضوع پر تنقید کرنے کے متمنی ہیں تو وہاں جب تک تحقیق آپ کو صحیح واقعات اور صحیح متون مہیا نہ کر دے، تب تک آپ تنقید ہرگز نہیں کر سکتے۔ ورنہ وہی ہوگا جیسا کہ غالب کے سلسلے میں ہوا ہے کہ یہ شعر واقعی غدر سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے اور شعر فلاں واقعے سے، یہ سب چیزیں ہوتی رہی ہیں اور تحقیق و تنقید میں درجہ بندی کا ربط ہے۔ اس میں کوئی تضاد نہیں ہے لیکن دونوں کے کام الگ الگ ہیں۔ ایک بات اور تحقیق کے لیے جس مزاج اور ذہن کی ضرورت ہے، وہ چوں کہ کمیاب ہے، اس لیے محققین کی تعداد کم اور چوں کہ یہ مسئلہ تنقید میں نہیں ہے۔ اس لیے ناقدین کی تعداد زیادہ ہے۔ لہٰذا اس زاویے سے بھی دونوں الگ الگ دیکھے جا سکتے ہیں۔

س: خاں صاحب جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ ان دونوں میں تضاد نہیں ہے بل کہ ان دونوں کی ذمے داریاں الگ الگ ہیں، اس سلسلے میں، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کوئی تخلیق منظرِ عام پر آئی اسے قارئین نے پسند کیا۔ میرے خیال میں پہلا فرض تنقیدی شعور نے ادا کیا۔ تحقیق کا کام اس کے بعد شروع ہوا۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا موقف رکھتے ہیں؟

ج: قارئین نے کس چیز کو پسند کیا اور کس چیز کو پسند نہیں کیا، یہ مسئلہ تحقیق کا سرے سے ہے ہی نہیں۔ مثلاً میر کا یہ شعر اچھا ہے یا خراب، تحقیق سے اس کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں۔ یہ مسئلہ تنقید کا ہے، لیکن یہ شعر میر کا ہے کہ نہیں ہے یہ مسئلہ خالص تحقیق کا ہے۔ تحقیق تو ایک ایسا ضابطۂ عمل ہے جو شخص اور واقعات دونوں پر محیط ہوتا ہے جو جاری رہتا ہے۔ یہ تاریخ میں وسعت کے ساتھ رونما ہوتا ہے اور ادب کا بھی اس سے سابقہ پڑتا ہے کہ جو واقعات پے در پے رونما ہو رہے ہیں اُن کا صحیح صحیح حساب رکھنا، اُنھیں مرتب کرنا اور پیش کرنا۔ یہ تحقیق کی اولین ذمّے داری ہے۔ تحقیق کو اس سے کوئی مطلب نہیں، کوئی تعلق نہیں، کوئی ناول اچھا ہے یا بُرا۔ یہ ناول کس نے اور کب لکھا؟ اس عہد کی تاریخی حیثیت کیا تھی؟ اسے پیش کرنا تحقیق کی ذمہ داری ہے۔

س: تحقیق پر یہ الزام عاید کیا جاتا ہے کہ اس صنف میں عرق ریزی اور صبر آزمائی تو ہوتی ہے لیکن کشادگی اور وسعت نہیں۔ یعنی اس صنف میں پھیل کر سوچنے اور بے تکلف اظہار اور اعتراف و انکار کی گنجایش نہیں کے برابر ہوتی ہے۔ کیا یہ دُرست ہے؟

ج: ۔دُرست ہے، بالکل دُرست ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو تحقیق اپنے رُتبے سے بہت گر جائے گی۔ تحقیق کو اس سے کوئی دل چسپی نہیں کہ کس چیز کے تعین میں کتنا وقت لگے گا۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہوتی ہے اور دیکھیے میں اس بات کو مانتا ہوں کہ حقائق سب کے سب ایک وقت میں ہمارے سامنے نہیں آتے ۔رفتہ رفتہ حقائق سے پردہ اُٹھتا ہے۔ تحقیق کی صبر آزمائی یہ ہے کہ وہ اس نکتے سے واقف ہوتی ہے اور کسی حقیقت کو آخری حقیقت نہیں سمجھتی ۔ایک ناول منظرِ عام پر آیا۔ تضاد کے لیے وہ ناول اُس وقت کی، اُس شخص کی جس نے ناول تخلیق کیا، آخری حقیقت ہے۔ تخلیق کے لیے نہیں ہے۔ تحقیق تو چوں کہ سچائیوں کا علم حاصل کرنا چاہتی ہے اور اس کو معلوم ہے کہ سچائیاں بہت آہستگی کے ساتھ سامنے آتی ہیں ۔خاص وقتوں کے بعد طویل وقتوں کے بعد سچائیاں تہہ بہ تہہ کھُلتی ہیں۔ یہ عمل بالکل الگ ہے اور تنقیدی نقطۂ نظر کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ نقاد صاحبان اس کو پوری طرح سے سمجھ نہیں سکتے ۔اب ہوتا کیا ہے کہ جب تحقیق اپنے دائرے کے اندر فیصلہ کرتی کرتی ہے اور وہ کسی شخص کے کام پر اس بات کی نفی کر دیتی ہے کہ یہ جو لکھا گیا اس شخص کا ہے ہی نہیں، جس سے منسوب ہے۔ اس غلط طریقے سے منسوب کر دیا گیا ہے تو پھر جو انسانی مزاج ہے وہ ایک ردِ عمل کی شکل میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے اور نقاد بھی جو باتیں اس سے منسوب کر کے لکھتا ہے وہ غلط قرار پاتی ہیں۔ لہٰذا ایک تقرار کی صورت پیدا ہوتی ہے اور وہاں یہ سارے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

س: اُردو تحقیق میں سائنٹفک ڈھنگ سے کام کرنے کا رواج بھی عام نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو میں ایسے کئی اہم کام نہیں کیے جاسکتے جو دوسری مقبول زبانوں میں ہوتے رہے ہیں؟

ج: دیکھیے پہلی بات تو یہ ہے کہ تحقیق کا کام یہ نہیں ہے کہ کس لائبریری میں کتنی کتابیں ہیں اس کی فہرست سازی کرے، یہ کام لائبریریوں کے مالکان یا اپنی اپنی سطح پر ہمارا آپ کا ہے۔ لہٰذا میں ایک چیز چاہتا ہوں کہ میں بہت دنوں سے غالباً پندرہ بیس برسوں سے سودا کے قصائد کا ایک مکمل مجموعہ ترتیب دینا چاہتا ہوں کہ وہ ہر جگہ پڑھائے جاتے ہیں۔ لیکن کلام سودا کے جو نسخے ہیں اور جو دنیا کی سیر کر کے ان سب کو

دیکھ سکوں۔لہٰذا میرا مطالبہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک مرکز ایسا قائم کیا جائے جہاں ہمارے ہم نسخوں کی فوٹو کاپیاں جمع ہوں تو یہ بھی کام کرنے والا چاہے وہاں جا کر چیزوں کو حاصل کرلے۔لہٰذا اس مجبوری کے پیشِ نظر میں سودا کا کام آج تک نہیں کرسکا اور آیندہ بھی نہیں کر پاؤں گا۔چوں کہ ان نسخوں سے استفادہ میرے بس کی بات نہیں جو باہر کی لائبریریوں میں موجود ہیں تو جہاں تک یہ مسئلہ ہے کہ دنیا کی تمام لائبریروں میں ہندوستان کے قدیم مخطوطات کی بڑی تعداد ہے، تو اُن کے سامنے رکھے بغیر کوئی بھی معتبر TEXT مرتب نہیں کیا جاسکتا۔قاعدے کے ساتھ تو تمام چیزوں تک پہنچنا شاید ہزاروں میں ایک دو کو ہی حاصل ہو،اس لیے میں چاہتا ہوں...اچھا سب لائبریریوں میں فہرستیں موجود ہیں۔ہم یہاں بیٹھے بیٹھے بتا سکتے ہیں کہ کون کون سی کتاب کس لائبریری میں ہے۔لیکن اس کتاب تک پہنچ نہیں سکتے۔لہٰذا ہمارا مسئلہ کتاب کی فہرست سازی نہیں، بل کہ اس کتاب تک پہنچا ہے۔یہ اُس وقت ممکن ہے جب ہر کتاب کا فوٹو اسٹیٹ کسی ایک مرکز پر موجود ہو۔اسی لیے اُردو میں بہت سے اہم کام چاہتے ہوئے بھی نہیں کیے جاسکتے۔

س: آپ کے نزدیک ایک اچھے محقق کو کس قسم کی زبان استعمال کرنا چاہیے۔قاضی صاحب بلاشبہ بہت بڑے محقق ہیں لیکن انھوں نے جو زبان استعمال کی ہے اُسے عام طور پر پسند نہیں کیا جاتا۔کیوں کہ وہ بے انتہا کھردری اور ناہموار ہے؟

ج: دیکھیے قاضی صاحب کے یہاں لفظی کفایت شعاری بہت زیادہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سارے لوگ انھیں پڑھتے وقت اُلجھتے ہیں۔وہ جس طرح کی علامتیں استعمال کرتے ہیں، وہ بھی اُلجھنوں میں ڈالتی ہیں کیوں کہ قاضی صاحب ایک صفحے میں جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ عام طور پر لوگ بیس صفحات میں کہتے ہیں۔میں قاضی صاحب کا بہت احترام کرتا ہوں اور اُنھیں اپنا معنوی اُستاد بھی تصور کرتا ہوں۔میں نے اخذ نتائج کا ہُنر تو قاضی صاحب سے ہی سیکھا۔تحقیق کا طریقۂ کار کیا ہونا چاہیے یہ بات بھی میں نے قاضی صاحب سے ہی سیکھی۔اُن کی گفتگو سے،اُن کی تحریروں سے، میں نے بڑے استفادے کیے۔ماخذ کو کیسے دیکھا جائے،حقائق کو کیسے سمجھا جائے،ان سب سے بڑھ کر یہ کہ سچ بولنے پر کتنا اصرار کیا جائے۔یہ سب میں نے اُنھی سے سیکھا،لیکن قاضی صاحب کا جو اسلوب ہے، جو اندازِ بیان ہے،اس کو میں نے اختیار نہیں کیا۔پہلی بات تو یہ کہ وہ میرے بس کی بات نہیں تھی،اتنا علم اگر

میرے پاس بھی ہوتا تو شاید میں بھی استعمال کرتا۔ دوسری بات یہ کہ ایمان داری سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ قاضی صاحب کو جو اندازِ تحریر رہا ہے، وہ اُلجھن میں بہت مبتلا کرتا ہے۔ اُن کے اندازِ تحقیق نے بنیادی حیثیت سے بہت شہرت پائی۔ ان کی وجہ سے تحقیق بہت مشہور ہوئی۔ ہم سب اس کو مانتے ہیں۔ لیکن اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ان کے اندازِ نگارش سے تحقیقی انداز نگارش نے شہرت نہیں پائی۔ (تحقیق) جیسا کہ تنقید کا مسئلہ ہے کہ تنقید میں ایک تو مرصع زبان ہے۔ جو عام طور پر لکھی جاتی ہے۔ ایک تنقید کی اپنی زبان ہے، صفات سے خالی صاف اور دوٹوک، براہ راست۔ جو کسی طرح کی اُلجھن پیدا نہیں کرتی۔ یہی مسئلہ تحقیق کا ہے۔ تحقیق میں حافظ محمود خاں شیرانی جن کو میں اُردو کا پہلا محقق تسلیم کرتا ہوں۔ جس کا ذکر میں نے کیا بھی تھا۔ اس کے بعد مولانا عرشی یا ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ان لوگوں کی زبان تحقیق کی معیاری زبان ہے۔ ہم لوگ اس زبان کی تقلید بھی کرتے ہیں۔ اس میں اختصار پسندی اتنی نہیں ہے کہ جو ذہن کو اُلجھا دے، اس لیے میں قاضی صاحب کی زبان کو بہت معیاری تو تصور تو کرتا ہوں لیکن بہت صاف سُتھری نہیں۔ ایک بات اور، تنقید میں کلیم الدین سے بہت اختلاف کیا گیا۔ میری تو کلیم الدین کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے، باوجود اس کے میں اُن کے نظریات سے اختلاف رکھتا ہوں لیکن کلیم الدین نے جو زبان لکھی ہے وہ تنقید کی سچی زبان ہے۔ ایچ پیچ سے الگ، صاف بالکل براہ راست اس طرح تحقیق میں ادا کئی لوگوں کی زبان ہے لیکن یہ سچ ہے کہ قاضی صاحب کی زبان نے فروغ نہیں پایا۔ مجھ جیسا نیاز مند بھی ان کی تقلید نہیں کر سکا۔ شیرانی صاحب، عرشی صاحب اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ان دونوں کی زبان اور اسلوب کی میں تقلید کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

س: خاں صاحب ابھی کچھ دیر قبل آپ کلاسیکی فارسی کا ذکر کر رہے تھے۔ میں اس سلسلے میں چند نکات پر آپ کی رہنمائی کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی طالب علم Ph.D ایسے موضوع پر کرنا چاہتا ہو جس کے تمام مواد اور مخطوطات فارسی بالخصوص کلاسیکل فارسی میں موجود ہوں۔ لیکن طالب علم کی دشواری یہ ہو کہ وہ اچھی فارسی سے واقفیت نہ رکھتا ہو تو کیا اس کے سپروائزر کی فارسی شناسی کیا حیثیت رکھتی ہے؟

ج: آپ کا سوال دو حصوں میں ہے۔ پہلے حصے کا جواب یہ ہے کہ طالب علم جو اچھی فارسی نہیں جانتا وہ کسی ایسے موضوع پر تحقیق کرنا چاہتا ہے جس کے سارے مسالے فارسی میں موجود ہیں تو ظاہر سی بات ہے کہ وہ اس کام کو بالکل نہیں کر سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ تحقیق کو موضوع منظور کرنا، یہ سپروائزر کا کام

ہے۔تو اگر طالب علم نے ناتجربہ کاری کی بنیاد پر غلط موضوع کا انتخاب کرلیا ہےتو یہ ذمے داری اُس کی نہیں ہے غلطی اُس سپروائزر کی ہے۔

یہ بات طے ہو جانی چاہیے کہ جو طالب علم فارسی نہیں جانتا اُسے ایسا موضوعِ تحقیق کے لیے نہیں دیا جائے جس کے لیے اُس کا فارسی اور اچھی فارسی جاننا لازمی ہو۔یہ اساتذہ کا مسئلہ ہے،صدر شعبہ کا مسئلہ ہے۔یہ طالب علم کا مسئلہ نہیں ہے۔طالب علم تو دراصل مارا جاتا ہےاور جہاں تک سپروائزر کی فارسی دانی کا سوال ہےتو یہ ایک ایسا المیہ ہے جو افسوس کا مقام رکھتا ہے کہ آج کل یونی ورسٹیوں کے بیش تر اساتذہ اچھی فارسی تو کیا عام بول چال والی فارسی بھی نہیں جانتے۔لہٰذا اگر کوئی ایسا کام کسی صورت ہو بھی جاتا ہےتو وہ کام بہت گھٹیا ہوتا ہے۔بہت سے کام اس لیے خراب ہوتے ہیں کہ سپروائزر ہی نہیں بل کہ وہ لوگ جو تھیس کو جانچتے ہیں،جو لوگ اس پر اپنی رپورٹ صادر فرماتے ہیں وہ بھی فارسی سے اتنا واقف نہیں ہوتے جتنا ہونا چاہیے اس مقالے کو جانچنے والے کے لیے یہ تو بڑا مسئلہ ہے۔آپ اس وقت جائزہ لیجیے گا تو ہندوستان کی جو یونی ورسٹیاں ہیں اور جن میں اُردو شعبے ہیں،ان شعبوں میں کتنے آدمی اب ایسے رہ گئے ہیں فارسی ادب کو تو چھوڑیے اُردو کے کلاسیک ادب کو پورے بسیط کے ساتھ سمجھ سکیں۔میرا خیال ہے آپ ایسے معدودے چند لوگوں کو انگلیوں پر ہی گن لیں گے اس صورتِ حال کے پیشِ نظر کیا کوئی طالب علم ان موضوعات پر کام کرے گا۔جن کے متعلق اس کے اساتذہ بھی کوئی خاص علم نہیں رکھتے۔

دیکھو میاں!اس وقت ایک وبا چلی ہے،ایک آندھی چلی ہے کہ جب سے یو۔جی۔سی نے لازم کیا ہے کہ تحقیق کو ملازمت کے لیے تو زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانا طالب علم اور اساتذہ حضرات کا شعار ہو گیا ہےاور یو۔جی۔سی کے اسی قانون کا نتیجہ ہے،میرے ذاتی علم میں ایسے کئی لوگ ہیں کہ طالب علم اُن کے گھر رہا اور وہ خود اُن کے متعلق بولتے گئے،طالب علم لکھتا گیا اور تھیس تیار ہو گئی یا اسکالر نے ایک سوال نامہ تیار کیا۔وہ جس پر تحقیق کرنا چاہتا ہےاس کے پاس بھیجا اور کچھ اِدھر اُدھر لوگوں کے پاس سوال نامے بھیجے گئے۔اُن کے جو جوابات حاصل ہوئے اُنھی کو مرتب کر دیا گیا،تھیس تیار ہو گئی اور کام ہو گیا۔اصل میں کسی زندہ شخص کو موضوعِ تحقیق بنانا تحقیق کو ایک طرح سے بے حُرمت کرنا ہےاور اس بات کا اعلان کرنا ہے کہ ہمارے جتنے کام ہونے تھے سابقہ موضوعات پر وہ سب ہو چکے۔حالاں کہ کوئی

کام نہیں ہوا۔

ہم نے غالب صدی منائی۔خوب سمینار منعقد کرا لیے۔لیکن آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ غالب کا کوئی بھی فارسی کلیات شائع نہیں کرا سکے۔دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کمیاب ہے۔اس کا دوسرا ایڈیشن شائع نہیں کرا سکے۔جو بہت ضروری ہے۔سودا کا کلیات آج تک نہیں چھپا تو جو کام ہونے تھے وہ نہیں ہو سکے تو پھر آخر زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانے کا کیا جواز ہے۔میں لوگوں سے بار بار پوچھتا ہوں۔ایک بات اور کسی کی زندگی میں کوئی سچ نہیں بول سکتا۔چوں کہ اُسے رہنا ہے اسی معاشرے میں۔یورپ کا معاشرہ تھوڑا الگ ہے۔ہمارا تہذیبی معاشرہ یہ ہے کہ ہم کسی کو ناخوش کرنا نہیں چاہتے۔اور اس پر مہر لگی ہوئی ہے کہ آپ کسی کے خلاف مت بولیے تو جب ہم سچ بول نہیں سکتے تو سچ کو دریافت بھی نہیں کر سکتے۔تحقیق تو سچ کو دوسرا نام ہے۔تو یہ اسی لیے ہوا ہے کہ فارسی نہ جاننے سے کلاسیکی ادب کے موضوعات تو ہٹ گئے۔موضوعات محدود ہو گئے۔تنگ ہو گئے۔اب Ph.D تو کرنا ہے کیوں کہ نوکری چاہیے۔تو لوگوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ آسان سے آسان کام کو اُٹھایا جائے اور اسے نپٹا دیا جائے۔اسی راستے سے زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانے کی وبا ہمارے یہاں عام ہوئی۔

س: ابھی جواز کی بات آپ نے کی خاں صاحب۔زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانے کے سلسلے میں تو ممکن ہے کہ یہ جواز بھی اُن کے پاس ہو جو لوگ زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی ادیب و شاعر کی زندگی میں کام کرنے سے اس کے متعلق سارے حقائق سامنے آ جائیں تا کہ وہ ادیب و شاعر بھی ان کے سچ اور جھوٹ ہونے کی نشان دہی کر سکے؟

ج: پہلے مجھے آپ ایک بات کا جواب دیجیے کہ انسانی زندگی ایک اکائی یا کئی اکائیوں کا مجموعہ...

س: ظاہر ہے ایک اکائی ہے۔

ج: تو کیا جو شخص زندہ ہے وہ مکمل ایک اکائی ہو گیا۔کیوں کہ ابھی اس کی زندگی تو مکمل ہوئی نہیں۔ایک نا تمام اکائی کا جو بھی کام آپ کریں گے وہ خود نا تمام ہوگا۔اس لیے کوئی جواز ہی نہیں ہے زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانے کا کیوں کہ زندگی جب تک آخری نقطۂ سفر کو طے نہ کر لے وہاں تک نہ پہنچ جائے تب تک اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔۔ذہنی سطح پر نظریات بدلتے رہتے ہیں۔تبدیلی کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا تو پھر ایک ایسی زندگی جو مکمل ہی نہیں ہے۔آپ اس کے متعلق کوئی حتمی دعوا نہیں کر سکتے کہ

صاحب فلاں شخص فلاں نظریے کا مبلغ ہے۔لہٰذا کوئی جواز نہیں بنتا۔

ایک بات اور،ہم آپ جس معاشرے میں رہتے ہیں۔اس میں فائدے کا تصور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔اب اگر آپ ایک فہرست بنائیں اُن لوگوں کی جن کو پندرہ بیس سالوں میں موضوعِ تحقیق بنے ہیں،اُن میں سے بیش تر وہیں جو سماجی سطح پر کسی نہ کسی لحاظ سے بااختیار ہیں۔اُن کے پاس ایسے عہدے ہیں جن سے وہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔تو ہم کسی زندہ شخص کو موضوعِ تحقیق اس لیے نہیں بناتے کہ وہ موضوعِ تحقیق بننے کا اہل ہے،بل کہ اس کے لیے بناتے ہیں کہ اس سے ہمارا کتنا فائدہ ہوتا ہے۔

پھر دوسری بات یہ دیکھیے جو اس سے بھی زیادہ ہنسی کی بات ہے کہ وہ لوگ جن کی سماجی حیثیت تو بہت بلند ہے لیکن ادبی قد بہت چھوٹا ہے اور ہم سبھی جانتے ہیں کہ ان پر دس بارہ برسوں میں چار یونی ورسٹیوں میں مختلف طالب علموں سے Ph.D یا ایم فل کے مقالے لکھوائے گئے اور لکھوائے جارہے ہیں تو کیا صورتِ حال ہوگی تحقیق میں ہمارے ادب کی۔آپ اندازہ لگائیے۔میں تو کہنا چاہتا ہوں کہ ایک شخص جس کی زندگی کی پوری اکائی مکمل نہیں ہوئی،اب اس کی سماجی حیثیت تو ہے لیکن ادبی قد چھوٹا ہے ۔اسے ایک وقت میں دو چار طالب علم الگ الگ یونی ورسٹیوں میں موضوعِ تحقیق بنائیں تو یہ کیا جواز رکھتا ہے اور خواجہ میر درد،انشاء جرأت پر کام کرنے کے لیے ایک بھی طالب علم سامنے نہ آئے،اس کی وجہ کیا ہے؟

س: خاں صاحب چوں کہ یونی ورسٹی کی تحقیق پر بات چل نکلی اور جیسا کہ آپ اپنا اعتراض بھی درج کر رہے ہیں زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانے پر تو چوں کہ آپ خود ایک معتبر اُستاد رہ چکے ہیں۔میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس کام کی اجازت بھی تو ایک اُستاد ہی دیتا ہے؟

ج: دیکھو بھائی!جب تک یو جی سی کی یہ شرط رہے گی کہ جس نے Ph.D کیا ہے،وہی نوکری میں اولیت پائے گا تب تک اس صورتِ حال کو بدل نہیں سکتے۔اور اگر اساتذہ کو نوکری کرنی ہے اور انھیں اگر کوئی تحقیق کرنے والا نہ ملا تو اُن کی اپنی ترقی رُک جائے گی یہ شعبہ بند ہونے کا امکان پیدا ہو جائے گا تو کس طرح کی صورتِ حال سامنے آئے گی۔تو یہ مسئلہ ایسا اُلجھا ہوا ہے چوں کہ ایک حمام میں جتنے ہیں وہ سب ویسے ہی ہیں جیسا کہ لوگ حمام میں ہوتے ہیں۔اس لیے ایک بغیر کہا سُنا معاہدہ ہے ذہنی سطح پر کہ اس

طرح کے کام ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

اس سلسلے میں بڑی ہنسی کی بات یہ ہے کہ جو اکسپرٹ کی رپورٹ ہوتی ہے، اس پر طالب علم کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تو ایوارڈ کی جائے گی لیکن اس مقالے کو چھاپنے کی اجازت نہیں ہے۔ یعنی یہ مقالہ چھپ نہیں سکتا۔ تو اگر کوئی تحقیقی مقالہ اس قابل ہے کہ اس پر ڈگری تو دی جا سکتی ہے لیکن چھاپا نہیں جا سکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہزار خامیاں موجود ہیں۔ تو پھر اس مقالے کو جو خامی کی وجہ سے چھپ نہیں سکتا اسے ڈگری کے لائق کیسے سمجھا گیا۔ تو اس طرح کے جو قاعدے قانون ہم نے بنا لیے ہیں یا بنوا لیے ہیں اپنی آسانی کے لیے یو جی سی کو بھی انھیں ختم کرنا چاہیے۔

یہ ہنسی کی بات ہے کہ ایک طالب علم تین چار سال محنت کر کے کسی موضوع پر مقالہ لکھے، اسے ڈگری تو دی جائے، لیکن مقالہ چھاپنے کی اجازت نہ دی جائے، کیوں کہ اس کے منظرِ عام پر آنے سے ساری دھناندلیوں کے سامنے آنے کا خطرہ رہتا ہے۔ ہمارے یہاں ایمان داری کا تصور بہت دھندلا گیا ہے۔ میاں! علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو میں اُردو کے نو درجۂ اول کے پروفیسر ہیں، جن کے مقالے اور مضامین اس میں شامل کیے گئے تو ان حضرات کے یہاں بھی کیا ایمان داری کا تصور روشن تھا وہ لوگ ایسے مضامین لکھیں جس میں ایک شخص کا قول دوسرے شخص کے قول کی نفی کرتا ہو۔ ایک شخص دو لوگوں کے مضامین میں دو تاریخوں میں مرا ہے۔

یہ وہی مسئلہ ہے کہ ہم دنیا کے دھندوں میں اتنا الجھے ہیں کہ ہمارے اچھے اُستاد کی پہچان یہ ہے کہ وہ بہت سی کمیٹیوں کا ممبر ہوگا، صدر ہوگا، میرا دعوا ہے کہ وہ علمی کام نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ وہ سارا وقت تو اس میں برباد کرے گا کہ کون سی میٹنگ کب ہے اور اس میں کیا بولنا ہے۔ تو ہمارے یہاں تحقیق میں پیر توڑ کر بیٹھنے کی جو اصطلاح ہے، مثلاً ہمارے عرشی صاحب رضا لائبریری رام پور میں تھے تو وہ اس کمرے سے باہر نکلتے ہی نہیں، قاضی صاحب بیرسٹر ہو کر آئے، کچہری نہیں گئے۔ صبح سے شام تک خدا بخش لائبریری میں بیٹھے رہتے، کہیں اور جاتے ہی نہیں تھے۔ تو یہ جو پیر توڑ کر بیٹھنے کی اصطلاح ہے پُرانی۔ اب یہ ختم ہو گئی ہے، وہ سب کے سب مفاد پرستی کی دین ہے اور یہ علم کی دشمن ہے اور یہ صورتِ حال جس رفتار سے سامنے آ رہی ہے، وہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تحقیق اپنے اصل معیار و منصب کو شاید اب نہیں پا سکے گی۔

س: خاں صاحب! ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ایک ہی شخصیت پر ایک ہی وقت میں کئی کئی یونی ورسٹیوں میں تحقیقی مقالے لکھے جاتے ہیں اور ان پر ڈگریاں بھی دی جاتی ہیں۔

ج: اس سلسلے میں ایک بات میں نے یہ عرض کی تھی شروع میں کہ تحقیق کے لیے علم ثانوی چیز ہے اور ذہنی مناسبت پہلی چیز۔ اگر دس طالب علم اُمیدوار ہیں Ph.D کے تو یہ طے کرنا اُستادِ محترم کا فرض ہے کہ ان میں کتنے طالب علم ایسے ہیں جو واقعی تحقیق سے ذہنی مناسبت رکھتے ہیں اور جو تحقیق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تحقیقی عمل اور اُس کے کچھ تحقیقی کاموں کو دیکھ کر اُسے تحقیق میں داخلہ ملنا چاہیے اور اگر یہ بھیڑیا دھسان طریقے سے جو اُمیدوار ہیں سب کو داخلہ ملے گا۔ پھر چاہے نئے لوگوں پر کام ہو یا پُرانے لوگوں پر سب کا سب گھٹیا اور بے فائدہ ہوگا اور موضوعات کی تکرار بھی ہوتی رہے گی۔ لہٰذا اُستاد کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اس بات کا علم رکھے کہ کن کن موضوعات پر کام ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں ہاں ایک ہی موضوع پر الگ الگ زاویے سے کی گنجایش بچتی ہے۔

س: خاں صاحب! اب ہم لوگ تحقیق و تدوین کے مسائل پر آپ سے کچھ رہنمائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تدوینِ متن کو عام طور پر آسان کام سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں آپ کے کارناموں کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام بہت مشکل ہے۔ آپ کی نظر میں عام طور پر شائع شدہ متون کے کم معیار ہونے کی کیا وجوہات ہیں؟

ج: جو کلاسیکل متن ہیں، دو چار کو چھوڑ دیجیے تو باقی سب کے سب تدوین کی راہ دیکھتے ہیں۔ جب تک کوئی TEXT اصولِ تدوین کے مطابق مرتب نہ کر لیا جائے اس کا متن قابلِ اعتبار نہیں ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ کلاسیکی ادب کی فرہنگ کی دو جلدیں مرتب کرنا پہلا دور ہے۔ ایہام گو شعرا کا میں خود وہ کام اس لیے اب تک شروع نہیں کر سکا کہ کسی ایہام شاعر کا دیوان اصولِ تدوین کے مطابق EDIT ہی نہیں ہوا۔ میں تو ایک مصرعے کا حوالہ بھی نہیں دے سکتا کیوں کہ مجھے نہیں معلوم کہ یہ جو مصرع میں نقل کر رہا ہوں اس کا متن صحیح ہے یا صحیح نہیں ہے۔ کون سا شعر یا کون سا مصرع صحیح ہے، یہ تو اسی وقت معلوم ہوگا جب TEXT کو EDIT کیا جائے گا TEXT کو EDIT کرنا بہت مشکل کام ہے۔ مثلاً آپ کو عربی آنی چاہیے، فارسی سے اچھی خاصی واقفیت ہونی چاہیے اور اس عہد کی زبان سے جن پر آپ کام کر رہے ہیں واقفیت ہونی چاہیے۔ مثلاً دو سال تین سو سال پہلے جو قواعد زبان تھی مشرقی شعریات سے آگاہی علم بلاغت سے آگاہی۔ ان سب صلاحیتوں کا ہونا تدوین کے لیے شرطِ اول ہے۔ اس کے بعد صحیح قرأت کے

تعین کی صلاحیت۔اب یہ سب چیزیں ختم ہو چکی ہیں۔ان پر اگر آپ اصرار کریں تو کہا جائے گا کہ اُن کے ذہن کو زنگ لگ گیا ہے۔تو صاحب یہ کوئی کام ہونے نہیں دینا چاہیے۔لیکن سچ یہ ہے کہ ان صلاحیتوں کے بغیر کوئی شخص تدوینِ متن کا کام کر ہی نہیں سکتا۔انشاء کتنے بڑے شاعر ہیں۔ان کے یہاں لفظیات کی گہرائیوں سے واقفیت نہ ہو تب تک ہم کیسے تدوین کا کام کر سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آج تک کلیاتِ نظیر کا کوئی تحقیقی ایڈیشن شائع نہیں ہو سکا۔کیسے معلوم ہو کہ نظیر کا یہ مصرع اس طرح صحیح ہے۔تو تدوین کا کام اس اعتبار سے بہت مشکل ہے کہ اس کے لیے کئی چیزوں سے واقفیت لازم ہے جو اب کمیاب ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تدوین بہت زیادہ طاقت کا مطالبہ کرتی ہے۔تدوین میں کوئی کام جلدی نہیں ہو سکتا۔لیکن ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں اس کی تیز رفتاری نے ہمارے ذہنوں کو اتنا متاثر کیا ہے کہ ہم ان کاموں کو چھوڑنا چاہتے ہیں جن میں وقت زیادہ لگتا ہے۔غالب کا ایک بے مثال شعر ہے، شعر یوں ہے۔

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

تو ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں تیز رفتاری ہر سطح پر عام ہے اور مشکل یہ ہے کہ تدوین کو تیز رفتاری راس نہیں آسکتی۔اس لیے تدوین کا حق ادا ہونا مشکل اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے جتنے بھی TEXT ہیں وہ سب تدوین کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

س: تو خاں صاحب جیسا کہ آپ فرما رہے ہیں ہمارے بہت سے TEXT ابھی مرتب نہیں ہوئے تو ایک مدون کو تدوین کے وقت کافی دشواریوں کا سامنا ہوتا ہوگا؟

ج: ہر شخص کا وجود اور اس کا ذاتی نظریہ دوسرے شخص سے الگ ہوتا ہے۔اسی طرح ہر مخطوطے کے مسائل دوسرے مخطوطے کے مسائل سے مختلف ہوتے ہیں۔آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ کس مخطوطے کی تدوین کے دوران کن مسائل سے سابقہ پڑے گا۔اصل مسئلہ اس کا نہیں ہے۔اصل مسئلہ یہ ہے کہ کسی متن کو EDIT کرنے کے لیے جن بنیادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، اس آدمی کے اندر وہ ہے کہ نہیں۔آدمی یہ جانتا ہو، یہ جانتا ہو، یہ جانتا ہو، بنیادی حیثیت یہ نہیں ہے۔اگر وہ جانتا ہے تو ہر طرح کے متن پر قابو پایا جا سکتا ہے۔میں نے میر امّن کے باغ و بہار کو مرتب کیا جس کو جدید اُردو نثر کی پہلی کتاب کہا جاتا ہے۔میں نے جعفر زٹلّی کی کلیات کو EDIT کیا جو شمالی ہندوستان میں دورِ اوّل کی اُردو زبان ہے اور میں نے گلزارِ نسیم کو EDIT کیا جس میں بہت بڑا معرکہ اس کے ٹکسٹ پر ہے۔یہ تین کام بالکل مختلف سطح پر تھے۔تینوں کے مسائل بھی الگ الگ

تھے۔لیکن طریقۂ کار ایک تھا۔دیکھیے تدوین میں بنیادی حیثیت طریقۂ کار کی ہے،ان صلاحیتوں کی ہے جومدون میں ہونی چاہئیں۔اگر یہ سب چیزیں ہیں تو وہ متن کے مسائل کوحل کرلے گا کیوں کہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہےاور اگر وہ ان صلاحیتوں کا مالک نہیں ہےتو اس کے لیے ایک قدم بڑھنا آسان نہ ہوگا۔

س: خاں صاحب جیسا کہ بات ہورہی ہے کہ کلاسیکل متن کومرتب کرنے والے آج کمیاب ہیں تو کیا جن کاموں کوآپ ابھی بتارہے ہیں،اُن کا مستقبل میں ہوپانا ممکن ہے؟

ج: بھئی! آپ اس مشکل کواس اس طرح دیکھیے کہ میں کئی بارلکھ چکاہوں اور زبانی کہہ چکاہوں کہ میں دکنی ادب پر نہ گفتگو کرسکتا ہوں نہ اس کے متعلق رائے ظاہر کرسکتا ہوں، نہ اس پر کوئی کام کرسکتا ہوں۔کیوں کہ میں دکنی زبان سے ناواقف ہوں۔میں دکنی ادب کوصحیح طور پر پڑھ بھی نہیں سکتا۔میری ساری عمر تدوین میں گزر گئی۔اس کے بعد میں یہ کہہ رہا ہوں۔مجھے نہیں معلوم کہ ہندوستان میں اس وقت کتنے لوگ ہیں جو دکنی زبان جانتے ہیں۔تو اگر کوئی شخص دکنی زبان نہیں جانتا،اتنی جتنی جاننا چاہیے۔دکنی ادب EDIT کرنے کے لیے وہ بھی موجودنہیں بل کہ قدیم دکنی ادب تو وہ مخطوطہ تو بڑی چیز ہے،چارسطریں بھی EDIT نہیں کرسکتا۔میں نہیں کرسکتا۔کیوں کہ میں دکنی زبان نہیں جانتا۔میں اگر جانتا ہوتا تو ضرور دکنی ادب کے کسی نہ کسی مخطوطے کو EDIT کرتا۔لیکن چوں کہ میں بنیادی شرط کو پورا نہیں کرتا،اس لیے بھی اس طرح کا کام نہ کیا ہے،نہ کرنے کی کوشش کروں گا۔اب باقی کام مستقبل میں ہوپائیں گے یا نہیں،نہ میں اس سلسلے میں کوئی قیاس کرسکتا ہوں نہ دعوا۔

س: معتبر اور غیر معتبر کلام کا تعین کرتے وقت ایک مدون کوکن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟

ج: پہلی بات تو یہ ہے کہ جس شاعر سے متعلق تدوین کرنے کا ارادہ ہواور جواس کا کلام ہولہٰذا تدوین کرنے والے کو پہلا علم تو یہ ہونا چاہیے کہ شاعر کے کلام کے کتنے نسخے ہیں اور وہ کہاں کہاں ہیں؟ ان میں کتنے نسخے عام ہیں اور کتنے نادر؟ مدون کو پہلے اس کے پیچھے لگ کر ان کویکجا کرنا چاہیے۔دوسری بات یہ ہے کہ جس عہد کا نسخہ ہے،کلام کرنے والا اس عہد کی لفظیات سے واقف ہواور اس عہد کی زبان سے اچھی واقفیت رکھتا ہو۔اگر یہ دو بنیادی شرائط پوری نہیں ہوتیں تو اس کا کام صحیح طور پر نہیں ہوسکتا۔اس میں ایک بڑی مشکل آتی ہے کہ اُن لفظوں کے تعین میں جو ہماری عام لغات میں نہیں ملتے،اُن کو کیسے لکھے،اُن کا صحیح املا اور تلفظ کیا ہو؟ اُن کا صحیح معنوی پس منظر کیا ہو؟ مان لیجیے کوئی لفظ کبھی استعمال میں تھا

لیکن اب سابقہ سو پچاس برس سے استعمال میں نہیں ہے تو اُسے کس طرح مرتب کیا جائے ؟ لہٰذا یہاں پر شعور کا بڑا دخل ہوتا ہے کہ تدوین کرنے والا قدیم و جدید دونوں زبانوں کا مطالعہ رکھتا ہو۔ میں یہ بات پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جو شخص ڈھائی تین سو سال پیچھے کی زبان سے، اُس کی لفظیات سے، اُس کی قرأت سے اور اس کے جتنے ترکیبی معاملات ہیں تدوین کرنے والے کو اُن سب چیزوں سے واقفیت ہونی چاہیے اگر مدون کا شعور ان سب شرطوں کو پورا کرتا ہے تو گویا اُس نے پہلا مرحلہ حل کر لیا۔ کچھ لفظیات جن کے بارے میں کہیں کوئی معلومات فراہم نہ ہو ان کے لیے وہ قیاس کو راہنما بنا کر رائے قائم کر سکتا ہے۔ لیکن حاشیے پر اُس کی وضاحت اور اقرار ضروری ہے۔ اگر اُس نے نہیں کیا تو یہ بھی عجیب ہے۔

س: تحقیق میں اور تدوین میں کس کی ذمے داری پہلے ہے؟

ج: بنیادی چیز پہلے تو تحقیق ہے جب تحقیق یہ معلومات فراہم کر دے کہ کسی تخلیق کار کی تخلیق کتنی ہے۔ وہ کتنی جلدوں پر مشتمل ہے اور کہاں ہے اور اس کا کلام کتنی بار چھپا ہے۔ تحقیق اگر ان باتوں کا تعین پہلے نہ کرے تو تدوین کا کام ہو ہی نہیں سکتا۔ کیوں کہ مدون جس شاعر یا ادیب پر کام کرنا چاہتا ہے۔ اُسے تحقیق کے ذریعے یہ سب چیزیں فراہم ہونی چاہئیں۔ اس لیے تحقیق کی ذمے داری تدوین سے پہلے شروع ہوتی ہے۔

س: آپ کا زور اس بات پر ہے کہ تحقیق اور تدوین دو مختلف دائرے ہیں جب کہ گیان چند جین صاحب تدوین کو تحقیق کا اور تحقیق کو تدوین کا ایک ذیلی شعبہ قرار دیتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: دیکھیے میں بنیادی طور پر یہ نہیں مانتا۔ کیوں کہ ان کے اپنے اپنے دائرے ہیں جو کسی دوسرے دائرے کو کاٹتے نہیں اس میں داخل نہیں ہو سکتے تو وہ ایک دوسرے کے ذیلی شعبے کیسے ہو سکتے ہیں؟ میں نے ابھی بتایا کہ تحقیق کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ کسی شخص یا تخلیق کے متعلق پورے پورے حادثات و واقعات کو من و عن درج کر دے اور تدوین کے فرائض بھی میں نے بتائے۔ تو میری ان باتوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ میں تدوین کو تحقیق کو بل کہ تنقید کو بھی الگ الگ دائرہ کار مانتا ہوں۔ ان سب کا آپس میں باہمی رشتہ ضرور ہے لیکن ذمے داریاں سب کی الگ الگ ہیں۔ یہ تینوں تین مختلف شعبے اور تین مستقل دائرے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی دائرہ کسی دوسرے دائرے کو کاٹتا نہیں۔ یہ ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ لیکن ان کے مماثل نہیں۔ ممکن ہے ایک ہی شخص کے اندر یہ تینوں صلاحیتیں تین الگ الگ لوگوں کا

حصہ ہوں۔ یہ تو ذہنی مناسبت پر منحصر ہے کہ کس کی دل چسپی کس میں ہے۔ قاضی عبدالودود ہیں۔ جن کو ہم بہت بڑا محقق مانتے ہیں لیکن انھوں نے تدوین کا ایک بھی کام نہیں کیا۔ بنیادی طور پر جو شخص حقائق کا تعین صحیح صحیح کر دے وہ محقق اور جو متن کی صحت کو جانچنے پر کھنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ مدون۔ ضروری نہیں کہ جو شخص متن کے الفاظ اور اس کے سارے متعلقات پر گہری نظر رکھے وہ تحقیق کے کاموں کو بھی اچھی طرح انجام دے سکے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ تحقیق اور تدوین الگ۔ الگ دائرۂ کار ہیں۔

س: خاں صاحب، آپ نے ایک مضمون اُردو تدوین کے پچاس سال، میں جو تفصیلی جائزہ لیا ہے اس میں پاکستان کی کسی تدوین کا ذکر نہیں کیا۔ کیا آپ پاکستان میں ہونے والے تدوین کے کاموں سے مطمئن نہیں ہیں؟

ج: مطمئن ہونے کا سوال تو تب اُٹھتا ہے جب میں وہاں کے کاموں سے واقف ہوں گا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں پاکستان میں ہونے والے تدوین کے کاموں سے کوئی واقفیت ہی نہیں رکھتا۔ کتابوں کی فراہمی اب آسانی سے ہوتی ہے۔ لیکن پہلے تو یہ بہت مشکل مسئلہ تھا۔ بیچ میں غالباً پندرہ سال سے نہ وہاں سے کوئی کتاب یا کاغذ آ سکتا تھا نہ کوئی کاغذ جا سکتا تھا۔ پاکستان میں اس طرح کے کتنے کام ہوئے ہیں میں اس سے واقف نہیں ہوں لہٰذا میں اس پر اپنی کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔

س: اُردو زبان اور املا کے سب سے بڑے رمز شناس کی حیثیت سے آپ پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کا یہ اصرار رہتا ہے کہ الفاظ کو اس کی اصل شکل میں لکھا جائے جب کہ اس کے برعکس کچھ الفاظ ایسے ہیں جن کا املا اور تلفظ وقت کے ساتھ ہوتا گیا جس کا ذکر کبھی آپ نے کیا بھی ہے۔ جن الفاظ کا غلط املا اور تلفظ بھی خاص و عام میں پوری طرح مقبول ہو گیا۔ ایسی صورت میں ایک صاحبِ زبان کیا کرے؟

ج: (جی نہیں! کوئی قسم نہیں ہے!) دیکھیے! تلفظ اور املا دو چیزیں ایسی ہیں کہ جو تغیر پذیر ہیں۔ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ جیسے آدمی کی صورت کم بدلتی ہے لیکن اس کے اطوار زیادہ بدلتے ہیں۔ وہی تلفظ اور املا کا مسئلہ ہے۔ ہر مُلک اور زبان میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو علاقائی اعتبار سے زبان کو توڑتے مروڑتے ہیں اور یہ اُن کا حق بھی ہے کہ انھیں جن الفاظ کو جس طرح بولنے میں آسانی ہو بولیں لیکن میری گزارش یہ ہے کہ لکھتے وقت آپ انھیں صحیح لکھیں۔ اس لیے تلفظ میں تبدیلیاں زیادہ ہوتی ہیں اور املے میں تبدیلی کا امکان کم ہوتا ہے۔ املا بھی تبدیل ہوتا ہے۔ جب کوئی لغت نویس اسے اسی

طرح لکھ دے جس طرح کہ وہ لفظ عام طور پر رائج ہے۔اور یہی ہوا قدیم لفظیات کے ساتھ کہ اُنھیں لغت مرتب کرتے وقت اس طرح لکھ دیا گیا جیسا کہ وہ بولنے میں رائج تھےاور اس طرح کا عمل کوئی بہت بڑا مجرمانہ عمل بھی نہیں ہے کہ قابلِ معافی نہ ہو لیکن ہم اگر بہ حیثیت مدون لفظ کے بنیادی املے سے واقفیت رکھتے ہیں تو ہمیں اپنی تدوین میں اسے اسی شکل وصورت میں لکھنا چاہیے جیسا کہ وہ اصل میں تھا۔ہاں! ہم یہ طے کر سکتے ہیں کہ حاشیے پر اس کے جدید املے کا اندراج کر دیں تا کہ آسانی ہو جائے ۔دوسری بات یہ ہے کہ تبدیلی تلفظ میں ہو یا املے میں، اس کے اندر اپنے آپ کو مستحکم کر لینے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔اسی شکل میں وہ قابلِ قبول ہوگی۔

س: جو الفاظ مذکر اور مونث کے جھگڑے میں پڑ جائیں، ان کے ساتھ کیا کیا جائے؟

ج: ایسی صورت میں ہمیں معتبر اور مستند لغات کا سہارا لینا چاہیے۔کیوں کہ بہت الفاظ ایسے ہیں جو مشترک الفاظ ہیں۔یعنی مونث اور مذکر دونوں طرح سے رائج ہیں اور ہم لوگ انھیں دونوں طرح صحیح جانتے ہیں۔اب یہ علاقائی نوعیت پر بھی منحصر ہے کہ کہاں کون سا لفظ کس طرح رائج ہے۔یہ بولنے والے کا اپنا مسئلہ ہوتا ہے۔ہاں اس سلسلے میں ہم ایک کام یہ کر سکتے ہیں کہ اس طرح کے تمام الفاظ کو جمع کر کے اس کا تعین کر دیں کہ کون سا لفظ کس طرح دُرست ہے۔

س: آپ کی نظر میں تحقیق اور تدوین کی موجودہ صورتِ حال کس حد تک اطمینان بخش ہے۔ہندوستان اور پاکستان میں یونی ورسٹیوں اور یونی ورسٹیوں کے باہر ایسے کتنے لوگ ہیں جن کے کاموں کو آپ اعتبار کی نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: بھائی! جیسا کہ میں عرض کیا کہ پاکستان کے احوال سے تو میں واقف نہیں ہوں۔ہاں، یہاں کے بارے میں کچھ جان کاری رکھتا ہوں۔یہاں کے حالات کے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ تحقیق اور تدوین کا کام نہ صرف کم ہو رہا ہے بل کہ اس کا گراف برابر نیچے کی طرف آ رہا ہے۔معتبر کام کرنے والے دن بہ دن کم ہوتے جا رہے ہیں۔نئے لوگوں میں ایک دو ہی نام ایسے ہیں جن سے کسی حد تک اطمینان ہے اور جو کچھ کام کر رہے۔میں نام لیے بغیر اپنی بات جاری رکھتا ہوں کہ جہاں تک میری نا تمام واقفیت ہے تو نئے نام نہیں آ پا رہے ہیں، یہ پریشانی اور افسوس کا مقام ہے۔

س: آیندہ کام کے لیے کون سے منصوبے آپ کی نظر میں ہیں؟

ج: دو۔تین منصوبے ہیں۔میرا پہلا منصوبہ تھا کہ قصائد سودا کا ایک مجموعہ ترتیب دوں۔لیکن جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بھی کہا کہ کلامِ سودا کے سب نسخے میرے سامنے نہیں ہیں اس لیے اس کام کو فی الحال چھوڑ دیا لیکن سارے نسخے اگر مجھے مل سکے تو میں یہ کام ضرور کروں گا۔دوسرا یہ کلاسیکی ادب کی فرہنگ (پہلی

جلد)(افسوس؛اس آخری سوال کا مکمل جواب ریکارڈ نہیں ہو سکا۔ ع ہ)

(رسالہ جامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، جلد نمبر :104، شمارہ 4۔5۔6، اپریل تا جون، 2007، صفحہ 25 تا 48)

☆☆☆

مذاکرہ

اُردو زبان میں تحقیق کی اہمیت اور موجودہ صورتِ حال

شخصیت: رشید حسن خاں

شرکائے گفتگو: ڈاکٹر معین الرحمٰن/ سجاد باقر رضوی/ جیلانی کامران/ مسعود اشعر/ اکرام چغتائی/ ذوالفقار تابش

محمد اکرام چغتائی: آج ہمارے درمیان بھارت کے معروف محقق رشید حسن خاں موجود ہیں۔ میں آپ دوستوں کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ ان سے اُردو قواعد اور زبان و املا اور ادبی تحقیق کے حوالے سے سوالات کریں۔

سجاد باقر رضوی: آپ نے اُردو املا کے سلسلے میں جو آسانیاں پیدا کی ہیں ان کے محرکات کیا تھے؟ کیا اس کے پیچھے آپ کا اپنا پس منظر تھا؟

کشور ناھید: سب سے پہلے میں اس کا بھی اضافہ کرلیں کہ جس طرح انگریزی زبان کے املا اور قواعد کے بارے میں کتابیں موجود ہیں، ہمارے ہاں یہ روایت ہی نہیں تھی کہ اُردو املا کے بارے میں کوئی باقاعدہ منضبط یا سائنٹیفک طریقے سے سوچا جائے تو کیا آپ کی یہ سوچ اس تسلسل میں ہے۔

رشید حسن خاں: سب سے پہلے میں اس کی وضاحت کردوں کہ میں نے کسی املا کو آسان نہیں کیا۔ املا جیسا ہوتا ہے ویسا ہی رہا کرتا ہے۔ میں نے یہ کہیں نہیں کہا کہ ''بالکل'' کو الف کے بغیر لکھیے بل کہ میں نے اصرار کیا ہے کہ ''بالکل'' کو ویسا ہی لکھیے جیسا لکھا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ عبدالعزیز کو ''الف'' ''ل'' کے ساتھ لکھیے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ میں نے کتاب کیوں لکھی؟ میں نے لکھنے پڑھنے کا آغاز ابتدائی درسِ نظامی کی حاصل کی ہے یعنی مدرسہ میں باقاعدہ عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ عربی تعلیم میں ایک خاص بات یہ ہے کہ مدرسوں میں دو سال تک گرامر پڑھائی جاتی ہے۔ اس وقت تو اس کی افادیت محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن اب یہ پتا چلا کیوں کہ اس سے ذہن میں عبارت اور لفظوں کو ناپنے کا پیمانہ بن جاتا ہے۔

چوں کہ پس منظر عربی کا تھا اس لیے میرا پہلا انتخاب لُغت قواعد اور عروض تھا۔ حسنِ اتفاق سے سب سے پہلے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا املا پر سلسلہ مضامین میری نظر سے گزرا تھا۔ صدیقی صاحب کے مضامین پڑھے تو پتا چلا کہ اُردو میں اس پر کام ہی نہیں ہوا ہے۔ اُردو والوں کی تن آسانی نے اسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا! کیوں کہ اُردو والے بیش تر شاعری کرتے آئے ہیں۔ شعری مزاج ہے، شعری سائنٹیفک مزاج نہیں ہے (اور ہمارے ہاں تو اسی مزاج نے تنقید کو بھی انشائیہ بنا دیا ہے)۔ اب میں نے مطالعہ شروع کیا۔ یہ بات ہے 1960 کی میں نے املا کے موضوع پر مطالعہ شروع کیا اور جو کچھ اُردو میں اس وقت لکھا گیا تھا اسے پڑھا۔ اُردو کے مختلف مطبعوں کی چھپی ہوئی کتابیں یکجا کیں اور ان کو دیکھا کہ صورتِ حال کیا ہے تو معلوم ہوا کہ لفظ ہی نہیں بل کہ علامتیں تک مختلف ہیں۔ چناں چہ محسوس ہوا کہ اس موضوع پر کام کرنا چاہیے۔ تب کام کرنے بیٹھا جو 1973 میں مکمل ہوا یعنی تیرہ سال صرف ہوئے۔

میں نے صرف یہ کیا ہے کہ املا کی معیار بندی کی ہے۔ اس سے پہلے میں ایک اور بات بتا دوں۔ 1952 میں ہمارے شہر میں اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول میں اُردو عربی اور فارسی کے اُستاد کی آسامی خالی ہوئی۔ میں نے درخواست دے دی اور منتخب ہو گیا۔ لیکن جب میں کلاس میں پڑھانے کھڑا ہوا اور بلیک بورڈ پر ''لیے'' لکھا تو ایک لڑکا کتاب لے آیا اور کہا اس میں تو ہمزہ کے ساتھ ''لیے'' لکھا ہے۔ اس طرح کے کئی واقعات ہوئے میں حیران ہوتا تھا کہ کیا کروں۔ مثلاً ایک لفظ ہے ''اژدہام'' اور کتابوں میں چھوڑیے ''فرہنگِ آصفیہ'' میں یہ لفظ چار طرح سے لکھا ہوا ہے یا مثلاً ''گزرنا''۔ آپ کو یہ لفظ کہیں ''ز'' سے ملے گا اور کہیں ''ذ'' سے۔ میں کہتا ہوں کہ کسی زبان کے لیے یہ بات باعثِ فخر نہیں ہے کہ اس میں معمولی الفاظ کا املا متعین نہ ہو۔ لسانیات میں غلط کوئی چیز نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک لفظ کو تین طرح سے لکھا گیا ہے یا بولا گیا ہے تو کسی کو غلط نہیں کہیں گے۔ نہ تلفظ کو نہ اس کے املا کو۔ کیوں کہ جو چیز استعمال میں آ جاتی ہے وہ غلط ہو ہی نہیں سکتی۔ ہاں علمی بحثوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان شکلوں میں مروج صورت یہ ہے۔ مثلاً ہم ہائی اسکول کا نصاب بنانے بیٹھے ہیں۔ ایک صاحب آٹھویں جماعت کا دوسرے صاحب نے نویں کا تیسرے صاحب دسویں کا نصاب بنائیں گے۔ تو یہ لازم ہوگا کہ اگر ساتویں اور آٹھویں جماعت کی کتاب میں ''گزر''، ''ذ'' سے یعنی ''گذر'' اب طلبہ ''گزر'' کس طرح لکھے!

میں پھر کہتا ہوں کہ میں نے املا کو ''سہل'' نہیں بنایا۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ ایسے لکھو۔ کتاب کے مقدمے میں بھی میں نے لکھ دیا ہے کہ اس میں کوئی نئی تجویز پیش نہیں کی گئی۔ کسی لفظ کے املا کی جو کئی

کئی شکلیں پیدا ہوگئی ہیں، ان کی نشان دہی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مرجح صورت کون سی ہے۔

املا میں اصل اصول یہ ہے کہ لفظ کو اس طرح لکھیے جس طرح بولتے ہیں۔ یہ مسلمہ اصول ہے کہ آخری حرف سے پہلے جو حرف ہے اس سے پہلے اگر ''زبر'' ہے تو ہمزہ (ء) آئے گا اور اگر زیر ہے تو ''ی'' آئے گی کیوں کہ زیر اپنے ہم جنس ہی کو چاہتا ہے اس لیے ''گئے''، ''نئے'' میں ہمزہ آئے گا۔ لیے، دیے، پیے میں ''ی'' آئے گی۔

پروفیسر جیلانی کامران: ہندوستان کی تمام زبانوں کا رسم الخط اُردو سے مختلف ہے اور اس کے لکھنے پڑھنے اور بولنے والوں کی تعداد ہندوستان کی دیگر زبانوں کے بولنے والوں کے مقابلے میں محدود ہے۔ آپ نے جس طرح کا طریق کار وضع کیا ہے اس کی وجہ کہیں عمرانی تو نہیں کہ اس پر دوسری زبانوں کا اثر نہ پڑے۔

رشید حسن خاں: اُردو رسم الخط کے سلسلے میں یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اصل میں یہ کام تقسیم سے قبل شروع ہوا تھا۔ میرے تمام کام کی بنیاد انجمن ترقی اُردو کی وہ رپورٹ ہے جو 1944 میں شائع ہوئی تھی۔ 1943 میں انجمن ترقی اُردو نے ایک کمیٹی قائم کی تھی۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اس کے سکریٹری تھے۔ اس سے سفارشات پیش کرنے کو کہا گیا تھا۔ 1944 میں یہ سفارشات انجمن کے سامنے پیش کی گئیں اور رسالہ ''اُردو'' کے ایک شمارے میں انھیں خاص طور پر شائع کیا گیا۔

پروفیسر جیلانی کامران: زبانوں کی تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان میں انتشار دراصل لوگوں کے تہذیبی پس منظر اور ان تہذیبوں کے استحصال کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر زبانیں کسی ایسے ماحول میں داخل کی جائیں یا پروان چڑھیں جن میں بہت سے دوسرے متبادل یا ایسے رسم الخط اور ایسا املا ہو جن کا ان کی تاریخ کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو تو پھر مصوتے اور مقاصد بدل جاتے ہیں، جیسا کہ آپ نے کہا کہ جس طرح الفاظ بولے جائیں ویسے ہی لکھے جائیں یعنی املا بھی درست ہے اور تلفظ بھی۔ میں سمجھتا ہوں یہ ایک نہایت مفید رویہ ہے۔ مجھے تو یہ ساری باتیں یوں لگتی ہیں کہ اُردو بولنے والے یا اُردو کے مدّاحین اُردو کے لیے ایک نئی زمانی سمت تلاش کر رہے ہیں اور عدمِ اطمینان کی کیفیتیں دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟

رشید حسن خاں: کیا یہ سارے حالات 1947 کے بعد پیدا ہوئے ہیں جن کی طرف آپ

اشارہ کر رہے ہیں؟

پروفیسر جیلانی کامران: 1947 سے پہلے ہمارے حکمراں اور تھے۔ لہٰذا 1940 کا برٹش انڈیا مختلف تھا۔ 1947 سے پہلے ہندی والے بھی ہماری طرح تھے۔ 1947 کے بعد میں جو بھی صورتِ حال پیدا ہوئی ہے میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس وقت جو کام کر رہے ہیں وہ نہایت مستحسن ہے۔

رشید حسن خاں: اصل میں اُردو املا کا سب سے پہلا کام تو مولانا احسن مارہروی نے شروع کیا تھا۔ جب 1905 میں انھوں نے اصولِ املا کے بارے میں کہا تھا کہ ''دلکش' میں ''دل'' الگ لکھو اور ''کش'' کو الگ لکھو (وغیرہ)۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اُردو املا کے مسائل پر ہمارے اساتذہ نے اس وقت توجہ کی ہے جب وہ سوالات ہی پیدا نہیں ہوئے تھے جن کے نتیجے میں آپ یہ بات کہہ رہے ہیں۔

ذوالفقار احمد تابش: یہ ضرورتیں صرف ایک ملک سے تعلق نہیں رکھتیں۔ ہمارے ہاں بھی ظاہر ہے کہ جب صحیح متنوں TEXTS پر کتابیں ترتیب دینے کی کوشش کی گئی تو یہ مسائل ہمارے سامنے بھی آئے۔ مثال کے طور پر انجمن ترقی اُردو کراچی نے جب مطبوعات کا سلسلہ شروع کیا تو ان کے پاس پہلے سے طے شدہ طریقِ کار تھا اس کی پابندی کی گئی۔ اس طرح ہمارے ہاں جب مجلس ترقی ادب لاہور کی بنیاد رکھی گئی اور مرحوم تاج صاحب نے اس کے لیے لوگوں کو اکٹھا کیا تو یہاں بھی یہ سوال پیدا ہوا کہ پرانی کتابوں (کلاسیکی کتابوں) کو چھاپیں گے تو ان کے متنوں میں جو فرق ہے، خاص طور املا کا اور علامات کا تو اس کے لیے ہم کیا کریں گے۔ چناں چہ یہاں بھی ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی اور انھوں نے املا اور علامات کے لیے باقاعدہ قواعد وضوابط وضع کر کے انھیں ایک رسالے کی شکل میں چھاپ دیا تھا۔

اکرام چغتائی: آپ کی کتاب اُردو املا کا پہلا ایڈیشن 1974 میں چھپا۔ اس کے بعد سے یہ کتاب دو سال سے انجمن ترقی اُردو کے رسالے میں قسط وار چھپ رہی ہے۔ پہلے اڈیشن اور دوسرے اڈیشن میں دس سال کا وقفہ آتا ہے۔ کیا دوسرے اڈیشن میں کچھ اضافے بھی کیے گئے ہیں؟

رشید حسن خاں: انجمن ترقی اُردو کے پرچے میں جو مضامین قسط وار چھپ رہے ہیں، اُن میں ایک تو ترتیب کی تبدیلی ہے بعض مباحث پہلے آ گئے ہیں اور بعض بعد میں لیکن اصل مباحث میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہاں میں نے مثالیں بڑھا دی ہیں اور آخر میں الفاظ کا جو گوشوارہ تیار کیا تھا اسے دوگنا بل کہ تین گنا کر دیا ہے تا کہ جس لفظ کا املا دیکھنا مقصود ہو، اس میں دیکھ لیا جائے۔

میں اپنی کتاب کے بارے میں یہ بھی وضاحت کر دوں کہ اس کے بارے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے بیش تر اسے مکمل طور پر پڑھے بغیر لکھا گیا ہے اور یہ سب تحریریں میری نظر سے گزری بھی ہیں۔ میں نے ان سے نوٹس بھی لیے کہ شاید میرے کسی کام آسکیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان میں کوئی بھی ایسا مثبت پہلو مجھے نہیں ملا کہ میں اپنی رائے میں کوئی تبدیلی لا سکتا۔

ڈاکٹر معین الرحمن: 1955 کے بعد ''آج کل'' کا جو تحقیق نمبر اس میں ایک بڑا اہم مضمون تھا ''اُردو تحقیق کے چار اساطیر'' اور آج ہم 1987 میں اسے یاد کرتے ہیں تو ہمیں اس محرومی کا احساس ہوتا ہے کہ ان چاروں میں سے تین سے ہم محروم ہو چکے ہیں۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ادبی تحقیق کے جو عملی یا نظری مسائل ہیں آپ کے علاوہ کوئی اور بزرگ بھی ہیں جو اس طرح سوچ رہے ہیں؟

رشید حسن خاں: میں تحقیق کے مستقبل کی طرف سے خاصا نا اُمید ہوتا جا رہا ہوں۔ اس کی تین وجوہ ہیں پہلی وجہ تو یہ ہے کہ تحقیقی مزاج کے لیے جس تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جس بنیادی تعلیم کی ضرورت تھی اور جس کی بنیاد پر ہمارے محققین نے درجہ شرحاصل کیا تھا وہ گویا ختم ہوتی جا رہی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ احساسِ زیاں جاتا رہا ہے اور تیسری وجہ ہے کہ میں نے قاضی صاحب اور عرشی صاحب اور صدیقی صاحب کو دیکھا ہے۔ تینوں محققین بڑے درویش صفت تھے۔ 1950 کے بعد اور پھر 1960 کے بعد جو ایک سماجی سطح پر تبدیلی آئی ہے تو اس کے نتیجے میں پیش تر میینہ پڑھے لکھے لوگ ہوس کا شکار ہو گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس سب کچھ ہو۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ بازار میں سب کچھ بکتا ہے، ملتا ہے، لیکن علم نہیں بکتا۔

ایک اور بنیادی مسئلہ ہے جس کے بارے میں بارہا کہہ چکا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ علم، تحقیق کے لیے ثانوی حیثیت رکھتا ہے صرف علم ضروری ہوتا تو ہمارے محققین بھی بہت ہوتے کیوں کہ عالم تو بہت گزرے ہیں محققین ہیں بس تین چار۔ بنیادی چیز ہے طبعی مناسبت۔ اگر طبعی مناسبت نہیں، تو علم بے کار ہے۔ انسان میں صبر و تحمل اور قوتِ برداشت ہو اور دنیا کو حاصل کرنے کا جذبہ کم ہو۔ لکھنؤ کی ڈیرے دار طوائفیں گانا سب کو سنا دیتی تھیں لیکن جنسی وابستگی صرف ایک سے رکھتی تھیں۔ ہمارے بہت سے اساتذہ اور ناقدین کا کردار تو ڈیرے دار طوائف کے برابر بھی نہیں رہا ہے۔ کیوں کہ ان کی وفاداری سب کے ساتھ ہمارے پاس سب کچھ ہو گھر ہو، کار ہو اور ایک گروپ ہو اور دنیا کی آرائش کی اور سب چیزیں ہوں اس نے ہمیں اس چیز سے محروم کر دیا ہے کہ جو چٹائی پر بیٹھ کر آنکھوں کا تیل ٹپکا کر کام کرنے پر مجبور کرتی تھی۔

ہم سے اکثر نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے، لکھنا اختیار کر لیا ہے اور لکھنے کے لیے تعینِ وقت کے ساتھ ٹائم ٹیبل بنالیا ہے کہ اتنے دن میں ایک کتاب مکمل کرنا ہے چوں کہ صفحات کے لحاظ سے معاوضہ ملے گا اس لیے اتنے صفحے ضرور لکھنا ہیں۔ اس صورتِ حال نے تحقیق کو تباہ کر دیا ہے اور اس سے زیادہ تباہ کُن صورتِ حال یہ ہے کہ اب چوں کہ تحقیق تو پناہ گزینوں کی طرح یونی ورسٹیوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئی ہے اس لیے پی ایچ ڈی کا نام تحقیق ہو گیا ہے اور مثلاً میرؔ کے ایک دیوان کا متن مرتب کرنا میرؔ کے حالاتِ زندگی پر بحث کرنا ہے، تو اس کے لیے آپ کو لائبریریوں کو کھنگالنا ہوگا لہٰذا آسان طریقہ یہ ہے کہ زندہ شخصیتوں کو موضوعِ تحقیق بنایا جائے، یعنی ہم خرما ہم ثواب۔ محقق کو یہ آسانی کہ ٹیپ ریکارڈر ساتھ لیا، اس سے انٹرویو کیا، اس کے محلے والوں سے، گھر والوں سے پوچھ لیا اور بس تحقیق ہو گئی۔ جب کہ ہم تحقیق میں سب سے پہلے یہ پڑھاتے ہیں کہ جو شخص اپنے اور اپنے خاندان کے متعلق جتنے STATEMENTS دیتا ہے وہ سب قابلِ قبول نہیں ہوتے کیوں کہ آدمی سب سے زیادہ جھوٹ اپنے متعلق یا اپنے خاندان کے متعلق بولتا ہے اب بڑے پیمانے پر کہ وہ لوگ جن پر ہم شاعر ہونے کی تہمت لگانے کے بھی گناہ گار نہیں تھے، ان کو تحقیق کا موضوع بنتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

اکرام چغتائی: پاکستان اور ہندوستان کی یونی ورسٹیوں میں تحقیق کے نام پر ہونے والے کام کے بارے میں آپ کی مجموعی رائے کیا ہے؟

رشید حسن خاں: گذشتہ دس پندرہ سال کے دوران یونی ورسٹیوں سے جو مقالے شائع ہوئے ہیں، اگر وہ پچاس ہیں تو شاید ایک دو اس قابل ہوں کہ تحقیق کی تعریف ان پر درست آتی ہو۔

اکرام چغتائی: آپ نے ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' میں کچھ کتابوں پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ کچھ اور کتابوں پر بھی مزید تبصرہ آپ نے کیا کیا ہے یا نہیں؟

رشید حسن خاں: نہیں۔ میں گذشتہ کئی سال سے ''باغ و بہار'' میں اتنا الجھا ہوا ہوں کہ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں کوئی اور کام نہیں کروں گا۔

کشور ناہید: چالیس سال کے دوران ہمارے ہاں اُردو پر علاقائی زبانوں کا اور آپ کے ہاں اُردو پر ہندی زبان کے اثرات پڑے ہیں۔ ایک تو یہ زمین کی ضرورت تھی اور دوسرے اُردو نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے ان اثرات کو قبول کرنا اس کے خاصے میں شامل ہے۔ کیا آپ نے یہ ضرورت محسوس

نہیں کی کہ اس قسم کی اُردو پر بھی تحقیق کی جائے۔

رشید حسن خاں: آپ نے جو کچھ کہا یہ بڑا اہم کام ہے،لوگوں کو اس طرف آنا چاہیے۔ میں معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ آسان پسندی علم اور تحقیق کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ یہ نئے راستے سمجھاتی ہے اور ایسے سمجھاتی ہے کہ آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔

کشور ناہید: لوگوں نے تو امیر خسرو کا دیوان تک دریافت کرلیا ہے۔

رشید حسن خاں: وہ تو منشی نول پریس نے بھی خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کا دیوان دریافت کرلیا تھا اور سو برس تک چھاپتے رہے شیرانی صاحب نے بتایا کہ یہ ان کا دیوان نہیں ہے۔

امیر خسرو والا مسئلہ یہ ہے کہ ایک نیا رجحان شروع ہوا ہے اور اب اُردو کا رشتہ محمد تغلق کے زمانے سے جوڑا جا رہا ہے اور یہ کہا جا رہا ہے کہ ریختے کی اصل شکل اس زمانے میں بنی تھی۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ تغلق اور خلجی کے زمانے میں ریختہ اگر اُردو میں آگیا تھا اور اُردو لکھی جانے لگی تھی تب تو سارے نظریے بدل جاتے ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ سب سے پہلے آدمی امیر خسرو ہیں کہ انھوں نے ریختے بھی لکھے اور پہیلیاں بھی لکھیں۔ اس کے لیے کچہری کے جھوٹے گواہ کی طرح ہر سہارا لینے کی تیاری کی جا رہی ہے۔ جب کہ تحقیق کے مطابق کسی ایک سطر کا ثبوت موجود نہیں ہے۔ آج کے دن تک کوئی شخص ایسا ایک ثبوت بھی پیش نہیں کرسکا ہے کہ کوئی ایک پہیلی یا کہہ مکرنی امیر خسرو کی ہے۔ امیر خسرو کا پہلا دوہا ''سب رس'' میں ہے۔ مولوی سید احمد دہلوی نے ''فرہنگ آصفیہ'' کے دیباچے میں امیر خسرو کی بیسوں پہیلیاں دے دی ہیں۔ مولوی صاحب ہمارے زمانے کے آدمی، ان کا انتقال 1925 میں ہوا۔ ہمارے معلوم ہے کہ مولوی صاحب نے نبی ہونے کا دعوا نہیں کیا۔ کبھی یہ نہیں کہا کہ ان پر وحی آتی ہے اور یہ بھی نہیں کہا کہ انھیں الہام ہوتا ہے یا خواب میں انھیں بشارت ہوگئی کہ یہ پہیلیاں امیر خسرو کی ہیں لہٰذا جب تک اس سوال کا جواب نہیں دیا جائے گا، ہم اس وقت کوئی چیز امیر خسرو سے منسوب تسلیم نہیں کریں گے۔

تحقیق میں ثبوت اور سند کے کچھ اصول مقرر ہیں روایت مسلسل ہو اور راوی معتبر ہو۔ اگر راوی معتبر نہ ہو مثلاً نواب نصیر حسین خیال کی ایک کتاب ''مغل اور اُردو'' شائع ہوئی جس میں لکھا ہے کہ زیب النساء نے یہ شعر کہے، نور جہاں نے یہ شعر کہے۔ سب نے کہا کہ ضرور کہے ہوں گے لیکن انھیں ملے کہاں سے؟ جب کوئی شخص کہتا ہے کہ یہ شعر میرؔ کا ہے، یہ غزل غالبؔ کی ہے یا یہ دیوان فلاں شاعر کا ہے تو ہم پہلے یہ سوال کرتے ہیں کہ یہ کہاں ملا؟

پروفیسر جیلانی کامران: غالبؔ اور میرؔ تو ایک دوسرے کے قریب کے شاعر ہیں۔امیر خسرو کو کس طرح متعین کریں گے؟

رشید حسن خاں: امیر خسرو کے زمانے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور امیر خسرو کے بعد سے تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر چلا آ رہا ہے۔کوئی ایک شخص تین سو برس تک کسی کتاب میں یہ نہیں لکھتا کہ خسرو نے ہندوی کا یہ شعر کہا ہے۔امیر خسرو نے خود لکھا ہے کہ میں نے ہندوی کے شعر کہے ہیں۔ہندوی اصطلاح لفظ ہے جو ہندوستان کی ہر مقامی زبان کے لیے استعمال ہوتا تھا۔کیوں کہ وہ ہندی تو عالمِ وجود میں آئی نہیں تھی جسے ''کھڑی بولی'' کہا جاتا ہے لیکن یہ بھی امیر خسرو نے ہی لکھا کہ میں نے ہندوی کے جو شعر کہے،وہ دوستوں کی نذر کر دیے۔امیر خسرو نے ہندوی میں شعر کہے تھے،ہم اسے مانتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ انھوں نے اپنے دوستوں میں تقسیم کر دیے تھے لیکن اب وہ کہاں ہیں؟ ہمیں معلوم نہیں اگر کسی کو معلوم ہیں تو ہمیں بتائے اور سند ثبوت پیش کرے۔جو قابل قبول بھی ہو۔

جیلانی کامران: وہ چیزیں جب فوک FOLK میں چلی گئیں تو...

رشید حسن خاں: یہ کیسے معلوم ہوا کہ فوک میں چلی گئیں؟

جیلانی کامران: عام طور پر یہ ہی کہا جاتا ہے۔

رشید حسن خاں: تحقیق میں ''عام طور سے'' بحث نہیں ہوتی چھے سو سال کا فاصلہ ہے۔میں عرض کروں کہ میر امن نے ''باغ و بہار'' کے دیباچے میں یہ لکھا ہے کہ جب حضرت نظام الدین اولیاء بیمار ہوئے تو امیر خسرو تیمار داری میں انھیں یہ قصہ سُنایا کرتے تھے یہ روایت ہوئی اگر ماننے والے ہوتے تو اسے بھی مان لیتے۔اس میں کیا بُرائی ہے۔اگر مولوی سید احمد دہلوی کے لکھے ہوئے کا ماننا ہے تو پھر اس کو ماننے میں کیا بُرائی ہے۔میر امن تو اس سے پہلے کہہ گئے ہیں۔لیکن ہم نے میر امن کی روایت کو نہیں مانا۔شیرانی صاحب نے سب سے پہلے اس کو بے بنیاد بتایا۔

اکرام چغتائی: آپ نے ہندوی کا لفظ استعمال کیا ہے تو کیا یہ اس علاقے کی زبان سمجھی جائے گی جہاں وہ شخص رہتا تھا۔کیوں کہ مسعود سلمان نے تو یہ کہا ہے کہ ان کے دیوان تین زبانوں میں تھے۔فارسی میں اور ایک بہ زبانِ ہندوی اور مسعود سلمان تو لاہور میں رہتے تھے اور شاعری کرتے تھے،تو کیا ہندوی سے مراد پنجابی زبان لی جائے یا کوئی اور زبان؟

رشید حسن خاں: اس زمانے میں شاہی فوجیں سفر کیا کرتی تھیں اور لوگ ان کے ساتھ ساتھ سفر

کرتے تھے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ جس خاص وقت میں وہ لفظ استعمال کر رہے ہیں اس وقت وہ کس علاقے میں تھے۔ مسعود سلمان کے لیے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بیش تر یہاں (لاہور میں) رہے ہیں تو اس علاقے کی زبان مراد ہو لیکن باقی کسی کے لیے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہندوی کا لفظ ہر مقامی زبان کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

ذوالفقار احمد تابش: ابھی آپ نے کہا کہ تحقیق دونوں طرف زوال پذیر ہوئی ہے۔ اس سے پہلے ہمیں لاہور میں شیرانی صاحب نظر آتے ہیں۔ آپ کے ہاں بھی دو تین نام لیے جا سکتے ہیں۔ ذاتی اداروں کی سطح پر تحقیق کا جو تھوڑا بہت کام ہوا ہے اس سے آپ نے بھی بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے۔ میں پچاس اور ساٹھ کی دہائی کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ پچاس کا سنہ اس لیے بھی اہم ہے کہ چند سال قبل تقسیم کا عمل ہوتا ہے۔ دو ملک بنتے ہیں لوگ نئی سماجی، سیاسی، علمی و ادبی صورت حال سے دو چار ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے نصاب مقرر ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے طریقِ کار وضع کیے جاتے ہیں گویا بالکل نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اب اگر ہم تخلیقی سطح پر دیکھیں تو وہاں بھی شاعری کی سطح پر اور باقی دیگر سرگرمیوں میں بھی بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ادب کی نئی بنیادیں رکھنے کے لیے کہیں تخلیقی سطحوں کی طرف زیادہ توجہ تو نہیں ہوگئی۔ یعنی ہمارے لکھنے والوں کی توجہ تخلیقی امور کی طرف زیادہ ہوگئی اور جوڑ توڑ چھوڑ یا جن تبدیلیوں کا آپ نے ذکر کیا ہے ان کا تحقیق پر براہ راست تو اثر نہیں پڑا؟

رشید حسن خاں: یہ سوال بڑا اہم، معنی خیز اور دل چسپ ہے۔ وہ بات جو میں بھول گیا تھا آپ نے یاد دلا دی۔ تخلیق اور تحقیق دو مختلف راستے ہیں، جو کہیں آ کر نہیں ملتے۔ میں اگر چاہوں تو لفظ جمع کر کے شعر بنا سکتا ہوں لیکن شعر کہہ نہیں سکتا، کیوں کہ تخلیق کا عمل بڑا مختلف عمل ہے جو اندرون سے تعلق رکھتا ہے، خارج سے نہیں۔ جب کہ تحقیق خالص اکتسابی اور خارجی عمل ہے جو شخص تخلیقی صلاحیت نہیں رکھتا، وہ کتنا ہی بڑا محقق ہو، تحقیق کرے یا نہ کرے، تخلیق تو کر ہی نہیں سکتا اور جو شخص تخلیق کار ہے، وہ کتنا ہی سر پیٹ لے، تحقیق کا کام نہیں کر سکتا۔ ہوا یہ کہ آہستہ آہستہ 1947 کا جو حادثہ ہوا ہے، اس نے حدِ اصل کھینچ دی ہے وہاں سے یہ چیزیں شروع ہوئیں ہوں یا نہ ہوئی ہوں، لیکن وہ ان کے شروع ہونے کی تمہید بن گیا ہے۔ اس طرح وہ پورے نظام کے بدلنے کی بھی تمہید بنا ہے۔ نظام کے بدلنے نے صورتِ حال کو بدل دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنیادی تعلیم ختم ہوگئی۔ اب یہ بات کہ مزاجی مناسبت، تو پہلے ہی کم تھی۔ 1920 سے لے کر 1938 تک ایک اکیلے شیرانی صاحب کھڑے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب

چیزیں بدلی نہیں ہیں، 1947 والا عمل نہیں ہوا ہے۔ دراصل تحقیق کا کام پہلے بھی محدود دائرے میں تھا اور ہمیشہ محدود دائرے میں رہے گا اور اس میں وہی لوگ آئیں گے جن کے اندر قلندری ہوگی۔ اگر علم کے ساتھ قلندری کا جز شامل نہیں، تو کتنا ہی بڑا آدمی ہو، تحقیق نہیں کرسکتا۔ ہاں ترقی اُردو بورڈ اور مجلس ترقی ادب کی کتابیں مرتب کرسکتا ہے۔

ابھی ہمارے ہاں ہندی اصناف پر ایک سمینار ہوا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مجھے بھی شرکت کی دعوت دی۔ میں نے کبت پر ایک مضمون پڑھا۔ ''کبت'' کے بارے میں مجھے ان کتابوں کی تلاش ہوئی جن میں کبت ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ محمود مہجور لکھنوی کی کتاب ''نورتن'' میں اس پر پورا ایک باب ہے۔ اب مجھے اس کے پہلے اڈیشن کی تلاش ہوئی۔ پہلا اڈیشن نہیں ملا۔ میں نے مجلس ترقی اُردو ادب لاہور کا اڈیشن اُٹھا لیا۔ لیکن میں اس کی ایک سطر کو بھی نقل نہیں کرسکا کیوں کہ پڑھا ہی نہیں جاسکا۔ جن صاحب نے اسے مرتب کیا تھا وہ جانتے ہی نہیں کہ ''کبت'' ہوتا کیا ہے اور اس کی زبان کیا ہوتی ہے۔ یہ ایک مثال ہے ہمارے ہاں ترقی اُردو بورڈ دھڑا دھڑ کتابوں کے ترجمے چھاپ رہا ہے۔ میں آپ سے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ لوگ جن کی کتابوں کے تراجم ہو رہے ہیں اگر وہ زندہ ہوتے تو ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کردیتے۔ اسی لیے میں ہمیشہ اس پر اصرار کرتا ہوں کہ تذکروں کے ترجمے مت کیجیے کیوں کہ وہ ثانوی ماخذ ہوتے ہیں اور تحقیق ثانوی ماخذ کو قبول نہیں کرتی۔ کراچی سے شیفتہ کے تذکرے ''گلشن بے خار'' کے دو ترجمے چھپے ہیں۔ وہ اس پائے کے ہیں کہ میں کیا کہوں۔ اس پر ایک مشہور آدمی کا لکھا ہوا مقدمہ بھی ہے۔ غرض اب تک میری نظر سے ہندستان اور پاکستان میں ایسا کوئی ترجمہ نہیں گزرا جس کو اعتماد کے ساتھ استعمال کیا جاسکے۔ سب نے معاوضہ بھی لیا ہوگا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ضمیر بالکل پتھر کی مانند سادہ صاف ہے کہ معاوضہ لیتے وقت ادنا سی خلش بھی پیدا نہیں ہوتی کہ ہم جو کام کر رہے ہیں جس کا ہم نے معاوضہ لیا ہے اس کا حشر کیا ہوگا۔ ہم تحقیق کے بڑے پراجیکٹ بناتے ہیں جب تک پراجیکٹ کاغذ پر ہوتا ہے بڑا اچھا رہتا ہے لیکن جب عمل میں آتا ہے تو کچھ اور چیز ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''اخلاقیاتِ تحقیق'' ختم ہوگئی ہے۔ ضمیر سادہ ہوچکے ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمن: آپ کے ہاں سے ایک کتاب ''تاریخِ ادب اُردو'' چھپی تھی۔ ایک ''تاریخِ ادب اُردو'' ہم نے چھاپی ہے آپ کے ہاں والی تو آپ کے تبصرے پر واپس لے لی گئی۔ لیکن ہمارے ہاں والی ''تاریخِ ادب اُردو'' ابھی تک چل رہی ہے۔ کیا پاکستانی کتاب آپ کی نظر سے گزری ہے؟

رشید حسن خاں: میں نے اسے پڑھنا ضروری نہیں سمجھا۔

اکرام چغتائی: تحقیق میں جو کچھ ہو رہا ہے یا موجودہ صورتِ حال کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بڑی تشویش ناک اور حوصلہ شکن ہے۔

رشید حسن خاں: لیکن، انشاءاللہ! آپ کا اور ہمارا حوصلہ کم نہیں ہوگا۔

اکرام چغتائی: تحقیق میں جو کچھ ہو رہا ہے یا موجودہ صورتِ حال ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ ہمارے ہاں اُردو میں تحقیقی وسائل کی کمی ہے؟

رشید حسن خاں: یہ درست ہے کہ ایسا کوئی مرکز یا لائبریری نہیں کہ وہاں سے تمام دستاویزیں مل سکیں۔ بہت دن ہوئے جب ترقی اُردو بورڈ کی طرف سے کہا گیا تھا کہ ''کلیاتِ میر'' کو ایڈٹ کر دوں۔ میں نے دو شرطیں رکھیں اول یہ کہ اس کام میں دس برس لگیں گے۔ دوسری یہ کہ میں نے 35 مخطوطات کی ایک فہرست فراہم کی اور کہا کہ ہندوستان، پاکستان اور یورپ کے کتب خانوں سے ان کے فوٹو اسٹیٹ فراہم کر دیے جائیں۔ یعنی کہا گیا کہ سرکاری طور پر تو یہ کہ انتظام نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا اگر یہ نہیں ہو سکتا تو کام بھی نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان اور پاکستان کی بدنصیبی یہ ہے کہ اور تو سب کام ہو رہے ہیں۔ بڑی بڑی عمارتیں بن رہی ہیں، ادارے قائم ہو رہے ہیں لیکن ایک بھی ایسا ادارہ نہیں کہ جہاں انڈیا آفس لائبریری، برٹش میوزیم، کراچی میوزیم، پنجاب یونی ورسٹی کا شیرانی کلکشن اور ہندوستان میں رضا لائبریری اور خدا بخش لائبریری کی اہم کتابوں اور مخطوطات کی فوٹو اسٹیٹ یکجا کر دیے جائیں۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا، حقیقی اسکالر تحقیقی کا کام خاطر خواہ نہیں کر پائیں گے۔

ڈاکٹر معین الرحمن: چار سال سے آپ ''باغ و بہار'' پر کام کر رہے ہیں۔ چوبیس گھنٹے تو ''باغ و بہار'' میں الجھے نہیں رہ سکتے کوئی اور بھی تو مصروفیات ہوں گی۔ مثلاً شعر و ادب کا مطالعہ وغیرہ...

رشید حسن خاں: میں تنہائی کے لمحوں میں پہلے دن سے آج تک شاعری کو سب سے زیادہ رفیق رکھتا ہوں۔ کیوں کہ میرا خیال ہی نہیں عقیدہ بھی ہے کہ شعر محفل میں پڑھنے کی چیز نہیں، زور سے پڑھنے کی چیز نہیں۔ جب زور سے شعر پڑھا جاتا ہے تو اپنی آب و تاب آدھی کھو دیتا ہے۔ جیسے کوئی بہت اچھا گانا ہو اور ٹرانجسٹر کو بہت اونچا کر دیا جائے تو گانے کی خوبی آدھے سے زیادہ ختم ہو جاتی ہے۔ جب

میں تنہا ہوتا ہوں، پریشان ہوتا ہوں گھبرایا ہوا ہوتا ہوں تو صرف شاعری سے اپنا دل بہلاتا ہوں لیکن کسی کو سُنا تا نہیں اور اس شاعری کو پڑھتا ہوں جو پہلے میرے ذہن پر حملہ نہ کرے بل کہ میرے دل میں اُتر جائے۔ میں شاعری پڑھتا ہوں اور اس میں قدیم و جدید کی تخصیص نہیں۔ میں نئے نئے شاعروں کو بھی پڑھتا ہوں۔ فیضؔ کو اتنی بار پڑھا ہے کہ بہت سے فیضؔ پرستوں نے بھی شاید اتنی بار نہ پڑھا ہو۔

تحقیق کے سلسلے میں بھی میری کوشش ہوتی ہے کہ یہ ڈرانے کی چیز نہ ہو، پڑھنے کی چیز ہو۔ خواندگی کی صفت باقی رہے لیکن وہ بات بھی نہ ہو جس سے ہماری تنقید انشائیہ بن گئی ہے۔ وہ بات بھی نہ ہو جیسے کرشن چندر نے افسانے کی زبان کا رنگ و نور کا منارہ بنا دیا ہے۔ تحقیق اپنی حدوں میں رہے۔

کشور ناھید: جب آپ تحقیق کی بات کرتے ہیں تو آپ اک فرض بنتا ہے کہ آپ نئے آنے والوں کو جدید خطوط سے آشنا کریں اگر آپ جدید املا کا لائحہ عمل دے سکتے ہیں تو انھیں جدید تحقیق پر کام کر نے پر بھی راغب کریں۔

رشید حسن خاں: گذشتہ اٹھائیس سال سے جس سے میں یونی ورسٹی میں ہوں مرے دل میں بھی یہی حسرت ہے۔

کشور ناھید: جب آپ تحقیق کے اصول دریافت کرنے لگتے ہیں تو کتاب کے دوسو سال پُرانا ہونے کا انتظار کیوں کرتے ہیں۔ یہ طریقہ کیوں رائج نہیں کرتے کہ جب کوئی کتاب لکھی جائے، چھاپی جائے تو اس کا اصل مسودہ محفوظ کرلیا جائے۔

رشید حسن خاں: یہ کام ہمارا نہیں۔ یہ کام ہے لائبریریوں کا۔ لائبریریوں کو کرنا چاہیے۔ ہمارے ہاں خدا بخش لائبریری نے یہ کام شروع کیا ہے۔ وہ مصنفین کو خطوط لکھتے ہیں کہ مسودہ ارسال کردیں کیوں کہ مسودہ پہلا خیال ہوتا ہے۔

مسعود اشعر: ہمارے ہاں یہ کام ہمدرد لائبریری کررہی ہے۔

(ماہ نامہ کتاب نما، گوشۂ رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، مدیر شاہد علی خاں، جلد: 30، شمارہ: 8 اگست 1990، صفحہ 51 تا 59)

☆☆☆

رشید حسن خاں سے بات چیت

اطہر فاروقی

جناب رشید حسن خاں کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ نے جس موضوع پر بھی قلم اُٹھایا ہے اس پر آپ کی تحریر حرفِ آخر ثابت ہوئی ہے۔

رشید حسن خاں صاحب نے تحقیق کے جتنے بُت گرائے ہیں، غیر علمی رویے کے استرداد پر وہ جس طرح بہ ضد رہے ہیں اس کی مثال دینا دشوار ہے۔ علی گڑھ تاریخ ادبِ اُردو پر یونی ورسٹی گرانٹ کمیشن نے لاکھوں روپیا منظور کیا تھا اور جس کے ڈائرکٹر آلِ احمد سرور اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر مجنوں گورکھپوری تھے، اس تاریخِ ادب اُردو پر جب خاں صاحب کا تبصرہ شائع ہوا اور خاں صاحب نے اس میں اغلاط کی نشان دہی کی تو یو.جی.سی کو پورا پروجیکٹ ہی ملتوی کرنا پڑا اور کتاب علی گڑھ کے وائس چانسلر بدرالدین طیب جی نے بازار سے اٹھوا کر گودام میں محفوظ کرا دی۔ کروڑوں کی لاگت سے ترقی اُردو بورڈ پاکستان نے اپنے عظیم الشان لغت کی پہلی جلد جب شائع کی تو اس پر خاں صاحب کے تبصرے کے بعد اُس کے ڈائرکٹر کو اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔

رشید حسن خاں صاحب سے ہم نے جب انٹرویو لیا تو اس انٹرویو کو صرف اُردو زبان و ادب تک محدود نہیں رکھا، بل کہ ہم نے ان سے اقلیتوں اور خصوصاً آج کے اہم ترین مسئلہ فرقہ پرستی پر بھی بات چیت کی۔

س: خاں صاحب! آپ کا اصل میدان تو تحقیق ہے لیکن اکثر آپ ملّی مسائل پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں، تو سب سے پہلے میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ آپ کے خیال میں مسلمان نئے سماجی شعور سے کیا اتنے ہی بے بہرہ ہیں جتنا انھیں ہمارا قومی پریس بتاتا رہتا ہے؟

ج: مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ہمارے قومی پریس کا طرزِ عمل مسلم اقلیت کے متعلق بہت ہی منفی

ہے، وہ کوشش کرتے ہیں اس بات کی کہ مختلف صحافتی طریقوں سے، جو بہت ہی پہلودار ہوتے ہیں، اس بات کو ذہن نشیں کرایا جائے کہ مجموعی طور پر پورا مسلمان طبقہ جاہل ہے، جذباتی ہے، غیر وفادار ہے اور سیاسی شعور سے محروم ہے۔ یہ سوچی سمجھی اور منظم منصوبہ بندی ہے مقصد اس کا ہے پورے مسلم معاشرے کو اس قدر بددل کرنا اور احساسِ کمتری میں مبتلا کر دینا کہ وہ خود بھی سمجھنے لگیں کہ ہم دنیا کی ساری بُرائیوں کا آئینہ خانہ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض باتوں میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ نیا سماجی شعر اس حد تک ہمارے پاس نہیں آیا ہے جتنا آنا چاہیے۔ لیکن یہ بات کہ آیا ہی نہیں، یہ بالکل غلط ہے۔ اب آپ ایک چیز کو جا کے دیکھیے، کیا وجہ ہے کہ حکومت جن اصولوں کو خود طے کرتی ہے، مسلم اقلیت کے معاملے میں ان کو خود نظر انداز کرتی ہے۔ مثلاً حکومت نے مختلف تعلیماتی کمیشنوں کی رپورٹ کے مطابق یہ طے کر دیا کہ اچھی تعلیم مادری زبان میں ہو سکتی ہے اور اس کے لیے ہر زبان کے بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینے کا انتظام کیا، میں پوچھتا ہوں کہ اُردو بولنے والی اقلیت کے لیے کیا ہندوستان کی سب ریاستوں میں ان کی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا انتظام کیا گیا ہے؟ کہیں نہیں کیا گیا۔ انتہا یہ ہے کہ جدید تعلیمی نظامِ حکومت نے بنایا ہے، جس کے تحت پورے ہندوستان میں نو و دے اسکول قائم کیے جائیں گے۔ آپ حیرت کریں گے کہ مثلاً اتر پردیش میں ان مرکزی اسکولوں میں تمل پڑھائی جا سکتی ہے، کنڑ پڑھائی جا سکتی ہے، ملیالم پڑھائی جا سکتی ہے، گجراتی اور مراٹھی پڑھائی جا سکتی ہے، لیکن اس پورے نظامِ تعلیم میں اُردو کہیں نہیں ہے۔ اب اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! مسلمان جدید شعور سے محروم ہیں۔ جو تعلیمی نظام آپ بنا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے تحت نیا شعور پیدا ہوگا، اس سے آپ نے پوری اقلیت کو محروم رکھنے کا پورا سامان کر لیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ایک منظم سازش ہے۔ یہ معلوم ہے کہ اُردو صرف ایک زبان نہیں، ایک پوری تہذیب کی آئینہ دار ہے، اس لیے اصلی کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ ابتدائی تعلیمی سطح پر اس زبان کو اس قدر محدود کر دیا جائے کہ وہ خود بہ خود ختم ہو جائے، اور اس طرح پوری نسل اس تہذیب سے ناآشنا ہو جائے جو اس زبان سے وابستہ ہے، جب نئی نسل اپنی تہذیب سے ناآشنا اور اپنے ماضی کی شاندار روایتوں سے ناواقف ہوگی، تو اب اس کے ذہن کو بدلنا آسان ہوگا اور جن سنگھیوں کے الفاظ میں اس کا ''بھارتیہ کرن'' بہ آسانی ہو سکے گا۔ ستم یہ ہے کہ کانگریس حکومت کی افسر شاہی کا بہت بڑا حصہ اس سازش میں شریک ہے اور ہر سطح پر یہ کوشش کی جاتی

ہے کہ اس زبان کی تعلیم کو کم سے کم کیا جائے۔ہاں یونی ورسٹیوں میں ضرور باقی رہے،تا کہ ہاتھی کے دانت دکھانے کے کام آتے رہیں۔اچھا یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ کسی طبقے کی مضبوطی کی اصل وجہ اس کی معاشی حالت ہوتی ہے اول تو تجارت میں مسلمان بہت پیچھے ہیں ،یہ ان کا مزاج ہی نہیں ہے،لیکن جہاں جہاں تجارت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے،یا جہاں مسلمانوں کے مرکزی صنعتی علاقے ہیں،وہاں آپ دیکھیں گے کہ مختلف وقفوں کے بعد فرقہ وارانہ فساد ہوتے رہتے ہیں اور تباہی آتی رہتی ہے۔جب صورتِ حال یہ ہو کہ ہر وقت دھڑ کا لگا ہوا ہے کہ کب فساد ہوگا اور دُکان لُٹ جائے گی اور مکان کو آگ لگا دی جائے گی ،تو اس صورت میں ذہن میں وہ اعلا تصورات کہاں سے آسکتے ہیں جو ایک مطمئن طبقے کو شعور کی دولت عطا کیا کرتے ہیں۔اس کے باوجود ہندستان کے ہر علاقے میں مسلم اقلیت اس ملک کی ترقی میں اتنی ہی مدد کر رہی ہے اور حصہ لے رہی ہے جتنے وہ طبقے حصہ لے رہے ہیں جن کو اپنی تعلیم مادری زبان میں حاصل کرنے کی آسانی حاصل ہے،جن کی معاشی حالت بہتر ہے اور جن کے کارخانے ،جن کے گھر اور جن کی دکانیں لُٹنے کے قہر سے اور غارت گری کے خوف سے محفوظ رہتی ہیں۔اب دیکھیے تو کہ کیسی عجیب صورتِ حال ہے کہ میرٹھ میں کتنا بڑا فساد ہوا،مسلمانوں کا باقاعدہ قتلِ عام ہوا کہ جلیانوالہ باغ کے حادثے کی یاد تازہ ہوگئی، یہ مطالبہ کیا گیا کہ پی۔اے۔سی میں مسلمانوں کا کچھ تناسب بڑھنا چاہیے۔اس پر حکومتی حلقوں میں یہ کہا گیا یہ تو فرقہ واریت ہے۔جب ایک بڑی اقلیت معمولی ملازمتوں میں بھی حصہ پانے سے اپنے آپ کو محروم پاتی ہے، یہاں تک کہ چپراسی اور سپاہی ،جن کے لیے بہت پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں ہوتا ہے،وہ ملازمت بھی بہ مشکل مل پاتی ہے ،تو ان حالات میں اُس اقلیت کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی؟ یہ تو بڑے کمال کی بات ہے بڑے ضبط وتحمل کی بات ہے کہ ان صبر آزما حالات کے باوجود یہ اقلیت پوری طرح اس ملک کے تعمیری کاموں میں مصروف ہے،شانہ بہ شانہ حصہ لے رہی ہے اور اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے کی بھی کوشش کر رہی ہے۔

س: آج مسلم سیاست جس انتشار کا شکار ہے تو اس انتشار کا کوئی رشتہ ماضی سے بھی ہے۔تو اس انتشار کے اثرات مسلمانوں کی زندگی پر آپ کے خیال میں کیا ہوں گے؟

ج: آپ نے یہ بھی بہت اہم سوال کیا یہ ہمارا بہت بڑا المیہ ہے بل کہ قومی المیہ ہے کہ ماضی میں مسلم سیاست جذباتی انتہا پسندی کا بری طرح شکار رہی ہے۔صحیح معنوں میں بیسویں صدی کے آغاز سے مسلم

سیاست کا آغاز ہوتا ہے اور اس سلسلے کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی تحریک خلافت تحریک تھی، جس میں ہمارے پیش تر رہبروں کا طرزِ عمل اور اندازِ فکر سراسر جذباتی تھا۔ اس میں انتہا یہ ہے کہ یہاں سے مسلمانوں نے ہجرت کی تھی افغانستان کی طرف یہ دیکھے بغیر کہ وہاں کے حالات کیا ہیں؟ ان مہاجرین پر وہاں جو گذری اور جس طرح بہت سے لوگوں کو واپس آنا پڑا وہ سب تاریخ کا حصہ ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے اور حیرت انگیز بھی کہ پہلے دن سے یعنی خلاف تحریک سے لے کر اور ہندوستان کی تقسیم کے زمانے تک مسلمان عوام اور مسلمان لیڈروں نے سیاسی تحریکوں میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ہندستان کی آزادی میں برابر کا حصہ لیا لیکن جس چیز کو آپ مسلم سیاست کہتے ہیں، اس کی تشکیل آپ صحیح معنوں میں نہیں کر سکے۔ اگر آپ ذرا سنجیدگی سے دیکھیں اور جذبات کو ہٹا دیں، تو ایک بڑے لمبے المیے سے آپ دو چار ہوں گے اور وہ یہ کہ پوری مسلم سیاست ناکام مسلم سیاست دانوں کے نعروں ،باتوں اور کاموں کا مجموعہ ہے، یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کو بڑے قد آور لیڈر ملے لیکن وہ سب ناکام سیاست داں رہے۔ مولانا محمد علی جوہر سے لے کر مولانا ابوالکلام آزاد تک اور ان میں مولانا حسرت موہانی کو بھی شامل کر لیجیے، یہ ایسے مخلص لوگ تھے کہ ان کا جواب اب شاید ہی مل سکے، ایسے کام کرنے والے، ایسے محنتی لوگ ،ایسے لگن والے اور جذبات سے سرشار کہ اب ان کی مثال ڈھونڈ کر لانا مشکل ہے، لیکن تاریخ کے لحاظ سے یہ سب ناکام سیاست داں تھے۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ عمر بھر یہ لوگ جیل جاتے رہے اور قربانیاں دیتے رہے، مگر ان سب سے فائدہ دوسروں نے اُٹھایا۔ دوسری طرف مسلم معاشرے کے لیے مسلم اقلیت کے لیے کوئی ایسا منشور مرتب نہیں کر سکے، اس لحاظ سے پوری مسلم سیاست بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر 1947 تک پُر جوش نعرے لگانے ،جیل جانے اور گولیاں کھانے اور گھر لٹانے کا دوسرا نام رہا۔ جس چیز کو سیاسی منصوبہ بندی کہتے ہیں۔ جو بہت ٹھنڈے دل و دماغ سے ہوا کرتی ہے، اس کا نقش نہیں بن پایا۔ مختصر یہ کہ مسلم اقلیت کو جو سیاسی شعور ملا، وہ جذباتی تو تھا لیکن سیاست جس دور بینی اور جس مستقبل اندیشی کا مطالبہ کرتی ہے، اس سے وہ خالی تھا۔ اس کے اثرات آج تک نظر آ رہے ہیں اور یہ جو اس وقت مسلم سیاست میں بے سمتی ہے کہ پوری مسلم سیاست لا سمتیت کا شکار ہے، نہیں معلوم کہ کہاں جانا ہے، کدھر جانا ہے، یہ اسی مداویت کا نتیجہ ہے۔

س: آج کل بابری مسجد کا مسئلہ نہ صرف مسلمانوں بل کہ ملک کے تمام امن پسند شہریوں کے لیے اہم بنا

ہوا ہے آپ اس مسئلے کے متعلق کس طرح سوچتے ہیں؟

ج: اصلاً تو یہ خالص تاریخی مسئلہ ہے تاریخ کی کتابیں موجود ہیں، ان کو بنیاد بنا کر صحیح صورتِ حال کا آسانی سے تعین کیا جاسکتا ہے۔لیکن ہمارے ملک کی بدنصیبی یہ ہے کہ یہاں ہر چیز جلد مذہبی رنگ اختیار کر لیتی ہے، ایسا مذہبی رنگ جس کا انجام سر پھٹول پر ہوتا ہے۔ بابری مسجد حکومت کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔آپ کو یاد ہوگا کہ پہلے دن جس دن بابری مسجد کا تالا کھلوایا گیا تھا اور جس طرح ٹیلی ویژن پر اس کی نمایش کی گئی تھی، وہ بہت ہی قابلِ اعتراض اور بہت ہی غلط اور تکلیف دہ طریقِ کار تھا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ یہ چاہتے تھے کہ یہ قضیہ کسی طرح پھیلے اور اُبھرے۔اسی دن سے جس دن سے ٹیلی ویژن پر اس کی نمایش اس طرح کی گئی تھی، اس قضیے میں، جو بنیادی طور پر تاریخی ہے مذہبی منافرت اور جھگڑے فساد کا تیز رنگ شامل ہو گیا۔اب صورتِ حال یہ ہے کہ یہ مسئلہ صرف بابری مسجد کا نہیں رہا ہے، یعنی یہ ایک مسجد کا معاملہ نہیں ہے، ایک جگہ کا نہیں ہے، اب یہ ایک مسئلہ اندازِ فکر کا بن گیا ہے، ایک طریقۂ کار کا بن گیا ہے، ہم میں سے کوئی صاحب کہیں کہ رواداری کے تحت اچھا یہ ہوگا کہ آنکھیں بند کر کے اور تاریخی حقائق کو چھوڑ کر اور سب باتوں سے قطع نظر کر کے اس مسجد کو چھوڑ دیا جائے تو یہ کہنا تو بہت آسان ہے لیکن اس کے نتائج پر غور نہیں کیا جاتا، کیوں کہ اس مسئلہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ فرقہ پرستوں کا ایک بڑا طبقہ وہ ہے جس میں خاصے پڑھے لکھے لوگ شامل ہیں اور جو عملی انداز سے دھوکا دینے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بیسیوں مقامات جو ہیں، یہ کچھ سے کچھ بن چکے ہیں، ان کی صورت اب تبدیل ہونا چاہیے اس طرح بابری مسجد ایک نقطۂ آغاز بن سکتی ہے۔فرقہ پرستی کی اس خطرناک تحریک کے فروغ کا۔اس لیے میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ اس مسئلے کو سیاست سے نکال کر تاریخی سطح پر رواداری کے ساتھ طے کرنے کی کوشش کی جائے۔یہ دیکھا جائے کہ تاریخ کیا کہتی ہے اور صحیح صورتِ حال کیا تھی اور اب عملی صورت حال کیا ہے، یعنی عملی طور پر کیا ممکن ہے اور کیا نہیں۔حکومت بڑی آسانی کے ساتھ اس بات کو طے کر سکتی ہے کہ عملی طور پر کیا صورت حال مناسب ہے۔اس لیے قطعی طور پر میری رائے یہ ہے کہ بابری مسجد کا فیصلہ اس طرح ہونا چاہیے کہ فرقہ پرستی کو کسی دوسری جگہ بابری مسجد کے واقعے کو دہرانے کا موقع نہ ملے، جس کے لیے بہت سے فرقہ پرست ذہنوں میں گنجایش موجود ہے۔یاد رکھیے کہ اقلیت کے مقابلے میں اکثریت کے فرقہ وارانہ رجحانات زیادہ نقصان پہنچایا کرتے ہیں اور آر ایس ایس اور ہندو مہاسبھا جیسی فرقہ پرست تنظیمیں اس کو مواد دیتی رہتی ہیں۔

س: آپ گذشتہ دنوں پاکستان تشریف لے گئے تھے، آج کل وہاں جو سیاسی حالات ہیں، میں چاہوں گا کہ ان کے متعلق آپ اپنی رائے سے ہمیں آگاہ فرمائیں؟

ج: پاکستان کی ایک بہت بڑی مشکل یہ رہی ہے کہ اس کی تشکیل کے بعد سے سیاسی اثرات کو اور سیاسی طریقِ کار کو فروغ پانے کا موقع وہاں نہیں مل سکا۔ کیوں کہ بیش تر وہاں حکومت فوجی رہی ہے۔ فوجی حکومت میں سیاسی ذہن کی نہ تشکیل ہوتی ہے اور نہ تربیت ہو پاتی ہے۔ کسی قوم، کسی طبقے، کسی علاقے اور کسی ملک میں اگر سیاسی شعور کی تربیت نہ ہوئی ہو اور اس کا نشو و نما پوری طرح نہ ہوا ہو تو اس سے بڑے پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے ہیں اور پاکستان اسی صورت حال سے دو چار ہے۔ ہاں ایک معاملے میں میری حیرت کی تو انتہا نہیں رہی تھی کہ صدر ضیاء الحق کی زندگی میں پاکستان کی جماعت اسلامی نے یہ عجیب فیصلہ کیا کہ بیگم بے نظیر بھٹو کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ جماعت اسلامی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلامی نظام نافذ کیا جائے۔ کیا بیگم بے نظیر بھٹو اسلامی نظام نافذ کریں گی؟ یہ ایسی مہمل بات ہے کہ کوئی صاحبِ ہوش اس کی تائید نہیں کر سکتا، مجھے بہت تعجب ہوا ہے اور بہت حیرت ہوئی ہے پاکستان کی جماعت اسلامی کی اس غیر دانش مندانہ روش پر، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں۔ اس کا مطلب وہی ہے کہ سیاسی شعور جس سطح پر کارفرما ہونا چاہیے اس سطح پر وہاں کارفرما نہیں ہے۔ جہاں تک پاکستان کی عام صورت حال کا تعلق ہے تو میں ادبی حلقوں میں بیش تر رہا، سیاسی حلقوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں پڑا۔ اس لیے میں وہاں کے سیاسی حالات پر گفتگو نہیں کر سکتا یا مجھے نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ نا تمام معلومات ہمیشہ غلط فہمی پیدا کیا کرتی ہے۔ ہاں وہاں کے ادبی حالات سے اچھی طرح واقف ہوں اور ان پر کسی اور وقت میں تفصیل سے گفتگو کی جا سکتی ہے، آپ کو یہ بات معلوم ہونا چاہیے کہ پاکستان میں اُردو کا مسئلہ ہندستان میں اُردو کے مسئلے سے کچھ کم پیچیدہ نہیں۔ لیکن یہ سب طویل گفتگو کے متقاضی ہیں اور کسی اگلی صحبت میں جب ہم لوگ مل بیٹھیں گے، تو ان موضوعات پر تفصیل سے گفتگو ہوگی۔

(ماہ نامہ کتاب نما، گوشۂ رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، مدیر شاہد علی خاں، جلد: 30، شمارہ :8، اگست 1990، صفحہ 60 تا 64)

☆☆☆

رشید حسن خاں سے گفتگو

ڈاکٹر ٹی. آر. رینا

میں نے خاں صاحب سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا کہ میں آپ کا ایک ویڈیو انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔ یہاں نزدیک کوئی ویڈیو والا مل سکتا ہے؟ جواب دیا ''رینا صاحب کل عید ہے آج سبھی لوگ تہوار کی خوشی میں اپنے اپنے کام بند کر کے گھروں کو چلے گئے ہیں۔ میں زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتا۔ بات کرنے میں تھوڑی تکلیف ہوتی ہے۔ سانس پھولنے لگتی ہے۔ ایسا کرتے ہیں یہ کام گرمیوں کے لیے اُٹھا کر رکھتے ہیں۔ اُس وقت میری طبیعت بہتر ہو جائے گی اور آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ میں نے سوال نامہ سامنے رکھا، انھوں نے اُسے پڑھا۔ کہنے لگے ''بہت سوال لکھ رکھے ہیں، ان کے لیے وقت چاہیے۔'' اُٹھے اور ایک کتابچہ ''بازیافت'' جنوری 2002 جس کے مدیر رفیع الدین ہاشمی شعبۂ اُردو پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج لاہور، لا کر مجھے دیا اور کہا اسے بھی رکھ لو اس کی روشنی میں بھی چند سوال شامل کر لینا۔''

میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''حضور میں نے خط کے ذریعے آپ کے شجرۂ نسب کے بارے میں پوچھا تھا؟

خاں صاحب: ''تحقیق میں کسی کے حسب نسب کی ضرورت نہیں ہوتی کیوں کہ تین صورتوں میں لوگ اکثر جھوٹ بولتے ہیں۔ مرید اپنے پیر کے لیے، بیٹا اپنے باپ کے لیے اور شاگرد اپنے اُستاد کے لیے۔'' خاں صاحب نے غالبؔ کے خاندان کی مثال دی جس کا ذکر خود غالبؔ نے کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ''ایسا کوئی خان دان سرے سے ہے ہی نہیں۔ پھر کوئی کیوں یقین کر سکتا ہے۔ ہمیشہ ادیب یا محقق کی شخصیت کو اس کے کام کے ترازو میں تولنا چاہیے۔''

راقم: خاں صاحب آج کل آپ کن پروجیکٹوں پر کام کر رہے ہیں؟

خاں صاحب: میں دو پروجیکٹوں پر کام کر رہا ہوں۔ پہلا ہے ''گنجینہ معنی کا طلسم''۔ یہ غالبؔ کے الفاظ کا اشاریہ ہے۔ غالب نے ایک لفظ کو کتنی صورتوں میں استعمال کیا ہے اور کہاں کہاں، یہ اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی کمپوزنگ شروع ہو چکی ہے۔ یہ دو جلدوں میں شائع ہوگا۔ دوسرا ''غرائب اللغات'' ہے یہ اُردو کا پہلا لغت ہے جو عالم گیر اورنگ زیب کے عہد میں پہلی بار ہریانہ میں لکھا گیا جو لفظ اُس وقت استعمال کیے جاتے تھے آج ان کی شکلیں بدل گئی ہیں۔ مثلاً ''ریوڑ'' جو بھیڑوں کے غول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ پہلے ''اریوڑ'' کی صورت میں لکھا جاتا تھا۔''

میں نے خاں صاحب سے ایک سوال اور کیا'' آپ نے بہت سا کام کیا ہے لیکن آپ کا سب سے اچھا کام کون سا ہے؟'' انھوں ے جواب دیا'' اُردو املا'' اور ''فسانۂ عجائب''۔ خاں صاحب اپنے کام کرنے کے طریقۂ کار سے متعلق کچھ بتائیں گے؟''

انھوں نے بتایا کہ'' ساری زندگی میں نے سورج غروب ہونے کے بعد لکھنے پڑھنے کا کام نہیں کیا۔ میں ہر روز صبح پانچ بجے اُٹھ جاتا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر نہانا لازمی تھا۔ نہانے کے بغیر میں نے کبھی ناشتہ نہیں کیا۔ چھ بجے کے قریب لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیتا جو ایک بجے تک جاری رہتا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر لیٹ جاتا اور تین بجے تک آرام کرتا، تین بجے اُٹھنے کے بعد سیدھا کھیل کے میدان میں پہنچ جاتا یا کافی ہاؤس چلا جاتا۔ ملازمت کے دوران کام کاج معمول میں تبدیلی بھی آ جاتی تھی۔ لیکن ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد میں نے پہلے کی نسبت زیادہ کام کیا ہے۔ کیوں کہ اب میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔ آج کل میں صبح چھ بجے سے ایک بجے تک، پھر تین بجے سے چھ بجے شام تک کام کرتا رہتا ہوں۔''

راقم۔: ''خاں صاحب اس وقت آپ کی عمر کیا ہوگی اور آپ کی صحت کیسی رہتی ہے؟''

خاں صاحب: '' آنے والے دسمبر میں، میں 80 برس پورے کرلوں گا۔ تعلیمی اسناد میں 10 جنوری 1930 درج ہے لیکن اصل دسمبر 1925 ہے۔ آج کل موسم تبدیل ہو رہا ہے۔ سردی شروع ہونے پر میں کام کے لیے بیٹھ نہیں سکتا۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے۔ کمرے میں بھی چلنا پھرنا نہیں ہوتا۔ تین سالوں سے میں نے باہر جانے کے لیے اپنی دہلیز پار نہیں کی۔ پراسٹریٹ کی تکلیف بھی ہے، پیٹ اکثر

خراب رہتا ہے، صبح سے شام تک دوائیاں وقت پر لینی پڑتی ہیں۔ سانس پھولنے لگتا ہے۔ زیادہ حرکت کرنے کے لیے ڈاکٹروں نے سختی سے منع کیا ہے۔ اب گھر کی چار دیواری کے اندر مقید ہو کر رہ گیا ہوں۔ جب موسمِ گرما شروع ہوگا تو میں اچھی طرح کام کاج کرنے لگوں گا۔''

خاں صاحب جو لوگ زندہ اشخاص پر ایم۔فل یا پی۔ایچ۔ڈی کر رہے ہیں ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

''ارے اسے سہل نگاری کہیں گے۔ یہ لوگ ادب کے ساتھ انصاف نہیں بل کہ نا انصافی کر رہے ہیں۔ کیا ایسا کوئی اسکالر ہے جو کسی زندہ شخص پر کام کر رہا تو وہ حقیقت نگاری سے کام لے سکتا ہے۔ آخر وہ بھی تو انسان ہے۔ اس میں بھی خوبیاں اور خامیاں ہوں گی۔ انھیں منظر عام پر لانا آسان کام نہیں۔ آج یہ کام صرف ڈگری حاصل کرنے کے لیے ہو رہا ہے۔ میں نے ایسے حضرات دیکھے ہیں جن پر بیک وقت دو دو اسکالر کام کر رہے ہیں۔ جب تک یہ حضرت زندہ ہیں ان کا کیا کہاں ختم ہوا۔ انسانی ذہن مسلسل اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوتا رہتا ہے اور تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ آج جن نظریات کا وہ حامی ہے کل مخالف بھی ہو سکتا ہے۔ نئی نئی تحریکات سے وہ اثر قبول کرتا ہے تو پھر ہم کیوں کر اپنے کام کے ساتھ انصاف کر سکتے ہیں۔ سچ تو نہیں لکھ سکتے نا؟ تحقیق کا اصل مقصد سچائی کی تلاش ہے جس کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔''

راقم: مستقبل میں اُردو زبان کی ہندوستان میں کیا پوزیشن ہوگی؟''

خاں صاحب: ''دیکھو کوئی بھی ایسی زبان جس کا سیدھا تعلق عوام کے دلوں سے ہو، ہمیں اُس کے بارے میں فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ایک بات مجھے مایوس کیے جا رہی ہے کہ جہاں جہاں یونی ورسٹیوں میں اُردو شعبے قائم ہیں وہاں پہلے جیسا معیار نظر نہیں تا۔ تحقیقی کام بھی اس نوعیت کے نہیں ہو رہے۔ پُرانے متون کی تدوین کی کوئی کوشش نہیں کرتا، بل کہ ان کو ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں پاتے۔ ہمارا قدیم ورثہ الماریوں میں بند رہ کر دیمک کی نذر ہو جائے گا۔ آج کل ہلکے پھلکے موضوعات کو لے کر کام ہو رہے ہیں۔''

راقم: ''معیاری کام اور متون کی تدوین کے نہ ہونے کے لیے آپ کسے قصور وار مانتے ہیں۔ نئے اسکالروں یا اساتذہ کو؟''

خاں صاحب: ''دونوں کو، جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، سہل نگاری سب سے بڑی وجہ ہے اسکالروں کو کوئی راستہ دکھانے والا ہونا چاہیے۔ نئے اساتذہ سے آپ کتنی توقعات رکھ سکتے ہیں۔ میں اساتذہ کی مخالفت نہیں کرتا، میں بھی توانہی میں سے ایک ہوں۔ لیکن جب یہ ملازمت حاصل کر لیتے ہیں تو لکھنے پڑھنے سے جی چُرانے لگتے ہیں۔ علم عبادت چاہتا ہے۔''

راقم: ''کیا آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ادب میں بھی گروہ بندی جاری ہے؟''

خاں صاحب: ''ادبی گروہ بندیوں سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ سلسلہ تو زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ پہلے ادبی معارکے ہوا کرتے تھے اب سیاسی معرکے ہو رہے ہیں۔ ادبا و شعرا سیاسی جکڑ بندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ آج کام کو نہیں سیاسی جوڑ توڑ کو سراہا جاتا ہے۔''

اس طرح خاں صاحب کا ایک مختصر انٹرویو ہو گیا۔ اندھیرا کافی ہو چکا تھا۔ میں نے اجازت چاہی۔ انھیں صبح ہونے والی عید کی مبارک باد دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کھانے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ میں نے عرض کیا کہ حضور آپ جانتے ہیں میں ویزیٹرین ہوں اور آپ کے ہاں آج یہ ممکن نہیں۔ وہ ہنس دیے۔ میں سلام کے لیے جھکا۔ اُٹھ کر مجھے گلے لگایا۔ پھر وہی کلمات دہرائے 'خوش رہو میاں آپ کو پُرانی قدروں کا پاس ہے۔ آج کی نسل ان اقدار کو بھولتی جارہی ہے۔'' یہ میری بڑی خوش نصیبی تھی۔ بیٹے خالد سے کہا ''رینا صاحب کو باہر سڑک تک چھوڑ آؤ''۔ میں اس اُمید کے ساتھ ہوٹل واپس لوٹ آیا کہ گرمیوں میں خاں صاحب کے ساتھ پھر ملاقات ہوگی۔ 4 نومبر 2005 کی صبح کو میں براستہ لکھنؤ کان پور کے لیے روانہ ہو گیا اور چار دن کے بعد گھر لوٹ آیا۔

(ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، یکم تا 28 ستمبر 2006، صفحہ 18، 19 اور 32، 33)

☆☆☆

خاں صاحب سے بات چیت

(ترتیب: معین الدین جینا بڑے)

یونس اگاسکر : خاں صاحب 1857 کے بعد انگریزوں نے جو تعلیمی نظام یہاں رائج کیا اس کے نتیجے میں بہت سے ایسے گھرانے جن کے یہاں کچھ علمی روایتیں تھیں، نئی تعلیم سے آراستہ ہوئے اور قدیم علوم وفنون سے بھی وابستہ رہے، چناں چہ کئی نام ور شخصیتیں سامنے آئیں۔ آپ نے ایک مرتبہ گفتگو میں فرمایا تھا کہ آپ کے خاندان میں اس طرح کی کوئی علمی روایت نہیں تھی لیکن آپ تحقیق وتدوین کے جدید ترین اصولوں تک آ پہنچے ہیں۔ ذرا اس پر کچھ روشنی ڈالیے کہ یہ سفر آپ نے کیسے طے کیا؟

خاں صاحب: دیکھیے میں تو درسِ نظامیہ کا طالب علم رہا ہوں۔ میرے والد اُن لوگوں میں سے تھے جو ایمان داری کے ساتھ انگریزی تعلیم کو ناجائز سمجھتے تھے۔ ایک تھا نا گروہ اس زمانے میں۔ سو انھوں نے مجھے انگریزی اسکول میں بھیجنے کے بجائے عربی مدرسے میں بھیجا۔ پڑھتا رہا۔ وہاں ہمارے اُستادِ محترم بار بار حدیث کی تدوین کے اصولوں کو بیان کیا کرتے تھے۔ روایت ایسے قبول کی جاتی تھی، ایسے قبول نہیں کی جاتی تھی، راوی کو ایسے پرکھا جاتا تھا۔ روایت کے اصولوں پر گفتگو کی جاتی تھی۔ پھر ہم نے منطق پڑھی، مدرسے میں۔ منطق کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ ذہن کو غلطی کرنے سے بچائے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ آپ لفظ کو کس طرح استعمال کریں اور کس طرح استعمال نہ کریں۔ منطقی مغالطہ کیسے دیا جاتا ہے۔ اس سے بچا کیسے جاتا ہے۔ تو یہ بنیادی تصور میرے یہاں تحقیق کا مدرسے سے اور علم وحدیث کے اصولوں کو سُن کر پیدا ہوا تھا۔ لیکن وہ سفر وہاں رُک گیا تھا کیوں کہ میں مدرسے سے اُٹھ کر سیدھا ایک کارخانے میں آیا اور پھر ٹریڈ یونین میں آ گیا۔ سن اُنتالیس سے اڑتالیس تک اسی دائرے میں گردش کرتا رہا۔

ایک بہت دل چسپ بات عرض کروں کہ مدرسوں میں اُردو کو کوئی زبان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہم

بھی نہیں سمجھتے تھے۔ جب تک کہ مدرسے سے باہر نہیں آئے۔ میری شادی جلدی ہوگئی تھی تو ہماری سسرال کی الماریوں میں ایک کتاب رکھی ہوئی تھی ''آبِ حیات'' ہم نے اس کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ عجیب دُنیا ہے، ہم تو اس دنیا سے بے خبر رہے، اس کے علاوہ طلسم ہوش ربا'' پڑھی۔ دراصل ''طلسم ہوش ربا'' ہم نے فیکٹری کے زمانے میں پڑھ لی تھی۔ ہمارے یہاں تین شفٹیں فیکٹری میں ہوتی تھیں، رات کو جو شفٹ ہوئی تھی اس میں ایک گھنٹا انٹرویل کا ملتا تھا۔ لوگ ایک گھنٹا نیند لے لیا کرتے تھے۔ میرے محلّہ میں ایک دُکان تھی جو کتابیں کرائے پر دیا کرتی تھی۔ وہاں ''طلسم ہوش ربا'' کے موٹے موٹے دفتر رکھے تھے۔ چوں کہ چھوٹی کتاب جلدی ختم ہو جاتی تھی تو یہ سمجھ کر کہ یہ موٹی کتاب ہے، دیر میں ختم ہوگی، اُس کو لے آئے تھے۔ یہ کچھ نہیں معلوم تھا کہ اس میں ہے کیا۔ انٹرویل میں اسے پڑھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو ایسی اور اتنی بڑی دنیا ہے جس سے ہم تو بہت ہی بے خبر رہے۔ پہلی بار اُردو زبان کی وسعت کا اس کے پھیلاو کا اندازہ ہوا۔ ''طلسم ہوش ربا'' کی سب جلدیں وہیں پڑھیں اور پھر دو بار پڑھی۔ اس کے بعد ''آبِ حیات'' پڑھی۔ یہ انشا پردازی کے نگار خانے ہیں۔ اتفاق سے ''نگار'' اس زمانے میں میرے پاس آنے لگا۔

معین الدین جینا بڑے: اس کی کیا سبیل نکلی کہ آپ کے یہاں ''نگار'' آنے لگا اس زمانے میں.....

خاں صاحب: ہمارے شہر میں ایک کرم فرما ہمارے ایسے تھے جو علمی و ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ان کے یہاں ''نگار'' آیا کرتا تھا۔ میں ایک بار ان کے گھر گیا۔ اس کو دیکھا تو میں نے ان سے کہا کہ یہ رسالہ تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میں نیاز صاحب سے واقف نہیں تھا۔ ''نگار'' اس سے پہلے پڑھا بھی نہیں تھا۔ ''نگار'' اس سے پہلے پڑھا بھی نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس میں ہوتا کیا ہے۔ اس شمارے کو لے آیا جب پڑھا تو اس میں دو تین مضمون ایسے تھے جنھوں نے ذہن میں ہلچل پیدا کر دی کیوں کہ ہم تو مدرسے سے یقین کو لے کر آئے تھے اور شک اور انکار کو بُرا سمجھتے ہوئے آئے تھے۔ پر اُس رسالے کی تحریریں، خاص طور سے نیاز صاحب کی تحریریں وہ تھیں جن سے معلوم ہوا کہ ضرب پڑنے لگی ہے ان سب باتوں پر جن کو پہلے پڑھتے رہتے تھے۔ خیر! پہلے خیال یہ آیا کہ بہت ہی بُرا شخص ہے یہ تو کافر ہے، ملحد ہے لیکن عبارت ان کی اتنی اچھی تھی کہ اس خیال کہ باوجود رسالہ پڑھنے کو جی چاہا۔ اُس کا دوسرا

شمارہ پڑھا اور پھر تیسرا شمارہ پڑھا تو خیال آیا کہ نہیں یہ شخص ملحد و کافر تو نہیں معلوم ہوتا ہے۔ پھر اور تحریریں پڑھیں۔ تو میرے ذہن کی ابتدائی تشکیل میں نیاز کی تحریروں کا بہت بڑا حصہ ہے کہ انھوں نے مجھے شک سے اور انکار کی طاقت سے آشنا کیا لیکن یہ دل چسپ بات ہے کہ خود نیاز صاحب تحقیق کے آدمی نہیں تھے۔ جب میں نے حافظ محمود خاں شیرانی اور قاضی عبدالودود صاحب کو پڑھا اور باضابطہ تحقیق کی طرف آیا، مولانا عرشی سے ملا تو معلوم ہوا کہ نیاز صاحب بہت ہی غیر معتبر راوی تھے۔ لیکن اس کے باوجود میرے زمانے کی جو نسل ہے اس کے ذہن کی تشکیل میں نیاز کا اور نگار کی تحریروں کا بہت بڑا حصہ ہے کہ اس پوری نسل کے ذہن کو خیال کی وسعت سے، فکر کی وسعت سے ''نگار'' اور نیاز نے آشنا کیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ تنگ نظری، کٹھ مُلاّ ئیت اور اصرار بے جا، ان کی خرابی کا تصور ذہن میں پیدا کیا تو یہی تحقیق کے نقشِ اول ہوتے ہیں تو مدرسے میں علم حدیث اصولِ حدیث اور اس کے بعد نیاز کی تحریریں۔ ان دو چیزوں نے مل کر میرے یہاں تحقیق کے ابتدائی نقش روشن کیے۔

خوش نصیبی سے اسے میں عطیۂ فطرت کہوں گا کہ اس کے بعد مجھے حافظ محمود خاں شیرانی اور قاضی عبدالودود کو پڑھنے کا موقع ملا۔ شبلی کے اندازِ تحریر کا میں شروع سے ہی قائل ہو گیا تھا۔ کہیں سے مجھے ''شعر العجم'' کی ایک جلد مل گئی تھی۔ فارسی ادب تو مدرسے والوں کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے۔ اُن کی عبارت مجھے بہت پسند آئی۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ سب سے بڑے محقق اور نقاد ہیں۔ ایک محفل میں کسی نے یوں ہی کہا کہ ''مولانا شبلی بہت بڑے انشا پرداز تھے۔ بہت بڑے اچھے سخن فہم تھے۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں لیکن تحقیق میں خاصے کمزور تھے۔'' یہ بات بہت بُری لگی۔ میں نے پوچھا کہ ''تم یہ بات کیسے کہتے ہو'' تو کہنے لگے ''تم نے وہ نہیں پڑھی، حافظ محمود شیرانی کی ''تنقید شعر العجم'' وہ نہیں پڑھی تم نے؟'' میں نے پوچھا ''یہ حافظ محمود شیرانی کون صاحب ہیں؟'' ہنسی آتی ہے واقعی اُس زمانے کی باتوں پر.....

یونس اگاسکر: تب تک آپ دہلی پہنچ چکے تھے!

خاں صاحب: نہیں بھائی، یہ شاہ جہاں پور کی بہت پُرانی باتیں ہیں۔ ہاں!

معین الدین جینا بڑے :اچھا خاں صاحب ذرا ذہن پر زور دیں اور یہ یاد کرنے کی کوشش کریں کہ وہ کون سی محفل تھی اور وہ کون صاحب تھے؟

خاں صاحب : مقامی، شاہ جہاں پور کے۔ میں نے تب شاہ جہاں پور سے باہر قدم نکالا ہی نہیں

تھا۔سن پچاس تک میں شاہ جہاں پور سے باہر نکلا ہی نہیں تھا۔تو انھوں نے وہ کتاب لاکر دی مجھے۔اب جو پڑھا میں نے اس کو تو آنکھیں کھل گئیں۔اُس کے بعد شیرانی صاحب کو میں نے پابندی سے پڑھا۔پھر قاضی عبدالودود صاحب کی تحریریں تو اگر میں ان دونوں کی تحریریں نہ پڑھتا تو اس کا امکان تھا کہ میں نیاز صاحب کا جو انداز ہے جس میں تحقیق تہہ نہیں ہے اس کا اسیر ہو کر رہ جاتا اور مولانا شبلی کی انشا پردازی کو اچھا تحقیق کا اندازِ بیان بھی سمجھنے لگتا۔ان دونوں کی تحریروں نے میرے ذہن کو روشنی بخشی اور معلوم ہوا کہ انشا پردازی کا تحقیق سے کوئی واسطہ نہیں۔اسی طرح جس تنقید سے انشا پردازی کا واسطہ ہو وہ اپنی آبرو کھو دیتی ہے۔میں، سرور صاحب کو پڑھا لکھا آدمی مانتا ہوں۔ان کا بہت احترام کرتا ہوں۔اس بڑھاپے میں اب تک مطالعہ کرتے ہیں وہ۔ایسے لوگ بہت کم ہیں لیکن ان کے اندازِ نگارش سے میں اپنے آپ کو کبھی متفق نہیں کر سکا کیوں کہ اس کی بنیاد انشا پردازی پر ہے جو تنقید اور تحقیق کو راس نہیں آتی۔

معین الدین جینا بڑے: اُردو کا کوئی ایسا نقاد جس کے اندازِ نگارش سے آپ......

خاں صاحب: حالی کلیم الدین احمد دو ہیں۔ان کی تنقیدی زبان کو، ان کے لہجے کو، ان کے اسلوب کو میں تنقید کا سچا اسلوب سمجھتا ہوں۔کلیم الدین احمد سے شدید ترین اختلاف ہیں۔سب کو ہیں، مجھے بھی ہیں۔یہاں ان سے بحث نہیں۔اُن کا جو اندازِ بیان ہے، جو اسلوب ہے وہ تنقید کا کھرا اور سچا اسلوب ہے۔ان سے پہلے مولانا حالی کا تھا۔حالی کے یہاں یہ ہے کہ سادگی کا عنصر کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔کلیم الدین چوں کہ مغربی ادب سے اچھی واقفیت رکھتے تھے اور قدیم ادب سے بھی خوب واقف تھے اس چیز نے ان کے یہاں ایک توازن رکھا ہے تو کلیم الدین کا اسلوب حالی کے اسلوب کی ترقی یافتہ صورت ہے، روشن، واضح جس میں کوئی ابہام نہیں۔کوئی انشا پردازی کی لہریں نہیں اور کوئی قولِ محال نہیں۔

معین الدین جینا بڑے: کلیم الدین صاحب کے بعد کوئی ایسا نقاد جس کا اسلوب آپ کے نزدیک...

خاں صاحب: میں سمجھتا ہوں اب بھی کلیم الدین احمد کا اسلوبِ نگارش بہتر ہے۔میں اس کو اب بھی بہتر سمجھتا ہوں۔

یونس اگاسکر: اچھا ہماری تنقید اور تحقیق، دونوں کے تعلق سے آپ کی کیا رائے ہے؟

خاں صاحب: قطع کلام۔یہاں ایک بات رہ گئی۔احتشام صاحب ان لوگوں میں سے تھے جن کے

لکھنے کا انداز تنقید کا سچا انداز تھا۔لیکن وہ آئڈیالوجی کے اس قدر ایمان داری کے ساتھ وفادار تھے کہ ان کی تنقید رایوں پر وہ بے طرح اثر انداز رہی اور اس چیز نے ان لوگوں کو جو اس آئڈیالوجی کو نہیں مانتے تھے،اب بھی نہیں مانتے۔ان کی تحریروں سے ذہنی طور پر کچھ دور سا رکھا۔اور اس کا اثر یہ بھی پڑا کہ ان کا اسلوب بھی پوری طرح ذہنوں میں نہیں سما سکا ورنہ احتشام صاحب کے یہاں بھی تنقید کا اندازِ نگارش ہے۔اس کی غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ انگریزی ادب کے اُستاد رہے ہیں اور مغربی ادبیات سے اور تنقید کے دبستانوں سے واقف ہیں اور اس کے تقاضوں سے بھی۔

یونس اگاسکر: اچھا تنقید کے لیے تحقیق کی بنیاد جو ہے وہ بہت ضروری ہے آپ کے نزدیک؟

خاں صاحب: اکثر صورتوں میں (وقفہ) جہاں تک کلاسکی ادب کا تعلق ہے اور اس کے بعد کے ادب کے بڑے حصے کا بھی،اس کا شدید امکان رہتا ہے کہ نقاد اگر تحقیقی متعلقات سے واقف نہیں تو صحیح راے قائم نہ کر سکے۔آپ کو خیال ہوگا اور خوب یاد ہوگا کہ مجنوںؔ صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا میرؔ سے متعلق جس کی بنیاد اس شعر پر تھی۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اور اس سے انھوں نے یہ واضح کرنا چاہا تھا کہ میرؔ کے یہاں مقادمت کی طاقت کتنی تھی۔حالاں کہ یہ شعر میرؔ کا نہیں ہے تو اب آپ غور کیجیے کہ اس پورے تجزیے کی قیمت کیا رہی؟

یونس اگاسکر: صحیح فرمایا۔جیسے غالبؔ کے تعلق سے ہوا ہے کہ ان کے بہت پُرانے قطعے’اے تازہ اردانِ بساط ہوائے دل‘‘ کو 1857 سے جوڑ دیا جاتا ہے۔وہ بھی درست نہیں۔

خاں صاحب: جی ہاں!یہاں اگاسکر صاحب اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے سوال سے ذرا سا ہٹ کر اس سلسلے میں ایک بات کہنا چاہوں گا۔

یونس اگاسکر: جی فرمایئے۔

خاں صاحب: اس مسئلے کو ہم اگر اس روشنی میں دیکھیں یہ جو پچھلے دس بارہ سالوں سے ایک بحث اُٹھی ہے کہ متن کس کی ملکیت ہوتا ہے مصنف کی یا قاری کی۔اس روشنی میں کہا یہ جا رہا ہے کہ قاری جو ہے اساسِ تنقید ہے اور ایک بار متن جب کاغذ پر لکھ دیا گیا تو اب وہ قاری کی ملکیت ہے اور مفہوم کا تعین قاری

کرے گا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر ہر قاری کو اس کا حق ہے کہ وہ جس چیز سے جو چاہے مطلب نکالے۔ مصنف بیچ میں رہا ہی نہیں۔ نظامی بدایونی مرحوم نظامی پریس کے مالک تھے۔ انھوں نے بڑی اچھی اچھی کتابیں چھاپیں، سو انھوں نے دیوانِ غالبؔ کا ایک بہت اچھا اڈیشن چھاپا اور اس پر مقدمہ لکھوایا ڈاکٹر سید محمود سے۔ جن کے نام سے ہم سب واقف ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے غالبؔ کے اشعار سے بہت سے اشعار سے یہ استدلال کیا کہ وہ انگریزوں کے دشمن تھے۔ پکّے قوم پرست تھے۔ یہ تھے، وہ تھے۔ یعنی وہ ساری صفات جو آج کسی سیاسی آدمی میں ڈھونڈھی جاسکتی ہیں وہ انھوں نے مرزا غالبؔ میں تلاش کر لیں اور ان سب دعووں کو دلیل دی غالبؔ کے اشعار سے۔ تو اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ متن مصنف کی ملکیت نہیں ہوتا قاری کی ملکیت ہوتا ہے، تب ہم ڈاکٹر سید محمود پر یا ان جیسے لوگوں پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتے، ماننا ہوگا کہ ہاں جو کہا صحیح ہے۔ لیکن اگر ہم مانتے ہیں، پُرانی روایت کے مطابق کہ متن آخر تک مصنف کی ملکیت رہتا ہے تو قاری کو محض تشریح اور تعبیر کا حق ہے۔ ہر کلام میں تعبیر کی وسعتیں پنہاں ہوتی ہیں۔ یہ بہ خوبی ممکن ہے کہ ایک شعر کے ایک سے زیادہ مفاہیم مرتب کیا جاسکیں اور ایسا ہوتا ہے لیکن ایسا کوئی مفہوم کسی شعر سے برآمد نہیں کیا جاسکتا جس کا اس کلام سے تعلق نہ ہو صرف قاری کی ذہنی تعبیر سے تعلق ہو۔ اس کے علاوہ ہمیشہ کہا یہ ہی جائے گا کہ غالبؔ نے کہا ہے۔ غالبؔ کے شعر کا مطلب یہ ہے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ قاری کے ذہن کا مطلب یہ ہے۔ تو اگر ہم اس نکتۂ نظر کو مانتے ہیں کہ متن قاری کی ملکیت ہوتا ہے تو آپ کسی پر کوئی اعتراض نہیں کر سکیں گے۔ انتہا یہ ہے، جان صاحب کا نام تو سُنا ہوگا آپ نے۔ ریختی کے کتنے بڑے اُستاد۔ ان کا دیوان بھی چھاپا نظامی بدایونی نے اور دہلی کے بہت مشہور ادیب سے مقدمہ لکھوایا اس پر۔ جنھوں نے بیگماتی زبان میں مقدمہ لکھا اور ثابت کیا ریختی کے شعروں سے کہ جان صاحب انگریزوں کے بہت بڑے دشمن تھے۔ دیکھیے یہ کہا ہے، یہ کہا ہے، یہ کہا۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے اس پر تبصرہ لکھتے ہوئے کہا کہ ''بد ذوقی کی انتہا ہے یہ''۔ لیکن اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ متن قاری کی ملکیت ہوتا ہے تو آپ کوئی اعتراض نہیں کر سکتے۔ جان صاحب کو اگر سیاسی خیالوں والا، انگریزوں کا دشمن، محبِ وطن، قوم پرست ثابت کیا گیا اور ریختی کے شعروں سے انگریز دشمنی کا مفہوم نکال لیا گیا، پورا مقدمہ ہے طویل و ضخیم تو کوئی حق نہیں آپ کو اعتراض کرنے کا، ماننا پڑے گا۔

ہمارے یہاں شرح نگاری کی جو قدیم روایت تھی اس میں کبھی کسی شرح نگار نے یہ نہیں کہا کہ

ایک شعر کا ایک مفہوم ہوتا ہے۔ ہمیشہ مانا گیا کہ ایک شعر کے متعدد مفاہیم ہو سکتے ہیں لیکن وہ مفاہیم بر آمد انہیں الفاظ سے ہوں گے۔ خارج سے نہیں آئیں گے اور الفاظ جن مفاہیم کی مناسبت نہ رکھتے ہوں ان کو شاعر سے منسوب نہیں کیا جا سکتا اور نہ شعر سے۔ غالب کی مثالیں تو بہت ہیں بھائی کہ یار لوگوں نے ہر چیز کو ''دیوانِ غالب'' میں تلاش کر لیا کہ مغل حکومت کا زوال ہے تو شمع اس کی علامت ہے جب کہ غزل اس زمانے کی ہے جب شاہ ظفر جوان تھے بچارے بادشاہ ہوئے بھی نہیں تھے۔ تو یہ مسئلہ وہ ہے اگا سکر صاحب کہ ہم اصل میں اپنے ورثے سے بے خبر ہو کر یورپ کے اندھے مقلا ہو کر رہ گئے ہیں۔ حالاں کہ ہمارے پاس تشریح و تفسیر کی بڑی طاقت ور روایت ہے۔

یہ بہت بات ہے کہ ہمارے نصاب میں فارسی کی جو قابلِ ذکر کتابیں تھیں ان میں سے بیش تر کتابوں کی شرح لکھی گئی ہے اور ان لوگوں نے لکھی ہیں جو اپنے زمانے کے فاضل ترین بزرگ تھے۔ مثلاً خان آرزو۔ جنھوں ''گلستان'' کی شرح لکھی۔ تو طریقہ کیا تھا کہ پہلے شعر یا جملے میں جتنے لفظ آتے تھے ان کی وضاحت کی جاتی تھی کہ یہ کیا لفظ ہے، اس کا تلفظ کیا ہے، اس کے معنی کیا ہیں۔ پھر ترکیب۔ پورے جملے ترکیب، ترکیب نحوی کے لحاظ سے جائزہ لیا جاتا تھا اس کے بعد بتایا جاتا تھا کہ اس سے یہ معنی بھی نکلتے ہیں، یہ بھی نکل سکتے ہیں۔ تو وہ شرح کی روایت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کثرتِ تعبیر کی نفی کبھی نہیں کی گئی۔ ہمیشہ ہماری شرح نویسی کی روایت میں اس کو تسلیم کیا گیا۔ عملی طور پر اور فکری طور پر دونوں سطحوں پر۔ اصولی طور پر بھی اور عملی طور پر بھی کہ ایک شعر کے ایک سے زیادہ مفاہیم بخوبی ممکن ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ الفاظ ان معنی کی مساعدت کرتے ہوں وہ صرف قاری کے ذہن کی تعبیر نہ ہو اور وہ کلام جس کی ہم شرح کر رہے ہیں، مطلب بیان کر رہے ہیں وہ اُس مصنف کا ہے ہمارا نہیں ہے۔ اس لیے ایسی کوئی بات نہیں کہی جا سکتی جس کا اُس مصنف سے تعلق نہ ہو۔ مثلاً آپ کو تو معلوم ہے کہ مومنؔ غیر مقلا تھے، انھوں نے بڑی شدت کے ساتھ کہا ہے کہ۔

حیواں ہیں حقیقت میں یہ اہلِ تقلید

اب آپ مومنؔ کے کسی شعر سے یا ان کی جو مثنوی جہاد ہے اس کے کسی حصے سے ایسا مطلب برآمد کر لیں جس سے معلوم ہو کہ مومنؔ مقلا تھے تو کیا صورتِ حال پیدا ہوگی؟

غالبؔ کے انگریزوں سے جو تعلقات تھے ہم سب کے سامنے ہیں۔ غالبؔ مصلحت سے بے

نیاز زندگی میں کبھی نہیں رہے۔اب آپ جدید سیاسی لغت کے مطابق ان کو وطن پرست ثابت کرنا چاہیں تو یہ چیز قابلِ قبول نہیں ہوسکتی کیوں کہ ہم اصولاً مانتے ہیں کہ متن قاری کی ملکیت نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا، متن مصنف کی ملکیت رہتا ہے اور مصنف کے عقیدوں سے،اس کے خیالات سے کبھی غیر متعلق نہیں ہوسکتا اور جینا بڑے صاحب یہ بتائیے مجھے آپ کے متن کا لفظ یعنی TEXT تو حاوی ہے ساری کتابوں پر،سارے متنوں پر،کوئی تخصیص نہیں ہے نا۔کہیں دیوانِ غالب اور دیوانِ مومن کی تخصیص ہے۔جو متن ہے، جو TEXT ہے وہ اس میں شامل ہے۔تو یہ بتائیے کہ اگر ایک قاری کھڑے ہو کر یہ کہے کہ اس آیت کے یہ معنی جو آپ بیان کر رہے ہیں یہ تو نہیں ہیں اس کے معنی تو یہ ہیں تو کس بنیاد پر آپ رد کریں گے؟ کیا قبول کر لیں گے اسے آپ؟ کس بنیاد پر رد کریں گے؟ یہی تو مسئلہ ہے کہ متن کو اگر قاری کی ملکیت آپ مانتے ہیں تب تو ہر شخص کی ہر بات ماننا پڑے گی، چاہے وہ کچھ بھی کہے۔

معین الدین جینا بڑے : خاں صاحب مسلمانوں کی فکری تاریخ میں ایک بحث ہو چکی ہے کہ قرآن مخلوق ہے یا نہیں؟

خاں صاحب:معتزلہ کی۔

معین الدین جینا بڑے: جی معتزلہ کی۔آج جو یہ نظریہ پیش کیا جا رہا ہے کہ متن قاری کی ملکیت ہے...

خاں صاحب :یہ دوسری بحث ہے۔عباسیوں کا زمانہ اس لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ اسی زمانے میں ارسطو،افلاطون کے فلسفے نے مسلمانوں میں رواج پایا۔یونانی کتابوں کا ترجمہ عباسی دور میں ہوا۔اس وقت تک مسلمانوں کا ذہن بہت سادہ اور صاف تھا۔منطق اور فلسفے سے واقف ہی نہیں تھا۔عرب کی سرزمین کے سیدھے سادے لوگ جن کے دل اور زبان میں کوئی فلسفہ نہیں تھا، چوں و چرا کچھ نہیں ہے۔یہ ہے سو ہے،یہ نہیں ہے تو یہ نہیں ہے۔جب یونانی کتابوں کے ترجمے آئے، منطق کی کتابیں آئیں، فلسفے کی کتابیں آئیں،تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ذہنی سطح پر انقلاب سا آ گیا۔کہ چیزیں ٹوٹتے ہوئے محسوس ہونے لگیں۔وہ سادہ خیال لوگ جو کیوں اور کیا سے آشنا نہیں تھے ان کے لیے تو ذہنی انقلاب ایک آفت بن گئی۔اُس زمانے میں کئی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ان میں معتزلہ کا گروہ یعنی تحریکِ اعتزال بھی تھی۔تو معتزلہ نے منطق کی کسوٹی پر کسنا چاہا کچھ چیزوں کو۔یہ مسائل اس کے پیدا کیے ہوئے

تھے۔ مسلمانوں میں چوں کہ منطق و فلسفہ اس وقت اچانک آیا تھا۔ اس لیے یہ اس کا ردِ عمل تھا۔ ایک طرح سے ذہنی سطح ملنے پر اس کے بعد جب کچھ دن ہو گئے اور مسلمانوں میں علمِ کلام کی تدوین ہوئی اُس کے رد کے لیے تو پھر وہ لہر دب گئی۔

یونس اگاسکر: اچھا خاں صاحب! متن کو ظاہر ہے کہ اس دور کی زبان، اس دور کے سماجی حالات، مصنف کے اپنے ذاتی حالات، ان سب کی روشنی میں پرکھا جائے گا۔

خاں صاحب: دیکھیے معاف کیجیے گا۔ یہ دو لفظ آپ نے استعمال کر لیے سماجی و ذاتی حالات یہ گڑبڑ کریں گے۔ تدوین میں اور تحقیق میں متن کا جو تعین خصوصاً تدوین میں جو متن کا تعین کرتے ہیں تو جس عہد کا متن ہوتا ہے اس عہد کے لسانی حالات کی بنا پر کرتے ہیں کہ کہ لسانی صورتِ حال کیا تھی۔ سماجی صورتِ حال کیا تھی، اس سے ہمیں کوئی مطلب نہیں۔

یونس اگاسکر: لیکن اگر ہم کو اس سے کچھ نتائج اخذ کرنے ہوں تو...

خاں صاحب: وہ ہمارا کام نہیں، وہ نقاد کا کام ہے۔ دیکھیے تدوین اور تنقید کے دائرے الگ ہیں۔ محقق کا کام یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر حقائق کا تعین کر دے۔ قدر و قیمت کا تعین اس کا کام نہیں ہے۔ وہ جب دخل دے گا غلط کام کرے گا۔ اپنے حدود سے باہر جائے گا۔ مدون کا کام یہ ہے کہ وہ صحیح ترین متن کو مرتب کر کے دے کہ صحیح لفظ یہ ہیں اور پوری بحث ایک ایک لفظ کی کرے۔ پھر نقاد کا یہاں سے کام شروع ہوتا ہے کہ وہ اس متن کی بنیاد پر اس مصنف کے پورے حالاتِ زندگی، اس کا عہد، اس زمانے کے سماجی و تہذیبی حالات۔ ان سب کو سامنے رکھ کر بعض نتائج نکالے۔ تو یہ نقاد کا کام ہے یہ تنقید کا کام ہے۔ یہ تدوین اور تحقیق کے دائرے میں نہیں آتا۔

یونس اگاسکر: اگر اُس دور کے سماجی حالات کو کسی متن کی روشنی میں لوگ سمجھنا چاہیں۔

خاں صاحب: تحقیق میں ایسا ہوتا ہے نہیں۔ متن کی روشنی میں آپ لسانی صورتِ حال کو تو سمجھ سکتے ہیں کسی زمانے کے سیاسی حالات کو اگر سمجھیں گے کسی تصنیف سے تو پھر وہ تنقیدی دائرہ ہوگا۔ کیوں کہ اس کے لیے تعبیر بہت بڑی چیز ہوتی ہے اور تحقیق اور تدوین میں تعبیر کی گنجائش ہوتی ہی نہیں۔

یونس اگاسکر: نہیں میں یہاں تنقیدی نقطۂ نظر ہی سے جاننا چاہتا ہوں۔

خاں صاحب: ہاں وہ ٹھیک ہے، وہ پھر تنقید کا کام ہے اس کے لیے متن کا لفظ استعمال مت کیجیے اس

کے لیے تصنیف کا لفظ استعمال کیجیے۔ متن سے گڑبڑ ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ کسی مصنف کی جو تصنیف ہمارے سامنے ہے تو کسی زمانے کی کوئی تصنیف اپنے عہد کے تہذیبی، سماجی اور سیاسی حالات سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتی۔ کم و بیش کا فرق ہو سکتا ہے۔ بعض تحریریں زیادہ اشاریہ نما ہوں ہوں گی۔ بعض تحریروں میں یا تصنیفات میں اس کے اثرات کم ہوں گے لیکن یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی تصنیف میں وہ اثرات کار فرما نہ ہوں۔

معین الدین جینا بڑے : خاں صاحب ''خواب باقی ہیں'' میں سرور صاحب علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کے پورے پروجیکٹ کے تعلق سے جو کچھ کہتے ہیں وہ پڑھ کے حیرت ہوتی ہے۔ آپ نے تو اس نیت اور ارادے سے تنقید کی تھی کہ مستقبل کی جو جلدیں ہوں گی وہ ٹھیک ٹھاک نکلیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ ایک تعمیری کام کو اس طرح سے روک دیا گیا۔

خاں صاحب : مجھ سے ایک بار یہ پوچھا گیا تھا کہ تحقیق کے نقطۂ نظر سے خود نوشت عمریاں جتنی ہیں ان کے بیانات قابلِ استدلال ہیں کہ نہیں۔ میں نے اس سوال کا جواب یہ دیا تھا اور میرا ارادہ اس موضوع پر کسی وقت مفصل گفتگو کرنے کا ہے کہ جو خود نوشت سوانح عمریاں ہمارے سامنے ہیں ان کے جملہ بیانات Face Value پر قابلِ قبول نہیں ہیں، کیوں کہ ارادی طور پر غلط بیانیاں کی گئی ہیں، جھوٹ بولا گیا ہے۔ یہ مقام جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے یہ بھی اسی کے تحت آتا ہے۔ سرور صاحب نے اُس میں یہ لکھا ہے کہ کچھ پرنٹنگ Mistake تھیں۔ شاید اتنا بڑا جھوٹ آج تک نہیں بولا گیا ہوگا۔ یہ بھی آگے چل کر لکھا ہے کہ میں اس زمانے میں بڑا مصروف تھا، وہاں جاتا تھا وقت کم تھا۔ ارے صاحب یہ کہیے ایمان داری کم تھی۔ اگر وہ ہوتی تو آپ اس پروجیکٹ کو قبول نہیں کرتے کیوں کہ یہ ''تاریخِ ادب''، تحقیق کے دائرے کی چیز ہے اور مجنوں صاحب جو اسسٹنٹ تھے وہ بھی نقاد۔ میں ان کا بڑا احترام کرتا ہوں۔ صاحبِ نظر نقاد ہیں لیکن تحقیق سے نہ ان کو واسطہ نہ اُن کو۔ تو اگر یورپ میں یہ کام ہوا ہوتا تو جیل خانے بھیج دیے جاتے یہ سب لوگ۔

یونس اگاسکر : آپ نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ آپ کے یہاں لاٹھیاں تھیں بلّم تھے اور بغدے سے بڑی بڑی بوٹیاں کاٹی جاتی تھیں۔ مگر اس وقت جو خاں صاحب ہمارے سامنے محو گفتگو ہیں اس پس منظر سے ایسا لگتا ہے ان باتوں کا کوئی تعلق ہی نہیں؟ طبیعت کی یہ نزاکتیں، نفاستیں اور ساری چیزیں کہاں

سے آئیں؟

خاں صاحب: یہ تو آپ کیا کہیں فطرت کی دین کہیں یا جو بھی کہیں کہ میرے اندر شروع سے یہ بات ہے۔ میں اس وقت تک کام نہیں کر سکتا جب تک کہ اپنے قلم کو سیدھا نہ رکھ لوں، کاغذ ہو تو اچھا ہو، قلم ہو تو بہت اچھا ہو، پارکر ہو تو بہت اچھا۔ یہاں تک کہ کہا گیا ہے کہ کتاب اور دل کی چوری جائز ہے۔ میں نے اُس میں قلم کو بھی شامل کر لیا ہے۔ تو جو چیز ہو اچھی ہو اور اس کا منبع و مخرج جو ہے میرے خیال میں، یہ وہی قول ہے کہ جو کام ہو اعلا درجے کا ہو پورے ارادے کے ساتھ ہو کم درجے کا نہ ہو۔

معین الدین جینا بڑے: ہاکی کا کھیل تو خاں صاحب آپ اپنی جوانی میں کھیلتے رہے۔

خاں صاحب: جی۔

معین الدین جینا بڑے: اور اب بھی آپ۔

خاں صاحب: دیکھتا ہوں۔

معین الدین جینا بڑے: دیکھتے رہتے ہیں لیکن کوئی ایسا شوق جو اس عمر میں بھی آپ کا ساتھ دے رہا ہو۔

خاں صاحب: میاں دیکھو جو شوق جوانی میں ہوتا ہے جب وہ نہیں ہوا تو اب بڑھاپے کیا شوق ہوں گے؟

معین الدین جینا بڑے: آپ تھیٹر دیکھا کرتے تھے؟

خاں صاحب: جی ہاں! تھیٹر دیکھنے جاتا تھا میرا پسندیدہ تھیٹر .... دور پڑتا تھا۔ وقت بہت صرف ہوتا تھا تو اس لیے جانا چھوڑ دیا۔ لیکن اب بھی اگر تھیٹر دیکھنے کی آسانی ہو تو میں دیکھنا پسند کروں گا۔ دہلی میں ایک آسانی اور رہی۔ بہت اچھے ٹورنامنٹ ہوتے ہیں۔ ہاکی کے، فٹ بال کے، باسکٹ بال کے۔ یہ تینوں میرے پسندیدہ کھیل ہیں۔ جب یہ ٹورنامنٹ ہوتا تھا اس زمانے میں لکھنا پڑھنا چھوٹ جاتا تھا پھر اولیت ان کو دیتا تھا۔ میں اسپورٹس گراونڈ میں ہوتا تھا۔ تو ایسے ہی اگر حالات سازگار ہوتے تو میں ڈرامے کو بھی پابندی سے دیکھتا اس کو پابندی سے دیکھ نہیں پایا کیوں کہ اسپورٹس گراونڈ ہاکی میچ دیکھ کر آیا اس کے بعد نو بجے تک وہاں بیٹھوں تو پھر بڑی مشکل ہو جاتی تھی۔ پھر اپنا کام نہیں ہو پاتا تھا۔ یوں وہ شوق دب گیا۔ مِٹا نہیں ہے دب گیا ہے۔

معین الدین جینا بڑے: فلم بینی کی طرف کبھی آپ راغب ہوئے؟

خاں صاحب: نہیں کبھی نہیں۔کبھی توجہ نہیں ہوئی۔

یونس اگاسکر: اب ایسا کوئی کام جس کو آپ سمجھیں کہ یہ ناتمام رہ گیا ہے اور اسے مجھے ہی پورا کرنا ہے۔

خاں صاحب: سارے کام ناتمام ہیں کام ہوئے کہاں ہیں۔دیکھیے تدوین میرا کچھ دنوں سے خاص موضوع ہے۔آپ یہ بتائیے کہ اُردو میں جتنے بڑے اساتذہ ہیں کسی کا دیوان، غالب کو چھوڑ دیجیے کسی کا دیوان مرتب ہوا ہے۔میؔر خدائے سخن ہیں ان کے کلیات کا کوئی ایک اڈیشن ہے ہمارے پاس، معتبر اڈیشن نہیں ہے۔سوؔدا کا کلیات مرتب ہوا؟ نہیں ہوا۔میر حسن کا کلیات مرتب ہوا؟ نہیں ہوا۔کس کتاب کا تحقیقی اڈیشن ہمارے پاس ہے؟ کسی کا بھی نہیں ہے دو چار کو چھوڑ کر۔میؔر خدائے غزل ہیں اور صحیح متن ہمارے پاس نہیں۔کیسی شرم کی بات ہے۔

اس لیے میری خواہش ہے، تمنا ہے، آرزو ہے اور یہ لفظ میں نے اس لیے استعمال کیے ہیں کہ آرزوئیں کم پوری ہوتی ہیں کہ ممکن حد تک جو اہم کتابیں ہیں ان کے تدوین کے لحاظ سے، اصول تحقیق کے لحاظ سے اچھے اڈیشن مرتب کرسکوں۔جیسے میں نے فسانۂ عجائب، باغ و بہار اور مثنوی گلزارِ نسیم کے اڈیشن مرتب کیے ہیں۔یہ تو بس تمنا ہے اور آرزو ہے اور یہ ناتمام کام کی فہرست ہے پوری۔

پاکستان سے کلیاتِ اقبال آیا۔پاکستان والوں نے اقبال پر بہت اچھی کتابیں لکھی ہیں اور اب تو انھیں رحمت اللہ علیہ بھی بنا دیا ہے، چلیے ہو گیا سب کام۔بہت خوب صورت اڈیشن شائع کیا ہے کلیاتِ اقبال کا اقبال اکیڈمی لاہور نے بہت خوب صورت اڈیشن۔دو اڈیشن آ گئے ہیں اس کے بھی۔میرا خیال ہے اُردو میں اتنی خوب صورت کتاب شاید ہی کوئی چھپی ہو لیکن تدوین کے نقطۂ نظر سے وہ سارے عیب اس میں ہیں جو کسی بھی تجارتی کام میں ہو سکتے ہیں۔یہ صورتِ حال ہے تو سارے کام کرنے کو پڑے ہوئے ہیں۔آرائش پسندی اور آسان پسندی ہمارے کاموں کا اور مزاج کا حصہ بنتی جا رہی ہے تو میری جو آرزو ہے وہ یہی ہے کہ جتنے کام کرسکوں، کرلوں، سب تو کوئی نہیں کرسکتا۔''مثنویاتِ شوق'' ابھی شائع ہوئی ہے۔''سحر البیان'' کی کتابت ہو رہی ہے اور اب اس کے بعد ''قصائد سودا'' یا ''دیوان جعفر زٹلی'' یا کوئی اور کتاب جس کے نسخے پہلے مل جائیں مرتب کرنے کا ارادہ ہے۔

ایک مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی مرکز ہندستان اور پاکستان میں نہیں جہاں کسی اہم متن کے سارے نسخوں کے عکس محفوظ ہوں، کہ جاکے بیٹھ جائیں اور استفادہ کرلیں۔ ترقی اُردو بورڈ نے مجھ سے فرمایش کی، جب شہباز حسین صاحب وہاں ڈی پی او تھے کہ "کلیاتِ میرؔ" کا ایک تحقیقی اڈیشن تیار کردیجیے۔ میں تیار ہوگیا۔ میں نے ان کو خط لکھا اور ایک فہرست دی کہ "کلیاتِ میرؔ" کے اتنے نسخے ہیں، ان کے عکس منگوادیے جائیں، پانچ سال کا وقت مجھے دیا جائے، پانچ سال لگیں گے یہ کام ہوجائے گا۔ ان کا جواب یہ آیا کہ ہمارے یہاں ایسا کوئی شعبہ، ایسی کوئی مد نہیں ہے کہ ہم نسخوں کے عکس منگا سکیں۔ انھوں نے کچھ دن کے بعد "کلیاتِ میرؔ" کا اڈیشن چھاپ دیا۔ مل رہا ہے۔ خرید لیجیے! جی! تو یہ بڑا مسئلہ ہے کہ میں جس متن کو اڈیٹ کرتا ہوں پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ اس کے نسخے کہاں کہاں ہیں اور انھیں حاصل کیسے کیا جائے۔ پھر اب لائبریریوں نے پوری دنیا میں ایک اصول یہ بنالیا ہے کہ کسی مینو اسکرپٹ کا فوٹو اسٹیٹ نہیں دیں گے۔ آپ وہاں جایئے استفادہ کیجیے۔ اس نے کام کو ناممکن کی حد تک مشکل بنادیا ہے۔

یونس اگاسکر: اس میں استثنا تو ہوں گے؟

خاں صاحب: نہیں ہو پاتے ہیں یا پھر آپ کے دنیاوی اثرات اتنے ہوں مثلاً ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، کلکتے سے مجھے ایک متن کے فوٹو اسٹیٹ کی ضرورت تھی۔ میں خود گیا کلکتے۔ متعدد احباب کو لکھا۔ کچھ نہیں بنا۔ حسنِ اتفاق سے ایک ایسے صاحب نکل آئے وہاں جو اُردو کے آدمی تھے۔ اور ان کا وہاں کی سیاسی زندگی میں بہت بڑا حصہ بڑی اہم حقیقت تھی۔ اُن کو خط لکھا، تیسرے دن عکس آ گیا۔ لیکن ایسے لوگ ملیں گے؟ کہاں ملیں گے۔ یہ بہت مشکل ہوگئی ہے۔ میں نے ترقی اُردو بورڈ کے سامنے تجویز بھی پیش کی کہ آپ یہ کرسکتے ہیں کہ ایک ایسا مرکز بنادیں کہ جہاں اہم نسخوں کے عکس ہوں یا یہ ہو کہ اگر کوئی شخص کسی خاص شخص کے کلام کو اڈیٹ کرنا چاہتا ہے مثلاً سوداؔ کو یا میرؔ کو اور وہ شخص آپ کے پاس آئے اور فہرست آپ کے سامنے پیش کرے تو اس فہرست کے نسخوں کے عکس آپ بنوالیں، منگوالیں وہ ملکیت آپ کی رہیں گے۔ استفادہ وہاں بیٹھ کر وہ کرلے۔ وہ بھی نہیں ہوا تو اب یہ کام بہت مشکل ہوگیا ہے۔ اسی لیے مجھے مزید کتابوں کی ترتیب و تدوین غالب کی حسرتِ تعمیر کے مرادف معلوم ہونے لگی ہے۔ خیر جو بھی ہو کام تو کرنا ہی ہے۔

معین الدین جینا بڑے: خاں صاحب یہ جاننا چاہیں گے کہ آپ کے نزدیک آدمی کے مذہبی عقائد اس کے دائرے کار پر کس طرح اثر انداز ہوتے آئے ہیں۔ محقق ہے یا نقاد ہے تو ان کا اثر کیا ہوتا ہے؟

خاں صاحب: اگر کسی شخص کے مذہبی عقیدے اس کی تنقید یا اس کی تحقیق یا اس کی تدوین کے کام پر اثر انداز ہوتے ہیں تو اسے کبھی درست اور اچھا نہیں کہا جا سکتا۔ وہ کام کم رتبہ ہو جائے گا کئی لحاظ سے۔ محقق ہے تو وہ حقائق بدل دے گا بعض دفعہ ان اثرات کے تحت، وہ مدون ہے تو اس کا شدید امکان ہے بل کہ مثالیں موجود ہیں اس کی کہ ایک لفظ یا بعض الفاظ بدل دے جس سے صورتِ حال ہی بدل جائے۔ مذہبی عقیدہ شخصی چیز ہے۔ اُس کو آدمی کی ذات تک محدود رہنا چاہیے۔ اس کے علمی کاموں پر جب اثر انداز ہوگا وہ اور یہاں علمی کاموں سے مراد ہے تحقیق، تنقید اور تدوین جو میرے دائرے میں آتے ہیں تو ان کاموں کا معیار اور مقصود اس کا قوی امکان ہے کہ بگڑ جائے اور عام طور سے بگڑ جاتا ہے۔ یاد رکھیے کہ مذہبی تقاضے مختلف ہوتے ہیں ادبی تقاضوں سے۔

معین الدین جینا بڑے: مذہب شخصیت کی تشکیل میں ایک رول ادا کرتا ہے۔

خاں صاحب: کوئی شک نہیں کر سکتا ہے، کرتا ہے، نہیں کرتا مجھے نہیں معلوم۔ کر سکتا ہے۔

معین الدین جینا بڑے: یوں وہ اس کے دائرۂ کار پر اثر انداز بھی ہو سکتا ہے۔

خاں صاب: ہو بھی سکتا ہے، نہیں بھی ہو سکتا۔ یہی پرکھ ہوتی ہے یہاں پر۔ کہ اچھا محقق وہ ہے کہ اس کی پسند یا پسند، اس کا عقیدہ اس کے سیاسی یا دوسرے خیالات اس کے کام پر اثر انداز ہوں۔ بھئی دیکھیے کہ اگر ایک کتاب کو آپ ایڈٹ کر رہے ہیں جس کا مصنف آپ کے عقیدے کے برخلاف دوسرے عقیدے کا ماننے والا ہے تو آپ اس کے ساتھ اس کا بڑا امکان ہے کہ انصاف نہ کر پائیں اگر آپ کے یہاں ذہنی سطح پر غیر جانب داری موجود نہیں۔ اچھا یہ بتائیے کہ مورخ اگر جانب دار ہو تو کیا وہ تاریخ نگاری کا حق ادا کر سکے گا۔

معین الدین جینا بڑے: ہرگز نہیں۔

خاں صاحب: وہی تحقیق کی بات ہے۔ وہی تنقید کی بات ہے کہ آدمی جانب دار ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ اس اصول کو مانتے ہیں اسلامی ادب کے اصول کو تو غیر اسلامی ادب کے متعلق آپ کی رائے تحقیر

آمیز ہو جائے گی نا اور وہ آپ کے تنقیدی فیصلوں پر اثر انداز ہوگی تو یہ ترقی پسند تحریک میں ہوا ہے؟ یہی ہوا ہے۔ کہ یہ لکھا گیا کہ اصغؔر اور فانیؔ ان دو کے لیے خاص طور پر ایک نے اپنی شاعری کو قنوطیت کا گھن لگا لیا اور ایک کی شاعری بے وقت کی راگنی تھی، درجہ ہی ختم ہو گیا۔ یعنی وہ شاعر جو سماجی افادیت کے نقطۂ نظر پر پوری نہ اُترے وہ کم رتبہ قرار پائی یہ وہی تو صورتِ حال ہے کہ سیاسی عقیدے نے ذہن کو متاثر کر لیا۔ تنقید چوپٹ ہو گئی۔

معین الدین جینا بڑے: خاں صاحب آپ کا جو مدرسے سے ٹریڈ یونین تک کا سفر ہے وہ ایک طرح سے یقین سے تشکیک تک کا سفر ہے اور یہ تشکیک جو ہے علمی شخصیت کا جز تو رہی ہے لیکن شخصی اور نجی اور مذہبی سطح پر یہ سفر آپ کی زندگی پر کس طرح انداز ہوا؟

خاں صاحب: دیکھیے بھائی (رُک کر) دیکھیے بھائی، مدرسے کی تعلیم کے زمانے میں ذہن میں بعض سوالات پیدا ہوتے تھے جن کا جواب نہیں ملتا تھا ایک تو ہم لوگ اپنے اساتذہ سے ڈرتے تھے تو زیادہ سوال پوچھ نہیں سکتے تھے اور ایسا ویسا سوال پوچھتے تو ڈانٹ پڑتی تھی مثلاً ہم شراح وقافیہ پڑھ رہے تھے اس میں ایک جگہ پہ غلاموں کو آزاد فرار کرنے کے احکام آئے۔ تو میں نے بہت ڈرتے ڈرتے دبی زبان سے اپنے اُستاد سے کہا کہ ''غلامی تو اب ہمارے یہاں اب ہوتی نہیں اور شاید ہو گی بھی نہیں تو ان کے احکام ہم کیوں پڑھیں؟'' بہت ناراض ہوئے۔ مطلب یہ کہ سوال تو ذہن میں پیدا ہوتے تھے۔ پتا نہیں ذہن شروع سے ایسا تھا، کیا تھا کہ سوال پیدا ہوتے تھے۔ کنویں کا مسئلہ پڑھ رہے تھے پاک ہونے کا بڑا کنواں ہے اور چھپکلی گر جائے اور ناپاک ہو جائے، تو اتنے ڈول نکال دو تو پاک ہو جائے گا۔ تو اب اُستاد سے تو کہنے کی ہمت تھی نہیں ایک طالب علم ساتھ کے تھے اس سے کہا کہ 'یار یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ پانی تو تھوڑا بہت باقی ہے تو نیا پانی آئے گا تو ملے گا نا اس میں؟''۔ کہنے لگے ''کیا کافروں جیسی باتیں سوچتے ہو؟'' تو ذہن میں استفہام تو ہلکے ہلکے پیدا ہوتے تھے لیکن ان کو روشنی نہیں ملتی تھی اور بڑھاوا نہیں ملتا تھا۔ ٹریڈ یونین میں گئے تو کھلی فضا ملی وہاں۔ اسی لیے میرا اختلاف ہوا مارکسزم سے۔ ورنہ میں مارکسسٹ ہوتا آج۔ میں نے شام کو جو میٹنگ ہوتی تھی اس میں ایک بار پوچھا کہ یہ جو نعرہ ہے، ہم سے لگوایا جاتا ہے کہ ''دنیا کے مزدوروں ایک ہو جاؤ'' لیکن دنیا کے مزدوروں کے مسائل تو ایک جیسے نہیں۔ امریکہ کے کارخانے کا جو مسئلہ ہے وہ ہمارے کارخانے کا نہیں ہے۔ کان پور کے کارخانے کا وہ

مسئلہ نہیں ہے جو شاہ جہاں پور کے کارخانے کا ہے۔تو کوئی شافی جواب نہیں دیا بل کہ کہا ’’ارے یہ تو سرمایہ داروں کے پھیلائے ہوئے خیالات ہیں، کس میں گرفتار ہو گئے تم؟‘‘۔مولوی صاحب جیسے ڈانٹ دیتے تھے یہ دوسرے انداز کی ڈانٹ تھی۔ترقی پسندوں نے بھی اور مارکسسٹوں نے بھی وہی رول ادا کیا ہے جو کٹھ ملاّ ادا کرتا تھا کیوں کہ جواب ان کے پاس تھا نہیں کوئی۔ جہاں میں نے نیاز کی تحریریں پڑھیں تو اچانک وہ سارے سوالیہ نشانات روشن ہو گئے۔ ہاں!اس پر شکر ادا کرتا ہوں خدا کا کہ میرا مطالعہ نیاز کی تحریروں تک محدود نہیں رہا اگر وہیں تک محدود رہتا تو انکارِ محض ہوتا۔حسنِ اتفاق سے تحقیقی ادب اور تحقیقی ذخیرہ جتنا ہمارے یہاں ہے،مولانا عرشی،شیرانی صاحب،قاضی صاحب،ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ان سب کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ شک کا مقصود کیا ہے؟ وہ کب پیدا ہونا چاہیے، کب پیدا ہونا نہیں چاہیے؟ انکار کی طاقت کیا ہے؟اس کا صحیح محلِ استعمال کیا ہے؟یقین کیوں ضروری ہے؟اور کیوں غیر ضروری ہے؟ان سب لفظوں کی تعریف جب معلوم ہوئی جب ان کا محلِ استعمال معلوم ہوا تو ذہن کی تربیت ہوئی اگر تربیت کا یہ عمل نہ ہوتا تو شاید میں تحقیق اور تدوین کے کام کو صحیح طور پر انجام نہ دے سکتا۔یا تو انکار ہوتا یا تشکیک ہوتی یا پھر وہ یقینِ محض ہوتا جو تصوف کے واسطے سے ہندوستان میں پھیلا ہے اور جس نے ذہنوں کو مجہول بنا دیا ہے پوری قوم کے۔

یونس اگاسکر: لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ دلّی کی رہائش یعنی وہاں جو آپ برسوں رہے وہ فضا آپ کو کافی راس بھی آئی۔

خاں صاحب: بہت زیادہ۔پہلی بات تو یہ ہے وہاں معاف کرنا کافی ہاؤس تھا۔

یونس اگاسکر: دیکھیے اس تشکیک کے نتیجے میں بہت سی وہ چیزیں اور روایتیں جو آپ تک پہنچیں وہ آپ نے چھوڑ دیں اور ان چیزوں کو آپ نے اپنایا جن پر قدغن لگ سکتی تھی۔پھر آپ رہے ہاسٹل میں۔ ایک طرح سے نیم مجردسی زندگی بھی رہی۔

خاں صاحب: ذہن کی تطہیر ہوتی رہی۔

یونس اگاسکر: جی۔

خاں صاحب: نئی روشنی بھی ملتی رہی۔

یونس اگاسکر: اور وہ جو سماجی دباؤ ہوتا ہے۔

خاں صاحب: ذہن محفوظ رہا اس سے۔

یونس اگاسکر: روزمرہ کے معاملات میں بھی آپ کو بہت سی رکاوٹوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

خاں صاحب: نہیں ۔ بہت کرنا پڑا۔اس لیے کہ سچ بولنے کی قیمت میں نے بہت چکائی ہے۔ پانچ سال تک کنفرم نہیں ہونے دیا مجھے اس لیے کہ صدر شعبہ ناراض تھے۔ یوں کہ تذکرۂ سدور کی ایڈیٹنگ کے زمانے میں اُن سے اختلاف ہو گیا تھا۔ وہ کام کو جس طرح کرتے تھے۔ علمی انداز ان کا مقصود بھی نہیں تھا ان کا مقصود تو گرانٹ حاصل کرنا ہوتا تھا وہ مرحوم ہو چکے ہیں، کیا کہوں۔ میں نوکری کرنے پر مجبور تھا۔ سوان کے بس میں اور کچھ تھا نہیں۔ انھوں نے پہلے مجھے کنفرم نہیں ہونے دیا۔ پھر ڈاکٹر عابد حسین بیچ میں پڑے تو کنفرم ہوا تو ممکن حد تک جو سب سے کم گریڈ تھا اس کی سفارش کی انھوں نے۔ اس سے نیچے کوئی گریڈ ہو ہی نہیں سکتا ہے کلرک کا گریڈ۔

(سہ ماہی ترسیل، بمبئی، مدیر ڈاکٹر یونس اگاسکر، مشترک شمارہ 21۔22، جنوری تا جون 1999، صفحہ 60 تا 72)

☆☆☆

رشید حسن خاں سے ٹیلی فون پر مکالمہ

حافظ صفوان محمد چوہان (پاکستان)

اب آیئے اُس مکالمے کی طرف جس کا موقع یوں بنا کہ رشید حسن خاں صاحب نے میرے ایک خط کا جواب نہیں دیا۔ ہوا یہ کہ میں نے خاں صاحب کی خدمت میں پندرہ سوالات پر مشتمل ایک سوال نامہ اواخرِ جولائی 2005 میں ایک خط کے ساتھ اِرسال کیا تاکہ اُن کی زندگی اور کاموں کی بابت اپنی جَہالت کو دور کرسکوں اور اُن جیسے عبقری کے زندگی بھر کے تجربات کا نچوڑ اُن کے اپنے الفاظ میں محفوظ کرسکوں۔ اِس مرد ناکارہ پر خاں صاحب کی یہ بہت شفقت تھی کہ وہ میرے خط کا جواب ضرور دیتے تھے، لیکن اب کے اُنھوں نے جواب نہیں دیا۔ میں نے اوائلِ ستمبر میں ٹیلی فون کر کے خط کی وصولی کی بابت اِستفسار کیا تو اُنھوں نے صحت کی خرابی، ہجومِ کار اور دراصل انٹرویو دینے سے کلّی احتراز کی وجہ سے جوابات لکھ کر دینے سے صاف انکار فرمادیا۔ میرے اصرار اور اِس یقین دِہانی پر کہ میں تشہیری انداز میں اخبارات کے اندر اِن جوابات کو شائع بالکل نہیں کراؤں گا، خاں صاحب کچھ نرم پڑے اور فرمایا کہ میں آٹھ-دس روز میں اُنھیں فون کرلوں تو وہ کچھ باتیں بتادیں گے۔ یہ ''عشرۂ انتظار'' میں نے بہت بے صبری میں کاٹا۔ سخن کوتاہ، 17 ستمبر 2005 کو رات دس بج کر دس منٹ پر یہ مکالمہ شروع ہوا۔ تقریباً چالیس منٹ کی اِس گفتگو میں میں نے اُن سے کئی باتیں پوچھیں اور اُن کے جوابات قلم برداشتہ لکھتا رہا۔ ابھی اِس مسودے کو صاف کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ شان الحق حقی صاحب اللہ کے حضور حاضر ہوگئے۔ مخدومی و مطاعی ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی صاحب مدظلہٗ کی جانب سے حقی صاحب پر لکھنے کا حکم ایسا نہیں تھا جسے صرف مؤخر بھی کیا جاسکے۔ اِس سے فراغت ہوتے ہوتے

بحمد اللہ تبلیغ کے سفر میں جانا طے ہوگیا۔ واپسی کو ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ رشید حسن خاں صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اب عجلت میں جو کچھ بن پڑا، پیش کر رہا ہوں۔ مکالمے میں کی کچھ باتوں کا ذکر اِس مضمون میں مختلف مقامات پر ضمناً موجود ہے۔ بقیہ باتوں کو یہاں لکھ رہا ہوں۔

واضح رہے کہ چوں کہ یہ سوالات خاں صاحب کے پاس پہلے سے موجود تھے اِس لیے یہ مکالمہ، سوال جواب کے بجائے، زیادہ تر فی البدیہہ (Extempore) گفتگو کی شکل میں ہوا۔ اِس مکالمے کو کاغذ پر سے اُتارتے ہوئے میری کوشش رہی ہے کہ اِسے جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ ہاں کہیں کہیں کچھ لفظوں کی تکرار سے غیر ضروری اُلجھاؤ کے باعث معمولی سے حذف سے ضرور کام لیا گیا ہے اور چند جملوں اور الفاظ کی حک و تہذیب کی گئی ہے، اِس احتیاط کے ساتھ کہ اُن کے نفسِ مضمون پر زد نہ آئے۔ گفتگو کو تحریر کے سانچے میں بہتر طور پر ڈھالنے کے لیے اوقاف و رموز بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ جن سوالات کے جواب میں خاں صاحب نے فرمایا کہ وہ ''اِس بارے میں لکھ چکے ہیں،'' کو یہاں اختصار کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ جلدی میں لکھنے کی وجہ سے، اور کچھ اِس تبییض کے دورانیے کے لمبا ہوجانے کی وجہ سے، چند الفاظ ضائع ہوگئے۔ الحاقی الفاظ کے شامل ہوجانے کے خدشے سے ایسے الفاظ والے جملوں کو شامل نہیں کیا جارہا ہے۔ اِس بات کا ذکر ضروری ہے کہ مجھے Living Legend لوگوں سے اِس قسم کے مکالمے کرنے کا ذوق ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کے سید نذیر نیازی سے ایک مکالمہ پڑھ کر ہوا۔

خاں صاحب کے اِس مکالمے کی سب سے بڑی خوبی اُن کا بے دغدغہ، دوٹوک اور دبنگ اندازِ بیان ہے؛ یہ اُن کی وہ خاصیت ہے جو اُن کی تمام تحریروں سے بھی ہویدا ہے۔

میرے اِس سوال کے جواب میں کہ آپ تعلیمی مراحل کو باقاعدہ عبور نہ کرنے کے باوجود ادب، اور ادب میں بھی تحقیق اور تدوینِ متن جیسے ایک حد تک بے فیض اور خشک موضوعات کی طرف کیسے آئے اور آپ کو تحقیق کا لازمہ کہاں سے ملا؟ خاں صاحب نے جواب دیا کہ وہ نیاز فتح پوری کی تحریروں سے اِدھر کو متوجہ ہوئے۔ اور اُن کے ذوقِ خطابی کی تربیت میں حافظ محمود خاں شیرانی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود وغیرہ کی کتب کے مطالعے نے مہمیز لگائی۔

اِس سوال کے جواب میں کہ اِملا کے مسائل جوں کے توں کیوں ہیں اور اِتنے زیادہ لوگوں کے علمی مضامین شائع ہونے کے بعد بھی جب شائع شدہ مواد میں رنگ برنگا اِملا ہی نظر آتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے اِس سلسلے میں کبھی کوئی محنت ہوئی ہی نہیں، خاں صاحب نے فرمایا کہ اِن موضوعات پر لکھنے والوں نے اِملا کے مسائل کو رسم الخط کے مسائل سے خلطِ مبحث کر دیا۔ میرے اِس ضمنی سوال پر کہ مجھے مختصر اُبتا دیجیے کہ اِملا اور رسم الخط میں کیا فرق ہے، اُنھوں نے فرمایا کہ یوں سمجھیے کہ اِملا پھول کے مانند ہے اور رسم الخط اِس کے رنگ اور خوشبو کی مثال ہے۔ پھول نہ ہوگا تو نہ اِس کے رنگ کا کوئی سوال ہوگا اور نہ خوشبو کا ٹھکانہ۔ رسم الخط میں تبدیلی ضرورتوں کے مطابق ہوتی ہے جیسے مثلاً نستعلیق ہاتھ کی لکھائی میں اور نسخ ٹائپ رائٹر پر استعمال ہوتے ہیں۔ اور ایسے ہی پہلے خطِ شکستہ دفتری استعمال میں آتا تھا۔ اب تو کمپیوٹر پر بھی نستعلیق لکھی جانے لگی ہے۔

اُردو کے اِملا ہی کے بارے ایک چبھتا ہوا سوال یہ تھا کہ اب جب کہ اُردو کی اپنی موجودگی پر ہی سوالیہ نشان لگنا شروع ہو رہا ہے، وہاں زبان اور بالخصوص رسم الخط کو مشکل بنا دینے سے کیا بُعد اور تنفّر میں اضافہ نہیں ہوگا؟ خاں صاحب کے بڑے رسان سے کہا کہ وہ اُردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔

میرا اگلا سوال اُن کے اندازِ تنقید کے بارے میں تھا۔ عرض کیا کہ آپ کی شہرت علی العموم صرف منفی اندازِ نظر اور اغلاط گیری کے عناوین سے ہے۔ اِس کی کیا وجہ ہے؟ ''تباہ'' ایسا مرغوب لفظ ہے جو آپ کے تقریباً ہر مقالے میں ملتا ہے، مثلاً کلیاتِ اقبال کے موجود نسخوں کو بھی آپ متن کے اعتبار سے ''تباہ'' کہتے ہیں اور کلاں اُردو لغت بھی ہر لحاظ سے آپ کے حساب میں ''تباہ'' ہے۔ خاں صاحب نے جواب دیا کہ لوگ صرف تعریف سننے کے عادی ہیں اور ایسے لوگ بہت کم ہیں جو علمی اختلاف کو خندہ پیشانی سے قبول کریں۔ کسی نے تدوینِ متن کا کام کیا اور معلومات جمع کیں تو اِسے تعمیری تحقیق کا نام دیتے ہیں؛ اور اگر کوئی اِس تحقیق میں رہ جانے والی خامیاں گِنا دے تو اِسے تخریبی تحقیق کہتے ہیں۔ تحقیق کا مقصد حقیقت کی دریافت ہے۔ بے لاگ احتساب نے ہمیشہ بہت مفید کام انجام دیا ہے۔ جہاں کسی شخصیت کا سحر ٹوٹا، وہاں اب شخصیت کے بجائے کام کو دیکھا جاتا ہے۔ اغلاط کی نشان دہی میں کسی بڑے نام سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ضروری ہے کہ اغلاط کی نشان دِہی میں تمسخر کا انداز نہ ہو۔ غلطی ہر ایک سے ہو سکتی ہے۔ تحقیق کی شریعت میں ذاتی تعلقات اور علمی اختلافات کے خانے

علاحدہ علاحدہ ہیں اور اِن میں کے ایک کو دوسرے پر اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہیے، اور اشتعال خواہ کتنا ہی شدید ہو، تحریر میں شرافت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔ دھیمے انداز اور دل سوزی کے ساتھ توجہ دِلائی جائے تو اصلاح ہوگی لیکن اگر تحقیقی بحث میں ذاتی حملے کیے جائیں گے تو اعتراض کا مدعا خبط ہو جائے گا۔

تنقید اور اِس کے آداب کے بارے میں میں نے سوال کیا کہ کسی فن پارے پر تنقید یا اُس کی پرکھ کے بارے میں ایک رویہ تو حافظ محمود خاں شیرانی کا ہے یعنی کسی تحریر پر اعتراض سے پہلے اُس میں موجود کمال کی تعریف کرنا اور پھر بانگِ گل کی سی نرمی سے اعتراض کرنا؛ ایک انداز قاضی عبدالودود صاحب کا ہے جو نہ تو نرم گوئی کے قائل تھے بل کہ تحریر میں طنز و تعریض سے مملو تھے اور پوستین دری میں طاق؛ ایک انداز علامہ شبلی نعمانی کا ہے یعنی اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ جن شخصیات کے ادبی کاموں کے بارے میں اُنھوں نے رائے دی ہے اُن میں باہم فرقِ مراتب کیا بنتا ہے، جب کہ ایک انداز مظفر علی سید صاحب کا ہے کہ اُن کی تحریروں سے ادب کی زوال آمادگی ہی کی واضح تصویر سامنے آتی ہے۔ اِس بارے میں اُن کی رائے کیا ہے، یعنی تنقید میں کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟ خاں صاحب کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کا سوال تین چیزوں کے بارے میں ہے: تنقید، تحقیق اور تدوین۔ یہ الگ الگ چیزیں ہیں اور ادب کے مستقل موضوعات۔ تنقید اور تحقیق کے لوگ مختلف ہیں۔ جیسے مثلاً مولوی عبدالحق نے کئی متن تیار کیے جب کہ وہ تنقید کے آدمی نہیں ہیں اِسی طرح حافظ محمود خاں شیرانی، مالک رام، نثار احمد فاروقی اور مولانا امتیاز علی عرشی وغیرہ نے بہت پائے کے متون ترتیب دیے لیکن اِن سب کا فنِ تنقید میں کوئی اہم مقام نہیں ہے۔ جہاں تک تحقیق اور تدوین کا تعلق ہے، اِن دونوں فنون کی حدیں کہیں کہیں مل ضرور جاتی ہیں۔ لوگ عام طور سے تدوین کو تحقیق کا ایک جز سمجھتے ہیں۔ یہ درست نہیں ہے۔ صورتِ حال اِس سے یکسر مختلف ہے، یعنی تدوینِ متن کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ آدابِ تحقیق سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ تحقیق کا آدمی متن کی معیاری تدوین بھی کر سکے، یہ ضروری نہیں۔

رشید حسن خاں صاحب کی زبانی تحقیق اور تدوین کے الگ الگ فنون ہونے کا علم ہونے پر میں نے جلدی میں ایک سوال یہ گھڑا کہ چلیے تدوینِ متن تو صرف اُن لوگوں کا کام ہوا جو تحقیق کے پانیوں میں شانوں تک اُترے ہوئے ہوں۔ آپ اُن نوواردوں کے لیے چند موضوعاتِ تحقیق بتایئے جو

تحقیق کی منزل مارنے کے بعد بالآخر تدوینِ متون کے جولان گاہ میں دل و دماغ کی صلاحیتوں کے جھونک دینے کو مقصود بنائے ہوئے ہیں، یا بہ الفاظِ دیگر، یہ بتایئے کہ ادب کے لوگوں میں نئے رشید حسن خاں کیسے پیدا ہو سکتے ہیں؟ اُنھوں نے جواب میں فرمایا کہ یہ سوال آپ کے لکھ کر بھیجے ہوئے سوالات میں شامل نہیں ہے۔ پھر فرمایا کہ ابتدا میں تو کسی تذکرے، داستان یا شاعری یا کسی انجمن یا اِدارے وغیرہ پر تحقیق سے کام کا آغاز کیا جائے۔ ادبی محققین کی علمی مدد کے لیے لکھی گئی حوالہ جاتی کتابوں پر کام کیا جائے اور کسی ایسی پرانی کتاب میں اشاعت سے لے کر آج تک کیے گئے کاموں کے حوالوں کا اضافہ کیا جائے۔ اِس سے تحقیق و تدوین کا صحیح مزاج بنے گا۔ ایک کام بین العلومی موضوعات کا ہے، یعنی وہ لوگ جو بنیادی طور پر اُردو کے لوگ ہیں لیکن کسی اور علم یا فن میں بھی دسترس رکھتے ہیں وہ متداول ادبی موضوعات سے آگے نکلیں اور ادب کا رشتہ دوسرے علوم وفنون سے استوار کریں۔ پھر کچھ کام ہیں جو ادب اور لسانیات دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ادب اور لسانیات بھی دو بالکل الگ الگ موضوعات ہیں لیکن ادبی تخلیقات سے متعلق لسانی مطالعہ صرف ادب کے لوگ ہی کر پائیں گے۔

اِسی ذیل میں ایک مختصر سوال یہ تھا کہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے رہ نما کتابوں کے نام بتا دیجیے۔ جواب ملا کہ ڈاکٹر سلطانہ بخش کی کتابیں اور ڈاکٹر گیان چند کی کتاب تحقیق کا فن۔

ایک سوال یہ تھا کہ ایسے قدیم متن جو آب رسیدگی یا کرم خوردگی کی وجہ سے جگہ جگہ سے ضائع ہو گئے ہیں، جیسے کہ اکثر ہوتا ہے، اُن پر کام کرتے ہوئے مدوّنِ متن اپنی جانب سے اِضافے کس حد تک کرے۔ جواب ملا کہ تدوینِ متن میں قیاس کا دائرہ اِتنا وسیع نہ کیا جانا چاہیے کہ اصل متن، مرتب کے کام کا تابعِ مہمل معلوم ہونے لگے۔

اِسی سوال کا ایک ذیلی سوال یہ تھا کہ تدوینِ متن میں اِملا زمانۂ تحریر کا یعنی جوں کا توں رکھا جائے یا جدید اِملا استعمال کیا جائے، کیوں کہ اِسے پڑھا تو آج اور آج کے بعد کے زمانے میں جائے گا۔ خاں صاحب نے فرمایا کہ قدیم متن اور مخطوطے مصنفین کے ہاتھوں سے لکھے تو بہت ہی کم دست یاب ہیں اور زیادہ تر کاتبوں ہی کی روش میں لکھے ملتے ہیں اِس لیے متن میں مصنف کی منشا کو سمجھنا چاہیے۔ لیکن اگر ہمیں کسی قابلِ اعتبار ذریعے سے کسی مصنف کے کسی خاص اِملا کو اختیار کرنے کا علم ہو جاتا ہے، جیسے مثلاً غالب کے خطوط کے ذریعے سے کچھ الفاظ کے مخصوص اِملا کا علم ہوتا ہے، تو ایسی

صورت میں معاملہ مختلف ہو جاتا ہے۔ایسی صورت میں تقلید مصنف کے مختارات ہی کی کرنی چاہیے۔ لیکن جن مصنفین کی خطی تحریریں ناپید ہیں یا جن کے مختارات سے ہم لوگ لاعلم ہیں اُن کے متون مرتّب کرتے وقت اُن کے زمانے کے باقی لکھنے والوں کی روش برقرار رکھی جانی چاہیے۔

میں نے اپنے اِس سوال کو اِن الفاظ میں دوہرایا کہ عام قاری صرف موجودہ رسم الخط سے مانوس ہے۔اُن مصنفین کا اِملا اُن کے وقتوں کے لیے تھا، ہمارا اِملا ہمارے دور کے لیے ہے۔بل کہ مدوّنِ متن کو تو الفاظ کے ہجا کے ساتھ ساتھ آج ہمارے رواج میں آنے والی علاماتِ اوقاف و موز بھی استعمال کرنی چاہییں تا کہ پرانے متن آج عمومی فائدہ دے سکیں۔ ہر تحریر، خواہ وہ شاہ ولی اللہ یا غالب ہی کی کیوں نہ ہو، مروّجہ جدید اِملا ہی میں لکھی جانی چاہیے ورنہ یہ ترتیب دادہ متن صرف خواص کے استعمال کی چیز ہوگا، عوام کے لیے اِس میں دلچسپی کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ یہ تو صرف ایسا ہی ہوگا کہ آپ نے ایک قدیم چیز کو نئے کاغذ پر لکھ دیا۔اِس بات کو بھی وزن دینا چاہیے کہ اگر یہ مصنفین آج لکھتے تو کون سا اِملا استعمال کرتے؟ اِس بحث نما سوال جواب کے بعد بھی خاں صاحب قدیم متون کو مروّجہ اِملا میں لکھنے کے بارے میں اپنے موقف پر قائم رہے اور اپنے موقف کی حمایت میں مثالیں دیتے رہے۔البتہ یہ فرمایا کہ کچھ صورتوں میں ایسا کیا جا سکتا ہے کہ ایک فہرست ابتدائیے میں دے دی جائے جس میں اِس کی گئی تبدیلی کا ذکر ہو۔

اِس موضوع کا ایک ضمنی سوال یہ تھا کہ آپ نے غالب کے متن میں چند خاص الفاظ میں اِملاے غالب کی پیروی کرنے کا کہا ہے۔کیا یہ اُصول اختیار کرنا کہ مصنف کا خصوصی اِملا برقرار رکھا جائے، اِملا و ہجا کا ایک گلدستہ تیار نہیں کر دیتا اور کیا اِس سے اِملا میں شتر گربگی پیدا نہیں ہوتی؛ اور کیا یہ چھوٹ (License) خلفشار کا سبب نہیں بنتی؟ اور جب اِس چھوٹ دینے کی وجہ سے کسی لفظ کے ایک متوازی اِملا کی گنجایش بنا دی جاتی ہے تو یہ فائدہ اُٹھانے سے باقی اُردو لکھنے والے کیوں محروم رہیں، یعنی عیسیٰ بہ دینِ خود، موسیٰ بہ دینِ خود کے مصداق جس طرح چاہیں لکھتے رہیں؟ اور اگر غالب کے اِملا میں کوئی تقدیس ہے تو یہ صرف چند الفاظ تک کیوں محدود رکھی جائے۔تقلید کی منطقی مانگ تو یہ ہے کہ غالب کے اِملا کی سو فی صد پیروی کی جائے، یعنی متن سے وفاداری کا پورا حق ادا کرنے کے لیے کتابت کی جملہ فرسودگیوں کو بھی من و عن نقل کیا جائے۔کیا آج کے مصروف ترین دور میں عام آدمی کو تو چھوڑیے، کسی

محقق کے پاس بھی اِتنا وقت ہے کہ ہر کتاب کو پڑھنے سے پہلے اُس میں استعمال کیے گئے مخصوص اِملا کی روِش کو سیکھے؟ بہر حال، خاں صاحب نے اِس سوال کا، جو زیادہ تر اُن کے اپنے اُسلوبِ تحقیق پر اعتراض ہے، جواب ایک طرح سے محفوظ ہی رکھا۔

ایک سوال یہ تھا کہ آپ کی مجوزہ اصلاحاتِ اِملا و قواعد کو، آپ کے مستقل چھپنے والے Supporting (تائیدی) مضامین کے ہوتے ہوئے بھی وہ پذیرائی نہ خواص میں ملی نہ عوام میں جن کی یہ بجا طور پر مستحق تھیں، اور آپ پر شدید اعتراضات بھی ہوئے جن میں سے کچھ کا علمی پایہ بھی بہت مضبوط ہے۔ یوں یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ مستقبل میں اِن اصلاحات کو کیا مقام ملے گا۔ اِس ناقدری اور عمومی بے توجہی پر آپ کے کیا احساسات ہیں؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ وہ اُردو ادب و تحقیق پر کیے گئے اپنے کام سے بالکل مطمئن ہیں اور اُنھیں اُمید ہے کہ اُن کے بالخصوص کلاسیکی ادب کے متن پر کیے ہوئے کام ایسے نہیں ہیں جن کی زندگی کا دورانیہ مختصر ہو۔

میرا اگلا سوال تھا کہ تحقیقی کام کا اُسلوبِ نگارش کیسا ہونا چاہیے: شگفتہ، سادہ یا عالمانہ؟ اور کیا اُردو میں دانش وری کی روایت کے استوار ہونے میں اُسلوب کو کوئی دخل ہے؟ خاں صاحب نے جواب دیا کہ اِن تینوں اسالیب کا مناسب امتزاج ہونا چاہیے لیکن بنیادی توجہ پیش کی جانے والی معلومات کی درستی پر رہے۔ انشا پردازی یا افسانہ طرازی نہیں ہونی چاہیے یعنی نہ تو مولانا ابوالکلام آزاد والی عبارت آرائی ہو اور نہ جوش والی لفاظی، لیکن بالکل بے رس بھی نہ ہو۔ اُردو میں تنقید و تحقیق کی روایت اِس لیے بھی مضبوط نہیں ہے کہ تحقیق کے نام پر لکھے گئے تذکرے زبان و بیان اور قدرتِ کلام کے مرقعے بن کر رہ گئے ہیں۔

اگلا سوال یہ تھا کہ میں نے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے لغاتِ روزمرہ (اشاعتِ اوّل: 2003) میں پہلی مرتبہ ایک ''بدعت'' دیکھی ہے، کہ اِس میں متن میں حوالے کے طور پر صفحات کے جو نمبر دیے گئے ہیں وہ دائیں سے بائیں لکھے گئے ہیں، یعنی مثلاً صفحہ نمبر ۵۰۰ کو ۰۰۵ اور صفحہ نمبر ۱۵۸۰ کو ۰۸۵۱ لکھا گیا ہے، علیٰ ہٰذا۔ جب کہ اِس کتاب کے اپنے صفحات کے نمبر مروّجہ متداول ترتیب (بائیں سے دائیں) میں لکھے گئے ہیں۔ میں نے اب سے پہلے ایسا کیا ہوا کہیں نہیں دیکھا، اِسی لیے اِسے ''بدعت'' کہا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اِس کام کے لیے اُکسایا کس نے دیا۔ کیا آپ حوالے

کے صفحات کے نمبر لگانے کی اِس ''غریب'' ترتیب کی، جو اِس کتاب کے ہر پڑھنے والے کو صریحاً کوفت میں مبتلا کر دیتی ہے اور تدوین و تحقیق کے پہلے سے ہی مشکل کام کو ایک اور الجھن اور بے برکتی کی پخ لگا دیتی ہے، حمایت کرتے ہیں؟ خاں صاحب نے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اور ڈاکٹر خلیق انجم کے بارے میں بہت بلند الفاظ کہے لیکن سوال کا جواب بہر حال ٹال دیا۔ (یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ لغاتِ روزمرہ میرے مستقل استعمال میں رہتا ہے۔ میرے خیال میں جو شخص بھی ایک بار اِسے استعمال کرنا شروع کر دے گا، اِسے کبھی نہ چھوڑ سکے گا۔ شان الحق حقی صاحب کے فرہنگِ تلفظ کے بعد یہی لغت ہے جو مجھے سب سے زیادہ کھولنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ زبان کو نکھارنے والے اِس لغت کو مرتب کر کے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے بہت بڑا احسان کیا ہے؛ یہ اُن لغات میں سے ہے جن کی ضرورت دائمی ہے اور عام قاری سے لے کر اساتذۂ ادب تک کسی کو اِس سے اِستغنا نہیں۔)

اُردو لغت بورڈ کراچی کے کلاں اُردو لغت کے بارے میں میرا سوال تھا کہ اِس کی نئی یعنی ۲۰ویں جلد کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ جواب عطا ہوا کہ جو اسناد فراہم کی گئی ہیں وہ تعداد میں کم ہیں لیکن غنیمت ہے کہ اب یہ اسناد نسبتاً معتبر ہیں۔ صحتِ اِملا پر توجہ دی جانے لگی ہے۔ کمپیوٹر پر کمپوزکاری کی وجہ سے پچھلی جلدوں کے مقابلے میں اِس جلد کی طباعت بھی بہتر ہے۔

میں نے کچھ سوالات مولانا ابوالکلام آزاد پر خاں صاحب کے تنقیدی مقالے مولانا آزاد کا اُسلوب کے بارے میں کیے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ آپ کے نزدیک الہلال اور البلاغ کے ذریعے سے مولانا نے صرف اپنے امام الہند بننے کے مقصد کو پالا پوسا ہے، لیکن اِن جریدوں سے مسلمانوں میں ایک عمومی ادبی بیداری بھی تو پیدا ہوئی۔ اِس Contribution کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ خاں صاحب نے ارشاد فرمایا کہ شعلہ مزاجی اور بے پناہ جذباتیت کا حامل مسلمان معاشرہ کھوکھلی جذباتیت میں اور زیادہ ڈوب گیا۔ مولانا کے مشتعل اندازِ نگارش نے مسلمانوں میں اُس شدید جذباتیت کو فروغ بخشا جو بنیادی طور پر عقل دشمن ہوتی ہے اور مستقبل کو حال کے آئینے میں دیکھنے سے آنکھیں چراتی رہتی ہے۔ اُن کی اِس زمانے کی پر زور تحریریں پڑھنے والوں کے دلوں کو گرما دیتی تھیں اور روح کو تڑپا دیتی تھیں، لیکن جذباتیت سے بھرے ہوئے بیانات ذہنوں میں پیدا ہونے والے ہر طرح کے سوالات کو گہری نیند سلا دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اگلا سوال یہ تھا کہ غبارِ خاطر ایک زندہ رہنے والی

کتاب ہے؛ اِس کے اُسلوب کے بارے میں آپ کی کیا راے ہے؟ جواب ملا کہ غبارِ خاطر میں مخاطبین کو مرعوب کرنے اور علمی خودنمائی کا جذبہ ہے نہ کہ خطوں والی بے تکلفی اور مکتوباتی نثر۔ تاریخ میں ایسے خطوط کبھی نہیں لکھے گئے۔ یہ خطوط نہیں، خطبات ہیں۔ اگلا سوال تھا کہ مولانا کی سوانح، تذکرہ، کی علمی وادبی حیثیت اور اُسلوبِ تحریر کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ ارشاد ہوا کہ یہ کہنے کو ایک سوانحی کتاب ہے مگر سوا تین سو صفحات میں سوانحی مواد کی مقدار شاید دو تین صفحات سے آگے نہیں بڑھتی۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر فقہ و تفسیر اور منطق و فلسفے کے غیر متعلق مباحث لائے گئے ہیں جنھیں مشکل ترین زبان میں لکھا گیا ہے۔ تذکرے کے مخاطب علماے کرام تھے، کہ اُنھی کے ذہنوں پر امام الہند کی افضلیت کا نقش بٹھانا مقصود تھا۔ یہ سوانح عام لوگوں کے لیے لکھی ہی نہیں گئی۔ مولانا نے جس طرح زندگی بھر اپنے آپ کو عوام سے دور رکھا، اُسی طرح اپنے حالاتِ زندگی کو بھی روشنی میں نہیں آنے دیا۔ اِس میں شک نہیں کہ مولانا ایک صاحبِ طرز نثر نگار تھے اور اُن کے منفرد طرزِ نگارش کی بدولت اُن کے قلم سے نفیس ترین ترکیبیں نکلی ہیں، مگر اِن کی کثرت نے عبارتوں کو بطورِ عموم بوجھل بنا دیا ہے۔ بات معمولی، بیان غیر معمولی۔ بہت سے زیور لاد دینا دولت مندی کی پہچان تو ہو سکتی ہے، مگر خوش ذوقی پر بھی حرف آ سکتا ہے۔ سوانح میں مولانا کا طرزِ بیان داستانی ہے، جس نے سوانح نگاری کی زبان اور بیان دونوں کو تباہ کر دیا ہے۔ اگلا سوال ترجمان القرآن کی ادبی حیثیت، اِنشا اور بناوٹ کے بارے میں تھا۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ قرآنی آیات کے ترجمے کی حد تک سادگی موجود ہے لیکن تفسیری مباحث طول کلامی اور مرصع کاری سے محفوظ نہیں رہے۔ یہ خالص مذہبی تحریر ہے اور موضوع ایسا ہے جس میں انشا پردازی کی نہیں ہوتی لیکن خطابت کے مولانا کی طبیعت کا جُز ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں ابہام اور اکثر مقامات پر عبارت آرائی در آئی ہے۔ میں نے ضمناً سوال کیا کہ آپ کے نزدیک مولانا کی اِس زمانے کی تحریروں کے نسبتہً سادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اِس زمانے میں مسلم قیادت کے جویا نہیں رہے تھے جس کا راستہ مذہب کے کوچے سے ہو کر نکلتا تھا، بل کہ اِس وقت میں وہ عمومی قیادت کے راستے پر گام زن تھے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے حزب اللہ، امام الہند اور تحریکِ خلافت جیسے سارے مقامات سے دامن جھٹک کر الگ کھڑے ہو جانے کی وجہ سے اب ترجمان القرآن کی تکمیل میں مولانا کو کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی؟ خاں صاحب نے فرمایا کہ آپ کا اندازہ بالکل درست ہے؛ اور مولانا نے باوجود اپنی قد آور علمی شخصیت کے،

تاریخ، فلسفے، علم الکلام یا کسی اہم موضوع پر کوئی مستقل تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی۔ اگلا سوال یہ تھا کہ مولانا کی تحریروں نے آیندہ نسل پر کیا اثرات ڈالے؟ جواب ملا کہ خطابت اور تحکّمانہ انداز میں گفتگو؛ ابہام؛ عبارت آرائی؛ بات کو باربار دوہرانا؛ بے مغز بات پر صفحات کے صفحات بل کہ کتابیں لکھ دینا (خاں صاحب نے کئی لوگوں کی نام بہ نام مثالیں بھی دیں)۔ زبان کو سادگی و صفائی کے لحاظ سے سرسید اور اُن کے رفقا جس سطح پر لے آئے تھے اور اُردو نثر کو جس منطقی طرزِ استدلال، وضاحتِ بیان اور علمی انداز سے روشناس کرایا تھا، وہ کم و بیش پچیس تیس سال کے لیے ایک بھولا ہوا سبق بن گیا؛ مولانا آزاد نے اپنے اُسلوب سے اُردو زبان کو سرسید کے زمانے سے پیچھے پہنچادیا۔ خاں صاحب کی اِس بات پر میں نے سوال گھڑا کہ اُردو کی تاریخ میں مختصراً ایک شاعر اور ایک نثر نگار کا نام لیا جائے تو اقبال اور مولانا آزاد ہی کا نام لیا جائے گا۔ اُردو میں اگر سرسید کی زبان پر Full-stop لگالیا جائے اور یہ فرض کرلیا جائے کہ زبان اپنی معراج کو پاچکی ہے۔ حالاں کہ سرسید جیسے تعلیم کے بے چون نقیب کا مقصود یہ ہرگز نہ تھا۔ تو جنابِ مختار مسعود اور مشتاق احمد یوسفی صاحب، جن کے نام سے ہمارے عہد کو بجا طور پر موسوم کیا گیا ہے، کی لکھی من بھاونی نثر کو آپ کیا مقام دیں گے؟ خاں صاحب جواب میں طرح دے گئے۔ میں نے اگلا سوال کیا کہ عربی اور فارسی کے بغیر اُردو تو چھوڑیے، ہندی بھی نہیں چل سکتی۔ آزاد نے جو لکھا، اپنی علمیت اور ماحول کے مطابق لکھا۔ اپنے مقالے میں آپ جیسے عالم آدمی کو مولانا کی نثر کے اِس پہلو کو ضرور Endorse کرنا چاہیے تھا، کیوں کہ اُن کی ذات ہماری علمی عظمت اور ثقافت کا ایک نادر مجموعہ تھی۔ خاں صاحب اِس سوال کا جواب بھی ٹال گئے اور فرمایا کہ یہ سوال آپ کے لکھ کر بھیجے ہوئے سوالات میں شامل نہیں ہے۔

[مولانا آزاد کے حوالے سے یہ سوالات پوچھے جانے کا اصل میں ایک پس منظر تھا۔ مقالۂ مذکور پڑھنے کے بعد میں بری طرح ''چونکا'' ہوا تھا، اور اپنے تأثر کو ''گاڑھا'' یا ''پتلا'' کرنے کے لیے پہلی نظر محبی سید ذوالکفل بخاری ہی کی طرف اُٹھی۔ ایسے مواقع پر اُن کے دوٹوک محاکمے، جنھیں میں Rulings کہا کرتا ہوں، ہمیشہ ہی کارِتریاقی (Antidote) کیا کرتے ہیں۔ موصوف نے چھوٹتے ہی کہا: آپ کو معلوم ہے، تاج محل کی تعمیر پر شاہ جہاں کو کس قدر برا بھلا کہا گیا ہے؟ ساحر لدھیانوی کی غزل تو گویا حرفِ آخر ہے۔ لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ایک بزرگ کے قولِ فیصل نے اِن سب

غباروں سے کیوں کر ہوا نکال دی تھی۔ ایک یادگار جملہ، کہ: ''شاہ جہاں، تاج محل نہ بنواتا تو کیا بڈھو کا آوا بنواتا؟'' سو آپ ہی بتلائیے کہ ابوالکلامؒ غبارِ خاطر اور ترجمان القرآن نہ لکھتے تو کیا زٹل نامہ تصنیف فرماتے؟''پیرومرشد'' سے یہ خوراک (Dose) لینے کے بعد، ضروری ہو گیا تھا کہ خاں صاحب سے بارِ دگر کچھ سنوں، سو یہ سوالات کیے گئے۔]

چند ذیلی سوالات پر مشتمل ایک سوال کلامِ اقبال کی تدوین سے متعلق تھا۔ اِس ''بیش رسیدہ'' موضوع پر میں اُن سے خط کتابت کے ذریعے سے بھی اور فون پر بھی پہلے کئی بار باتیں کر چکا تھا۔ اِس موقع پر میں نے دریافت کیا کہ آپ کے زیرِ بحث مقالے میں کلامِ اقبال کی تدوین کے اتنے باریک اور پہلودار عنوانات گنائے گئے ہیں کہ جن کی محض خاکہ سازی بھی مدتِ مدید کا کام لگتی ہے۔ اگر چہ اقبال کا کلام مقدار میں بھی کم نہیں ہے لیکن آپ کی ہدایات کی روشنی میں دِکھتا یہی ہے کہ اِس صورت میں اصل زر سے بیاج بہت بڑھ جائے گا۔ اور جب اِن آداب کے ساتھ کام شروع کیا جائے گا تو مدوّنینِ متن کی ایک مستقل جماعت شاید عمرِ ابد میں ہی اِسے انجام دے پائے گی۔ کیا آپ کے خیال میں یہ کام آپ کی خواہش کردہ ترتیب پر کبھی شروع ہو پائے گا؟ میں ایک سرکاری محکمے میں انتظامیہ کا حصہ ہونے کی وجہ سے اِس حقیقت کو جانتا ہوں کہ اتنی زیادہ باریکیاں صرف اُسی کام کے لیے مخصوص کی جاتی ہیں جسے بالکل نہ کرنے ارادہ ہو۔ جواب میں خاں صاحب نے کلامِ اقبال کی تدوین کے سلسلے میں اپنے مجوزہ طریقِ کار کی قدرے تفصیل سے وضاحت کی (یہ باتیں مذکورہ مقالے میں موجود ہیں اِس لیے اِن کا یہاں ذکر طوالت کا سبب ہوگا) اور فرمایا کہ وہ اقبال کے کلام کے شایانِ شان اِسے مرتب کیا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اِس مقالے کو لکھے تیرہ چودہ سال ہو چکے ہیں۔ تدوین میں جس گہرائی، نزاکتوں اور لطافت کی آپ بات کرتے ہیں اور کلامِ اقبال کی تدوین کی جو سطح آپ چاہتے ہیں، چاہیے تو یہ تھا کہ اِس لمبے عرصے میں آپ اپنی صلاحیتوں کو اپنے پہلے سے مدوّن کیے ہوئے متون کی از سرِ نو تدوین کرنے میں کھپانے کے بجائے خود ہی اِس کام کو کر لیتے۔ کلاسیکی ادب کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن میری ادنیٰ رائے میں مثنویوں اور افسانوں کی کلاسیکی حیثیت کلامِ اقبال جیسے کلاسیک کے مقابلے میں بہر حال ثانوی ہے: We'd do first things first! خاں صاحب نے جواب دیا کہ سچ کہتا ہوں کہ اِس میں میرا قصور کم سے کم ہے۔ سارا کیا دھرا میری خرابیِ صحت کا ہے۔ دوسرے حملۂ

قلب کے بعد سے یہ احوال ہوگیا ہے کہ اچانک قلب کی رفتار بگڑ جایا کرتی ہے۔ ڈاکٹر نے سختی کے ساتھ گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی ہے۔ مدّ و جزر کا سا عالم رہتا ہے؛ آج ٹھیک، کل خراب۔ بعض دفعہ یہ وقفۂ خرابی بڑھ جایا کرتا ہے۔ میں بہت مصروف ہونے اور بیمار ہونے کی وجہ سے اپنے اندر کوئی نیا کام کرنے کا حوصلہ نہیں پاتا۔

میں نے مشفق خواجہ صاحب پر لکھے اپنے مُحَوّلۂ بالا مضمون میں اِس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ مجھ سے کن الفاظ میں مرحوم خواجہ صاحب اور جنابِ مختار مسعود نے رشید حسن خاں صاحب کے مرتب کردہ زٹل نامہ کے بارے میں اپنے اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا؛ اور خاں صاحب کے خواجہ صاحب جیسے مدّاح بھی اُن کے اپنی صلاحیتوں کے اِس نازل درجے کے کام میں صَرف کرنے پر کبیدہ ہوئے تھے۔ اِس تناظر میں خاں صاحب سے میرا آخری سوال یہ تھا کہ آپ نے جعفر زٹلی کے کلام کی تدوین آخر کیا سوچ کر کی؟ جواب میں وہ طرح دے گئے۔ میں نے پیچھا نہ چھوڑا اور سوال کو اُلٹا کر پھر پوچھا کہ کیا اِس متن کی تدوین سے آپ اُردو کی ''کلاسیکی چرکینیت'' کو محفوظ کرنا چاہتے تھے؟ فرمایا کہ یوں ہی سمجھ لیجیے۔

نوٹ : حافظ صفوان محمد چوہان کے طویل مضمون ''رشید حسن خاں صاحب اور عصری دانش کی مشارکت'' سے ماخوذ۔ یہ مضمون ''مخزن'' لاہور کے شمارہ مسلسل 11، جلد 6، شمارہ 1، اشاعت 2006، صفحہ 35 تا 54 پر شائع ہوا۔ دراصل یہ مضمون تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ، اصلاحِ املا و قواعد پر مشتمل، دوسرا حصہ رشید حسن خاں اور حافظ صفوان محمد چوہان کے درمیان ہوئی خط و کتابت پر مشتمل اور تیسرا حصے میں مضمون نگار کا ٹیلی فون پر لیا گیا انٹرویو شامل ہے۔ دراصل حافظ صفوان محمد چوہان نے جولائی 2005 میں ایک سوال نامہ رشید حسن خاں کے پاس بھیج رکھا تھا اور ٹیلی فون پر مکالمہ کرنے کا وقت 17 ستمبر 2005 کی رات کو 10 بج کر 10 منٹ کو یہ مکالمہ شروع ہوا اور تقریباً چالیس منٹ تک فاضل مکالمہ نگار کی گفتگو رشید حسن خاں سے ہوئی۔ حافظ صفوان محمد چوہان کا یہ مضمون احقر کی مرتب کردہ کتاب ''رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں، جلد اول، اشاعت 2019 کے صفحہ 213 تا 244 پر شامل ہے۔ احقر کو یہ مضمون ڈاکٹر ذکیہ مراد، مدیر مخزن لاہور، نے یکم اپریل 2017 کو بہ ذریعہ ای میل ارسال کیا۔

☆☆☆